ہم عصر ناولٹ نمبر
شیرازہ
جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ماہنامہ

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

نِگراں : ڈاکٹر عزیز حاجنی

مُدیراعلیٰ : محمد اشرف ٹاک

مدیر : سلیمؔ سالک

معاون مدیر : سلیمؔ ساغر

معاون : محمد اقبال لون

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر : سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپیوٹر کمپوزنگ: بشارت احمد بابا

سرورق : بشارت احمد بابا

قیمت: مجلد ۱۰۰ روپے ، پیپرکور ۷۵ روپے

☆......خط وکتابت کا پتہ:

مدیر اعلیٰ ''شیرازہ'' اردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

سرینگر / جموں

ای میل: sheeraza2015@gmail.com

فون نمبرات: 9419711330,9419072288

فہرست

............●●●............

حرفِ آغاز

شیرازہ اُردو کی طرف سے جموں و کشمیر میں ہم عصر اردو شعری انتخاب نمبر، ہم عصر اَفسانہ نمبر اور ہم عصر نظم نمبر کی کامیاب اشاعت کے بعد ہم عصر ناولٹ نمبر کی سوغات آپ کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے ہم مسرت کے احساس سے سرشار ہیں۔ شیرازہ اُردو نے جموں و کشمیر میں مختلف اصنافِ ادب کی پیش رفت کا احاطہ کرنے والی اِن خصوصی اِشاعتوں کا سلسلہ گزشتہ کئی برسوں سے جاری رکھا ہوا ہے۔ ہماری اِس کوشش کو خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوئی ہے جس سے ہمیں آگے بڑھنے کا حوصلہ مِلا ہے۔ ریاست میں اَب تک متعدد ناولٹ منظرِ عام پر آئے ہیں جن میں سے بعض کو اچھی خاصی شہرت حاصل ہوئی لیکن مقامی طور ناولٹ کی تکنیک پر بہت کم لِکھا گیا ہے۔ شیرازہ اُردو نے پانچ ہم عصر ناولٹ نگاروں کے شہ پاروں کی شیرازہ بندی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا محاکمہ کرنے والا مقالہ بھی زیرِ نظر اِشاعت میں شامل کیا ہے تا کہ ایک تسلسل قائم کیا جا سکے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہماری استدعا پر ریاست کے پانچ ممتاز ہم عصر قلمکاروں نے اپنے ناولٹ اِس اشاعت میں شامل کرنے کے لئے ارسال کئے جس کے لئے اُن کا شکریہ واجب ہے۔ یہ اِس سلسلے کی اپنی نوعیت کی اوّلین کوشش ہے جس کے بارے میں ہمیں آپ کی آرا کا انتظار رہے گا۔

ناسپاسی ہوگی اگر اس کوشش کیلئے عزیزی سلیم سالک، سلیم ساغر اور محمد اقبال لون کی پیٹھ نہ تھپتھپائی جائے۔ وہ شیرازہ اُردو کے مختلف پروجیکٹوں کو محنت اور صلاحیت سے آگے بڑھا رہے ہیں اور اُن سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

● ...... **محمد اشرف ٹاک**

مدیرِ اعلیٰ

..........●●●..........

●...... ڈاکٹر مشتاق حیدر

ریاست میں ہم عصر ناولٹ۔ایک خصوصی مطالعہ

انیسویں صدی میں ادب اور جمالیات کا اہم دائرۂ کار مرد کے باطن وظاہر کی کشمکش رہا۔اس کشمکش میں چیزوں کو ان کے ہی زاویئے سے دیکھنے اور دکھانے کے طریقہ کو چھوڑ کر مختلف زاویوں سے دیکھنے اور مفاہیم کی وحدت کی بجائے کثرت کو اہم سمجھا گیا۔اس طرح ادبی جمالیات کا وہ رویہ جو پہلے محض حظ بخشی سے عبارت تھا، اب ذہنی ترفع، جذباتی تموج اور جسمانی آسودگی کے مفاہیم سے بھی آشنا ہوا۔نتیجتاً ادب زندگی کی حقیقتوں سے قریب تر بھی ہوا اور موضوعی لحاظ سے متنوع حیثیت اور جامعیت سے بھی بہرہ مند ہوا۔

داستانیں جس رومانوی دنیا کی سیر کراتی تھیں، اب تغیرِ زمانہ نے اُسے بے معنی بنا کے رکھ دیا۔چنانچہ مغرب میں پہلے اور بعد ازاں مشرق میں کہانی کے دھارے نے اپنا رُخ دوسری طرف پھیرا۔تخیل و تفنن کو چھوڑ کر اس کہانی نے سنگلاخ وادیوں میں قدم رکھا۔کہانی کا داستان کے سانچوں سے نکل کر ناول کے پیکر میں ظہور دراصل انسانی زندگی کی ایک ماحول سے دوسرے ماحول کی طرف مراجعت تھی۔رومان سے حقیقت، تخیل سے عقل، قدامت سے جدت، وہم سے منطق اور خصوصیت سے عمومیت کی طرف مراجعت۔

پروفیسر احسان اکبر کے نزدیک:

''ناول نے بنیادی طور پر Anti-Romance کے طور پر جنم لیا۔
Anti-Romance ہونے سے ہم کلاسیکی مزاج مراد نہیں لیں گے۔اس سے وہ

ردّیہ مراد ہے جو معیار پسندی، عظمت، حسن، نفاست اور خصوصی اہمیت رکھنے والے کرداروں کی بجائے عام، عمومی اور معمولی کرداروں کی بھیڑ میں کسی کردار یا کرداروں کا سفر دِکھا سکے۔ ناول عمومیت پر اصرار کرتا ہے۔ یہی عمومیت اِسے عام زندگی میں شامل ہو کر زیست کو عام وخاص، سارے مظاہر سمیت دیکھنے کی توفیق بخشتا ہے۔ یوں اپنی صنفی ضرورت کے تحت ناول تخیل کی بجائے حقیقت پر اصرار کرتا ہے۔''

(پروفیسر احسان اکبر، پاکستانی ناول، ہیئت رجحان اور امکان، لاہور۔ص ۸۹)

اردو میں ناول نگاری کی شروعات مولوی نذیر احمد کے ''مرأۃ العروس'' ۱۸۶۹ء سے ہوئی۔ آہستہ آہستہ ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ناول مرزا ہادی رسوؔا کے لکھے ناول امراؤ جان ادا تک پہنچا۔ امراؤ جان ادا اردو ناول کے ارتقاء کی وہ منزل ہے جہاں تک ناول کی معاشرتی تنقید نگاری اور داستان کی رومانی خیال انگیزی پہلو بہ پہلو پہنچی ہیں اور اس کے بعد دونوں اصناف سے اپنے مشترکہ اثر اور حالات کے تقاضوں کے ردِ عمل کے ساتھ قصہ گوئی کی ایک نئی صنف مختصر افسانہ کو منصۂ شہود پر آنے میں مدد ملی۔ مختصر افسانہ بہت قلیل عرصے میں مقبول ہونے والی صنف بنی۔ ناول مختصر افسانہ کے اثر کے تحت اپنے حجم کو کم کرنے کی راہ پر چل نکلا اور اس طرح ناولٹ نگاری کا آغاز ہوا۔ جب ناول کے اندر اختصار کی راہ پا کر ناولٹ نگارری کو جنم ہوا تو قدرتی طور پر ناولٹ میں کرداروں کی تعداد ناول کے مقابلے میں کم ہوئی، زیادہ بسیط پلاٹ کی گنجائش بھی جاتی رہی اور ساتھ ہی زمان ومکانِ کے فاصلے بھی کم ہوتے گئے۔ البتہ سیتا ہرن جیسا ناولٹ اس اصول کی استثنائی صورت ہے جو ہندوستان، پاکستان، فرانس، امریکہ اور سری لنکا تک محیط ہے۔

بظاہر حجم یا ضخامت کے علاوہ ناول اور ناولٹ کے درمیان تفریق وامتیاز کا کوئی پیمانہ نظر نہیں آتا ہے۔ حق یہ ہے کہ مختصر افسانہ، ناول اور ناولٹ تینوں اصناف زندگی کی حقیقی صورت کو تخلیقی تجربے کی بھٹی میں پکا کر قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پیش کش کا ذریعہ کچھ واقعات اور ان سے وابستہ کچھ کردار ہوتے ہیں۔ ہاں! اگر کچھ فرق ہے تو وہ پیچیدگی کا ہے۔ مختصر افسانہ

زندگی کے ایک واقعے کا بیان ہوتا ہے۔ ناولٹ زندگی کے ایک رُخ اور ناول پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں احسن فاروقی فرماتے ہیں:

"ہر کردار کی پوری فطرت ناول میں واضح کی جاسکتی ہے۔ مختصر افسانے میں صرف ایک ہی صفت دکھانے کی گنجائش ہوتی ہے مگر ناولٹ میں اُسی ایک صفت پر سب سے زیادہ زور ہوتا ہے اور دوسری صفات محض اشاروں ہی سے لائی جاتی ہیں۔"

(احسن فاروقی، ادبی تخلیق اور ناول۔ ص ۱۲۸)

کئی ناقدین کا ماننا ہے کہ ناولٹ، طویل مختصر افسانہ اور ناول کی بیچ کی کڑی کا نام ہے۔ یعنی افسانہ جب بہت طویل ہو جاتا ہے پھر بھی ناول تک نہیں پہنچتا تو اُس کو ناولٹ کہہ دیا جاتا ہے لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا افسانے کے لئے منتخب کیا گیا موضوع طویل ہوتے ہوتے ناول بن سکتا ہے؟ کیا اُس موضوع یا مواد میں اتنی صلاحیت ہوسکتی ہے؟ اگر ہاں تو پھر تخلیق کار نے اُس موضوع کو راست طور پر ناول کے لئے ہی کیوں نہیں برتا؟ اگر نہیں تو پھر موضوع کو لمبا کھینچ کر ناول تک لے جانے کی بے ثمر کوشش کا مقصد ہی کیا ہے؟

بات دراصل یہ ہے کہ ناول میں اگرچہ کرداروں کے بسیط دائرہ عمل، پیچیدہ پلاٹ اور زندگی کے ہزار رنگوں کے پیشکش کی گنجائش ہوتی ہے لیکن مختصر افسانہ کی وہ ایک صفت وحدتِ تاثر ناول کو نصیب نہیں! ہاں یہ ممکن ہے کہ ناول کا کوئی باب یا کوئی کردار قاری کے دل کو کچھ اس طرح چھو جائے کہ اختتام تک اس کا خمار قاری کے ذہن و دل پر باقی رہے لیکن بحیثیتِ مجموعی ناول میں وحدت" باقی نہیں رہتی۔ برعکس اس کے ناولٹ میں پیش آنے والے تمام واقعات کا نقطۂ پر کار ایک ہی واقعہ ہوتا ہے اس لئے یہ تاثیر اور شدت میں عام طور سے ناولوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ مثلاً بیدی کا ناولٹ "ایک چادر میلی سی" انتظار حسین کے ناول "بستی" سے زیادہ پُر اثر نظر آتا ہے۔ ایسا شاید اس لئے ہے کہ "ایک چادر میلی سی" کے کردار کی الجھنیں عام زندگی کی الجھنوں سے مطابقت رکھتی ہیں جبکہ "بستی" کے کردار کی جستجو محض اُس کی ذات تک محدود ہو جاتی ہے۔ "بستی" میں مصنف زمین سے بچھڑنے پر ماتم کناں ہے اور "ایک چادر میلی سی" میں ناول

نگار زندگی کو انسانی سماج کی کھوئی ہوئی قدروں میں ڈھونڈتا ہے۔ وہ قدریں جن کی جڑیں صدیوں پر محیط ہیں۔ شاید عام قاری یہ سمجھتا ہے کہ گزرے ہوئے زمانے کو واپس لانے کی حسرت دل میں دبائے رکھنے سے زیادہ بہتر ہے کہ حال کی مشکلات کو حل کرنے کا سلیقہ ڈھونڈا جائے۔ ناول اختتام پر قاری کو حسرت یا مسرت سے ہمکنار کرتا ہے جبکہ افسانہ نئے سوالات پیدا کرتا ہے، جو نئی کہانیوں کے جنم کا موجب بنتے ہیں۔ اس پسِ منظر میں جب ہم اردو کے چند کامیاب ناولٹ سامنے رکھتے ہیں تو وہ ناول کے مقابلے میں افسانے کے قریب تر نظر آتے ہیں۔ مثلاً قرۃ العین حیدر کے ناولٹ ''سیتا ہرن'' یا ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو''۔ یہ دونوں کہانیاں جذباتی کشمکش سے گزر کر ایک نامکمل انجام تک پہنچتی ہیں، جہاں نئے سوالات سر اٹھاتے نظر ہیں۔ سجاد ظہیر کے ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' کی مقبولیت کی بھی یہی وجہ تھی۔ سجاد ظہیر اُس کے دیباچے میں خود لکھتے ہیں:

''اس کتاب کو ناول یا افسانہ کہنا مشکل ہے۔'' ان حقائق کے پیشِ نظر کئی ناقدین نے طویل مختصر افسانے اور ناولٹ کو ایک ہی صنف گردانا ہے۔ وقار عظیم لکھتے ہیں:

> ''طویل مختصر افسانہ، ناول اور مختصر افسانہ کے بیچ کی ایک چیز ہے، جس میں ناولوں کی پس منظر کیفیت اور مختصر افسانے کی وحدت تاثر ایک ساتھ موجود ہوتی ہیں جس میں ناول کے پلاٹ کی پیچیدگی اور گہرائی نہیں ہوتی لیکن جو کسی ایک خاص محل، فضا اور ذہنی کیفیت کی پیچیدگیوں کی وضاحت کر سکتا ہے۔ اس میں مناظر زیادہ تفصیلی اور کردار زیادہ واضح بن کر ہمارے سامنے آسکتے ہیں۔''
>
> (سید وقار عظیم، فنِ افسانہ نگاری، ص ۴۲)

جہاں مختصر افسانے میں واقعات کا بیان طوالت کا متقاضی ہو اور کرداروں کے امتیازی اوصاف کو نمایاں کرنے کے لئے کچھ ضمنی کرداروں کو روشنی میں لانے کی ضرورت پیش آئے تو مختصر افسانہ خود بخود طویل مختصر افسانہ بن جاتا ہے۔

طویل مختصر افسانے میں جب جزیات پر سیر حاصل روشنی ڈالی جائے۔ زندگی کے

مسائل کو تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان کیا جائے کہ ضمنی کرداروں کی عمومی سرگرمیاں بھی واضح طور پر سامنے آئیں اور پھر پلاٹ میں جامعیت کا عنصر سما جائے تو طویل مختصر افسانہ ناولٹ بن جاتا ہے۔ یہاں فنکار کی ہنرمندی کا امتحان ہوتا ہے کہ کس طرح وہ اسلوبِ بیان اور دقتِ نظر کے بل پر اپنی تخلیق کو مجروح ہونے سے بچاتا ہے۔

اس مختصر سی بحث کو ہم چند نقطوں کی صورت میں اس طرح سمیٹ سکتے ہیں:

☆ طویل اور مختصر افسانہ اور ناولٹ دو الگ الگ اصناف ہیں جن کے درمیان وحدتِ تاثر اور کثرتِ تاثر کی ایک مہین حدِ فاصل ہے۔

☆ افسانہ مختصر ہو یا طویل اس میں موضوع اور تاثر کی وحدت ضروری ہے جبکہ ناولٹ سے ہم اس طرح کی وحدت کا تقاضا نہیں کر سکتے۔ البتہ ناولٹ میں پیش کئے جانے والے تمام واقعات ایک مرکزی واقعے سے غیر مرئی طور پر جڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

☆ ناولٹ میں واقعات کی ترتیب افسانے کے برعکس ناہموار ہوتی ہے جسے ہم پیچیدگی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

☆ ناولٹ میں مختصر افسانے کی طرح چند کردار مخصوص ہوتے ہیں جن پر کہانی کا مدار ہوتا ہے لیکن ناولٹ کے دیگر ضمنی کردار افسانے کے ضمنی کرداروں کی طرح مکمل طور پر اندھیرے میں نہیں رہتے۔

☆ ناولٹ کو طویل مختصر افسانے سے الگ کرنے کے لئے مصنف کا اسلوب بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

شیرازہ کے اس خاص شمارے میں شامل ناولٹوں پر ایک طائرانہ نظر:

ناولٹ :۔ پسِ منظر..................(ویدراہی)

شیرازہ کے اس خاص شمارے میں شامل پہلا ناولٹ ویدراہی کا ''پسِ منظر'' ہے۔ اس ناولٹ کے پسِ منظر میں ممبئی کی فلم نگری اور اس کے اس پڑوس کی غریب بستیاں ہیں۔ ممبئی! جسے مایا نگری بھی کہا جاتا ہے، جہاں فلموں کی چندیا دینے والی عیش عشرت کی روشنی میں زندگی کے

جملہ مسائل دب جاتے ہیں۔ جہاں بھوک، بے گھری، بے چارگی، عشق، محبت، وفا اور جفا سب پر گلیمر کا پردہ پڑا رہتا ہے۔ اس ماحول سے وابستہ دو انسانی وجود زیرِ نظر ناولٹ کے مرکزی کرداروں کی صورت میں قاری کے سامنے ناول نگار پیش کرتا ہے۔ ناول کے ہیرو ہیروئین منصور اور شکیلہ فلموں میں ڈپلی کیٹ ہیرو ہیروئین یا سٹنٹ آرٹسٹ کے طور پر کام کرتے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ سٹنٹ آرٹسٹ وہ لوگ ہوتے ہیں جو جان جوکھم میں ڈال کر ہیرو اور ہیروئین کی جگہ خطروں میں پڑ کر بظاہر ناممکن نظر آنے والے کام (شارٹ) انجام دیتے ہیں۔ چونکہ ان لوگوں کا چہرہ کیمرے پر نہیں آتا اسلئے لوگ سمجھتے ہیں کہ جان کی بازی لگانے والے اصل ہیرو ہیروئین ہی ہیں نتیجتاً ہیرو ہیروئین اس کام کے لئے واہ واہی لوٹ لیتے ہیں جو پسِ منظر میں سٹنٹ آرٹسٹ کرتے ہیں۔ یوں اس ناولٹ کے عنوان ''پسِ منظر'' کی ایک معنویت طے ہو جاتی ہے۔ اگر چہ فاضل ناولٹ نگار نے عنوان کی معنویت کو زندگی کے دیگر معاملات میں بھی ثابت کیا ہے۔

کہانی کچھ یوں ہے کہ منصور اور شکیلہ سماج کے اُس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں زندگی کی آسائشوں کا نام ونشاں تک نہیں ہے۔ وہاں دل کے ارمانوں کو بھوک کی آگ میں جلانا زندگی کرنے کا نام ہے۔ منصور اور شکیلہ دونوں فلموں میں ڈپلی کیٹ یا سٹنٹ آرٹسٹ کے طور پر کام کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ فلموں میں دونوں بہادرانہ کرتب دکھا کر سب کو مسحور تو کرتے ہیں لیکن اپنی زندگی کی زبوں حالی سے خود کو چھڑانے میں ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں۔ شکیلہ کی ماں جوانی میں طوائف رہی ہے اور اپنے نکمے شوہر کو چھوڑ کر افضل خان نام کے شخص کے ساتھ اپنی دو بیٹیوں شکیلہ اور شمی کو لے کر رہتی ہے۔

افضل خان اور شکیلہ کی ماں حمیدہ بیگم نے شکیلہ کا سودا لندن کے ایک سیٹھ کے ساتھ طے کر رکھا ہے لیکن شکیلہ اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ ادھر منصور علی سٹنٹ مین عظیم بھائی کی منت سماجت کر کے خود کو ایک آؤٹ ڈور شوٹنگ گروپ میں شامل کراتا ہے جسے شملہ شوٹنگ کے لئے جانا ہے۔ شکیلہ بھی اس گروپ میں شامل ہے اور شکیلہ کے لئے ہی منصور اس گروپ میں خود شامل

کرواتا ہے۔ شکیلہ پر اپنی ماں فہمیدہ بیگم اور افضل خان دباؤ ڈالتا ہے کہ اگر وہ سیٹھ کے پاس جانے سے انکار کرتی ہے تو انہیں مجبوراً اُس کی چھوٹی بہن شمی کو اُس کام پر لگانا ہوگا۔ اس لئے اپنی چھوٹی بہن کو اُس گندگی سے بچانے کے لئے اُسے ہاں کرنی ہی ہوگی۔ شکیلہ اُن سے وعدہ کرتی ہے کہ شملہ سے واپسی پر وہ کوئی فیصلہ ضرور لے گی۔ شملہ میں شکیلہ کا میک اپ کرنے والی خاتون اُسے منصور علی کے پیار کو نظر انداز کرنے پر تنبیہ کرتی ہے۔ خاتون اُسے سمجھاتی ہے کہ محبت ہی ایک ایسی طاقت ہے جو انسان کو بڑے سے بڑے مسائل سے لڑنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ محبت ہی انسان کو زندگی کے اصل چہرے سے روبرو کراتی ہے۔ خاتون کے الفاظ میں:

"سکھ لینے کے لئے پیار کو نچوڑنا پڑتا ہے تردد کرنا پڑتا ہے۔ ہماری زندگی دکھوں سے بھری ایک گٹھری ہے۔ اسے کھولنے کا جو طریقہ اُسی کا نام پیار ہے۔ جو بے وقوف ہوتے ہیں وہ پیار کبھی اسی گھڑی میں بند کر دیتے ہیں۔"

شکیلہ جو کئی برسوں سے منصور کے پیار کا جواب یہ کہہ کر نفی میں دیتی تھی کہ میں مجبور ہوں، میں تم سے پیار نہیں کر سکتی، آخرش اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر منصور کے پیار کو قبول کرتی ہے۔ وہ خاتون سے کہتی ہے۔

"میں پگھل گئی ہوں خاتون، بے بس ہو گئی ہوں۔ مجھے تمہاری باتوں نے جھنجھوڑ دیا ہے۔ میں اپنے دل کی آواز سننے لگی ہوں۔ میری سمجھ میں آگیا ہے کہ منصور کی محبت کو ٹھکرا کر میں اپنے آپ سے بے انصافی کر رہی ہوں۔ بعد میں شاید مجھے پچھتانے کا موقع نہ ملے۔ اس لئے میں آج رات کو منصور کے پاس جا رہی ہوں۔"

شکیلہ اور منصور کی محبت شملہ کی پُر کیف فضاؤں میں پروان چڑھی ہے اور ممبئی واپسی پر جوان ہوتی ہے۔ منصور اور شکیلہ ایک دوسرے کو اپنا سب کچھ سپرد کر دیتے ہیں اور کیف و سرور میں مسرور ہو کر اپنے دکھوں کو بھول جاتے ہیں۔ ماں اور افضل کے دباؤ اور اصرار پر شکیلہ اُن دونوں کو منصور کے بارے میں بتا دیتی ہے۔

کہتے ہیں کہ گناہ اور بدکاری کی زندگی انسان سے انسانیت کا اخراج کراتی

ہے۔افضل خان کا معاملہ بھی یہی تھا۔وہ شکیلہ اور منصور کے عشق کو اپنے ذاتی پسِ منظر اور خباثت کی عینک سے دیکھ رہا تھا۔اسی لئے ایک روز جب شکیلہ منصور سے ملنے کے لئے گھر سے نکلنے والی تھی تو افضل خان اُس کے کمرے میں آ کر کہتا ہے:

"میرے سامنے بیٹھ جا۔میں تمہیں کچھ باتیں سمجھانا چاہتا ہوں...... اِدھر آ۔میرے پاس آ۔میں تمہیں کیا نہیں دے سکتا......"

منصور نے شکیلہ سے بہت پوچھا کہ وہ اُداس اور گم صم کیوں بیٹھی ہے۔لیکن شکیلہ اُس سے کچھ کہہ نہ پائی اور آخرش اُس نے سوچا کہ وہ اپنے پسِ منظر سے خود کو آزاد تو نہیں کر سکتی کیوں نہ چند دن منصور کے پیار کو اس طرح گلے لگائے کہ پھر پوری زندگی اُسی یاد کے ساتھ گزار سکے۔اس طرح شمی کی زندگی بھی تباہ ہونے سے بچ جائے گی۔آخر ایک دن شکیلہ منصور سے کہتی ہے کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔شکیلہ کے لاکھ سمجھانے کے باوجود منصور اُس کے گھر والوں سے شکیلہ کا رشتہ مانگنے کے لئے پہنچ جاتا ہے لیکن اُس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب وہ لوگ منصور سے کہتے ہیں کہ شادی ہونا ممکن نہیں ہے۔یہ سن کر منصور کا خون کھول اُٹھتا ہے۔وہ شکیلہ کے پسِ منظر سے آگاہ تو ہوتا ہے لیکن اُس کی مجبوری کو سمجھ نہیں پاتا ہے۔

منصور شکیلہ کی خاموشی کو بے وفائی سے تعبیر کرتا ہے اور دل برداشتہ ہوتا ہے۔وہ اپنے آپ سے بدلہ لینے کی خاطر ایک ایسا سٹنٹ کرنے کے لئے حامی بھرتا ہے جس میں جان جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔

شارٹ میں منصور علی ایک کار میں سوار دریا میں ڈوب جانے کا سٹنٹ کرتا ہے۔سارا عملہ انتظار کرتا ہے کہ ابھی وہ دریا میں سے اُبھرے گا لیکن وہ سارے پسِ منظر اور پسِ منظر بھلا کر اپنی جان جانِ آفرین کے حوالے کر دیتا ہے۔

اس واقعے کے بعد شکیلہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا جو بالکل منصور پر گیا ہے۔جب اُس

نے اُسے منصور کی اماں کی گود میں ڈالا تو اماں نے اُسے چھاتی سے لگالیا۔ شکیلہ نے ایک کمرہ اُن کے قریب ہی کرائے پر لے لیا۔ وہ شمی کے ساتھ بیٹے کو لے کر وہاں آ گئی۔ شمی نے پڑھائی جاری رکھی۔ شکیلہ جب شوٹنگ کے لئے گھر سے نکلتی ہے تو ننھے بیٹے کو منصور کی اماں اور بہن سنبھالتی ہے۔ کیا شکیلہ اپنے بیٹے کو اُس کے پسِ منظر سے الگ کر پائے گی؟۔ کیا منصور کا بیٹا بڑا ہو کر اُسی پسِ منظر کا پیشِ منظر ہوگا؟۔ ایسے کئی سوالات ناولٹ کے آخر پر قاری کے ذہن میں سر اُٹھاتے ہیں۔

اس کہانی کا پلاٹ اُن تمام قارئین کے لئے جانا پہچانا ہے جو ممبئی فلم انڈسٹری سے کسی نہ کسی طور وابستہ ہیں۔ پورا ناولٹ معاشرے کے اس طبقے کے ذہنی اور اقتصادی مسائل کا ترجمان ہے جہاں اگر فرد اپنی حالت بدلنے کے لئے جان کی بازی بھی لگا دے تب بھی مثبت تبدیلی ہر ایک کے نصیب میں نہیں آتی۔

ناولٹ کا پلاٹ روایتی ہے کیونکہ قاری ابتداء سے ہی آنے والے واقعات کے بارے میں بہ خوبی اندازہ لگا پاتا ہے۔ البتہ روایتی تانے بانے کے باوجود بھی جو چیز قاری کو ابتداً تا آخر کہانی سے باندھے رکھتی ہے۔ وہ واقعات کا فطری تسلسل ہے اور یہی بس ناولٹ کی کامیابی کی بڑی وجہ بھی ہے۔

ناول کے کرداروں کے نام اور افعال زیادہ تر ہندوستانی مسلم معاشرہ سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اگر چہ ہندوستانی مسلم معاشرہ دلت طبقے میں شمار نہیں ہوتا لیکن اس معاشرے کے مفلس افراد کی سماجی حالت دلتوں سے کسی طور بھی مختلف نہیں ہے۔ یہ طبقہ ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرنے کے لئے مجبور ہے۔ اس حقیقت کی ڈرامائی انداز میں پیش کش نے ناولٹ نگار کو قاری کے سامنے معتبر بنا دیا ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ روایتی بُنت نے اس تخلیق کو ناول اور ناولٹ کی ایک درمیانی چیز بنایا ہے۔

ناولٹ:۔ قفس اُداس ہے............(نور شاہ)

ناولٹ ''قفس اُداس ہے'' وادی کے معتبر ترین فکشن نگار جناب نور شاہ کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔نور شاہ فن کی ماورائی کرشمہ سازیوں پر یقین رکھتے ہیں اور زندگی وسماج کے تمام مسائل کا حل بھی فن ہی میں ڈھونڈ تے ہیں۔اُنہیں اس بات کا کامل یقین ہے کہ فن خصوصاً فنونِ لطیفہ انسانی زندگی کے جملہ مسائلہ کا حل ہیں۔

نور شاہ ترقی پسند دور سے لکھ رہے ہیں اور وہ ادب کے بدلتے رجحانات سے پوری طرح واقف ہیں۔انہوں نے ترقی پسندی کے عروج وزوال کو دیکھا بھی ہے، جیا بھی ہے اور برتا بھی ہے۔جدیدیت کی گھن گرج کوانہوں نے محسوس بھی کیا ہے اور اظہارِ ذات کے لئے بروئے کار بھی لایا ہے۔آج جب مابعد جدیدیت کا دور دورہ ہے نور شاہ اپنے تخلیقی سفر کو جاری وساری رکھے ہوئے ہیں۔ان بدلتے ادوار اور رجحانات میں جو چیز نہیں بدلی ہے وہ نور شاہ اور اُن جیسے فنکاروں کا انسانی جذبات واحساسات کے ساتھ کیا جانے والا اُن کا معاملہ ہے۔

انسان کے سینے میں جب تک دل دھڑک رہا ہے تب تک جذبات واحساسات کے طوفان بھی اُٹھتے رہیں گے اور یہ جذبات واحساسات نسل درنسل منتقل ہوتے رہیں گے۔اسی وجہ سے انسان کوسمجھنے کے لئے بڑے بڑے عالموں اور سائنس دانوں نے انسان کے ذہن ودل کوٹٹولنے اور سمجھنے کی بار بار کوششیں کی ہیں۔ناقدوں اور ادیبوں نے بھی اس دنیا اور انسان کے درمیان رشتوں کوسمجھنے کے لئے جبلت اور جذبہ کی کارفرمائیوں پر غور وفکر بھی کیا ہے اور خامہ فرسائیاں بھی۔

ناولٹ ''قفس اداس ہے'' مذکورہ بالا حقیقت کا بین اظہار ہے۔اس ناولٹ کو ہم ایک طویل مختصر افسانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔کیونکہ اس میں وحدتِ تاثر کے ساتھ ساتھ دیگر کئی ایسے فنی عوامل نظر آتے ہیں جو طویل افسانے کی ذیل میں لا کھڑا کرتے ہیں۔اس ناولٹ میں وحدت

زماں پائی جاتی ہے جو ناول کے مقابلے میں افسانے کی عمومی خصوصیت تصور کی جاتی ہے۔ساتھ ہی ذیلی ابواب کی غیر موجودگی اس کے متن کو ایک وحدت عطا کرتی ہے۔البتہ افسانے کے برعکس ناول یا ناولٹ میں ایک اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ آنے والے واقعات کے سائے بہت پہلے ہی لہراتے نظر آتے ہیں۔جس کی وجہ سے تحیر کا عنصر ایک خاص درجے سے آگے نہیں بڑھ پاتا ہے۔زیرِ نظر فن پارے کی یہی خاصیت اِسے افسانے کی قلمرو سے نکال کر ناول کی سلطنت میں لے آتی ہے۔

''قفس اُداس ہے'' کا مرکزی کردار سلونی اسکول جانے والی ایک ایسی لڑکی کا نام ہے جو بچپن کی سرحد اور نوجوانی کی دہلیز پر کھڑی ہے۔اُس کی ماں میریا اُسے گھر کے ایک خاص کمرے سے دور رکھتی ہے جس میں اُس کی خالہ صنوبر کی یادگار چیزیں رکھی ہوئیں ہیں۔صنوبر یعنی سلونی کی خالہ بچپن میں زبردست رقص کیا کرتی تھی۔ جوان ہو کر وہ پوری طرح رقص میں گم ہوئی۔وہ رقص کے فن کو قدرت کی ایک عظیم نعمت سمجھتی تھی۔ایک ایسی نعمت جو کسی کسی بندے کو نصیب ہوتی ہے۔اُس کا ماننا تھا کہ دنیا فن اور فنکار کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔اس لئے فنکار کو چاہیئے کہ فن کے اظہار میں کسی طرح کے بُخل سے کام نہ لے۔اُس کے گھر کے افراد کا نظریہ اِس کے برعکس تھا۔وہ سمجھتے تھے کہ رقص کرنا شرفاؑ کی شان کے منافی ہے۔لہٰذا صنوبر کو اُس سے دور رہنا چاہیئے۔ایک مقامی ہوٹل کا مالک صنوبر کو اپنے ہوٹل میں شام کو اپنے رقص کا مظاہرہ کرنے کی پیشکش کرتا ہے۔صنوبر یہ پیشکش پیسے کی خاطر نہیں بلکہ اپنے فن کے مظاہرے کی خاطر قبول کرتی ہے۔اس طرح وہ اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف چل پڑتی ہے اور نتیجتاً پورا گھر ایک بڑے حزینہ میں گھر جاتا ہے۔صنوبر اپنے ایک مداح فوجی پریتم کے عشق میں گرفتار ہو کر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایک نئی دنیا بسانے کی خاطر شہر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔یہ سب باتیں سلونی کو ماں کی غیر موجودگی میں اُس ممنوع کمرے میں رکھی ایک ڈائری سے پتہ چلتی ہیں۔

سلونی! اپنی خالہ کی طرح اپنے اندر رقص کرنے کی اتھاہ خواہش کو کلبلاتے ہوئے محسوس کرتی ہے۔ اپنی ماں میریا کی رقص کے تئیں نفرت صنوبر کو رقص کے لئے مزید اُکساتی ہے۔ نتیجتاً وہ بھی اپنی خالہ کے نقشِ قدم پر چل پڑتی ہے اور کچھ ہی دنوں میں اپنے اسکول اور بعد ازاں کالج میں ایک مشاق رقاصہ کے طور پر مقبول ہو جاتی ہے۔

اپنی ماں کے بیان کے برعکس سلونی کو پڑوس کی ایک عورت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی خالہ زندہ ہے اور وہ اپنی بہن کو خط بھی لکھتی ہے۔ سلونی کو تلاشِ بسیار کے بعد گھر میں اپنی خالہ کا ایک خط ملتا ہے جس سے ایڈریس نوٹ کر کے سلونی بنا کسی کو کچھ بتائے اپنی خالہ سے ملنے ممبئی کے لئے روانہ ہوتی ہے۔ مذکورہ پتے پر پہنچ کر اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بہت پہلے کسی دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہیں۔ سلونی کچھ دنوں تک ایک ہوٹل میں رکتی ہے اور پھر پیسے ختم ہوتے ہی پریشانی کا شکار ہوتی ہے۔ اسے فن کی دنیا سے نکل کر حقیقی دنیا کے مسائل اور مصائب سے آمنا سامنا ہوتا ہے۔ اپنی انا ان کی وجہ سے وہ گھر جانا نہیں چاہتی، ایسے میں ہوٹل کا مالک رحمان دادا اُس کے لئے مسیحا ثابت ہوتا ہے۔ رحمان دادا اُسے ایک مقامی ہوٹل ''ہوٹل انورادھا'' میں رقص کر کے اپنی روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد سلونی کو احساس ہوتا ہے کہ لوگ ''ہوٹل انورادھا'' میں اُس کے فن کی قدردانی کے لئے نہیں بلکہ اُس کی جسمانی خوبصورتی کی آگ سے اپنی آنکھوں کو سینکنے کے لئے اُس کا رقص دیکھنے آئے ہیں۔ فن، فن کی قدردانی ایسے مثالی آدرشوں کے بت چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ اب سلونی زندگی کے اُس موڑ پر آ گئی جہاں سے واپسی کے سارے راستے بند ہو گئے ہیں۔ یہ پھول جسے واہ واہ اور قدردانی کی پیاس تھی۔ ایسا ہی پیاسا تھا۔ سلونی خود کلامی کے عالم میں گویا ہوئی۔

''یہاں آکر مجھے کیا ملا۔ گھورتی ہوئی نگاہیں جن میں اشارے پوشیدہ ہیں۔ مسکراتے

ہوئے لب جن میں پیغام بکھرتے ہیں۔ان اشاروں اوران پیغاموں میں میرے فن
کی کوئی قدر نہیں ۔ یہ اشارے اور یہ پیغام میرے جسم کے لئے ہیں۔میری جوانی کے
لئے ہیں......کاش کوئی میری روح میں اُترنے کی کوشش کرتا"

دھیرے دھیرے سلونی پراس دنیا کی اصلیت کھلتی گئی۔اس نے دیکھا کہ انسان اپنے چہرے پر کئی چہرے لگائے پھرتا ہے۔خوبصورت چہرے اور خوبصورت لباس والے لوگ اندر کتنے بدصورت ہوتے ہیں۔

سلونی کوایک اور فنکار منوہر کی شکل میں ملا جوفلموں کے لئے گیت لکھ کراپنا مقدر آزمانے کے لئے ممبئی آیا تھا۔منوہر سلونی کوسیڑھی بنا کر کامیابی حاصل کرنا چاہتا تھا۔وہ فلمی دنیا کی نبض پہچان چکا تھااور اُس نے اپنے اندر کے فنکار کے خالص پن کومکروفریب سے مٹیالا کر دیا تھا۔

منوہر سلونی کے فلیٹ میں آکر رہنے لگا اور سلونی نے اُسے اپنا سب کچھ سونپ دیا۔ لیکن جب ایک دن سلونی نے اپنے کانوں سے سنا کہ منوہر آگے بڑھنے کے لئے ایک پرڈیوسر کے ہاتھ سلونی کوسونپنے کے لئے تیار ہو گیا ہے تو اُس کی دنیا لرزہ براندام ہوئی۔اُسے احساس ہوا کہ پھول کی پیاس تیزاب سے بجھائی گئی ہے۔سلونی ہوٹل انورادھا میں اس طرح رقص کرنے لگی گویا وہ اپنے فن سے اپنی زندگی کا انتقام لے رہی تھی۔آخرش وہ سنگ مرمر کے فرش پراس طرح بے ہوش ہو کر گر پڑی کہ جب اُس نے نرسنگ ہوم میں اپنی آنکھ کھولی تو اس کا حمل گر چکا تھا۔

ہوٹل انورادھا کے مالک مسٹر کھنہ نے نرسنگ ہوم کے ریکارڈ میں معدے کی بیماری لکھوا کر کیس رفع دفع کروادیا۔ڈاکٹروں نے اعلان کیا کہ سلونی اب آگے کبھی رقص نہ کر پائے گی کیونکہ فرش پر گرنے سے اس کی ٹانگ کی ہڈی میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد ہوٹل انورادھا کا مالک مسٹر کھنہ اُسے گھر لینے کے لئے آیا۔کھنہ جسے سلونی ہمیشہ ایک خراب انسان سمجھتی تھی آج ایک ہمدرد کی شکل میں سامنے کھڑا تھا۔مسٹر کھنہ نے

سلونی سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ اُس نے سلونی کو بتایا کہ اُس کی بیوی انورادھا بچے کو جنم دیتے ہی اس دنیا سے چلی گئی اور وہ چاہتا ہے کہ سلونی اُس کی جگہ لے لے۔ سلونی جواب میں کہتی ہے: ''عورت زندگی میں ایک ہی بار پیار کرتی ہے۔ ایک ہی بار پیار کے ساگر میں ڈوب جاتی ہے...... وہ (منوہر) میرے لئے اور میں اُس کے لئے مرچکی ہوں لیکن محبت تو نہیں مرتی، محبت تو امر ہے...... میں اپنے وطن کو لوٹ جاؤں گی۔''

اس ناولٹ میں ناولٹ نگار جہاں ایک طرف انسان کے اندر چھپے حیوانی خصائل کو سامنے لاتا ہے وہیں عشق، محبت اور انسان دوستی جیسے لطیف احساسات و جذبات کے لافانی اور ابدی خصائص کی وکالت بھی کرتا ہے۔

اس پورے ناولٹ کی فضا حقیقت اور تخیل کے بیچ معلق نظر آتی ہے۔ ناول نگار مرکزی کردار کا اپنی ماں کے مقابلے میں اپنی خالہ کی راہ پر چل نکلنے کا کوئی مضبوط جواز پیش کرنے سے قاصر رہا ہے۔ ابتدا میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار سلونی کے من میں پیدا ہونی والی خواہشوں اور امنگوں کا جواز کسی نفسیاتی یا وراثتی پسِ منظر میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن جلد ہی قاری اس خوش فہمی سے باہر نکل آتا ہے۔ کہانی کے کئی واقعات میں اچانک پن نظر آتا ہے جس سے کہیں کہیں پلاٹ میں جھول پیدا ہو گیا ہے۔ کئی کردار اضافی معلوم ہوتے ہیں جنہیں ناول نگار کچھ دیر تک بلا جواز کہانی کے ساتھ ساتھ کھینچ رہا ہے۔ مثال کے طور پر ہوٹل انوارادھا کے مالک مسٹر کھنہ کا کردار غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ کردار آخر پر کچھ حرکت کرتا دکھائی دیتا ہے لیکن اُس کی حرکات یا افعال کہانی میں غیر ضروری پیوند سے زیادہ کوئی اور تاثر پیدا نہیں کر سکے ہیں۔

میریا اور صنوبر جیسے نام جہاں قاری کے ذہن میں عیسائی کرداروں کا نقش اُبھارتے ہیں، وہیں پریتم اور کھنہ قاری کے ذہن میں ہندوں کرداروں کی شبیہہ بناتے ہیں۔ اسی طرح ذیلی کرداروں کے نام بھی قاری کے ذہن میں کسی خاص معاشرے کا توانا عکس اتارنے میں نا

ناکام نظر آتے ہیں۔ نتیجتاً کرداروں کی زبان اور اُن کی شخصیت کے درمیان ہم آہنگی کی موجودگی یا غیر موجودگی کے بارے میں کوئی حتمی رائے پیدا نہیں ہو پاتی ہے۔ جبکہ ناول میں عموماً کرداروں کی زبان، ان کے ادا کئے گئے جملوں کی بناوٹ اور لب ولہجہ ترسیل معنی ومنظر کے لئے اہم رول ادا کرتے ہیں۔ لیکن اُس خصوصیت سے یہ ناول عاری ہے۔

ناولٹ:۔ فطرت............ (وحشی سعید)

انسان کی فطرت وہبی ہے یا کسبی؟ یہ سوال شاید ابتدا سے ہی صاحبِ فکر انسانوں کو پریشان کرتا رہا ہے۔ انسان کا کسی چیز، جذبہ، سوچ یا خیال کی طرف لپکنا فطرت کے زیرِ اثر ہے یا ماحول اور حالات کے تابع؟ یہ سوالات جتنے آسان نظر آتے ہیں، ان کے جوابات اُتنے ہی مشکل اور پیچیدہ ہیں۔ ہاں! ایک بات پر شاید سب انسانوں کا یقین ہے کہ انسان اپنی فطرت کی طرف لوٹتا ہے۔ اس خیال کی توثیق کئی مذہبی کتابیں اور صحیفے بھی کرتے ہیں۔ یعنی اب اگر انسان کی فطرت کو سمجھنا ہے تو انسانی افعال واعمال پر غور کرنے کے لئے انسانی زندگی کے اُس حصے پر زیادہ توجہ مرکوز کرنی ہوگی جو عمر کا درمیانی حصہ کہا جاسکتا ہے۔ انسانی زندگی کے ارتقائی سفر کی مثال ایک پہاڑ پر چڑھائی کی سی ہے کہ ایک خاص نقطۂ عروج کے بعد زوال شروع ہوتا ہے۔ انسان جس سطح سے چلا تھا اُسی سطح پر واپس کرتا ہے، تبدیلی صرف محلِ وقوع میں نظر آتی ہے۔ لیکن محل وقوع کی یہ تبدیلی عمودی سفر کے بعد ہی حاصل کی جاسکتی ہے اور جب انسان اپنے سفر کے لئے عمودی طریقۂ کار نہیں اپناتا ہے تو نہ وہ اپنی صلاحیتوں کو نکھار پاتا ہے اور نہ کسی منزل پر پہنچتا ہے۔

وحشی سعید ساحل کا لکھا ناولٹ ''فطرت'' مذکورہ بالا حقائق کا خلاقانہ اظہار ہے۔ اس ناول کا پلاٹ چھٹی اور ساتویں دہائی کی فلموں سے ملتا جلتا ہے۔ جہاں مزدوروں کے حقوق کی خاطر ٹریڈ یونین کا قیام اور پھر آخر پر کارخانے کے مالک کا کسی ایسے حادثے سے دوچار ہونا جس

کی بدولت اُس کی سوچ میں مثبت تبدیلی آتی ہے اور فلم کا خوشی پر خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ناولٹ کی شروعات تحیر زا ماحول سے ہوتی ہے۔ قاری ایک ایسے کردار سے روبرو ہوتا ہے جس کی چال ڈھال اور وطیرہ مشکوک نظر آتا ہے۔ امین صاحب نام کا یہ آدمی انتہا درجہ کا عیاش ہے۔ وہ شراب وشباب کا رسیا ہے اسی لئے ایک ضمنی کردار لالو اُسے مطلوبہ جگہوں تک رہنمائی کرتا ہے۔ امین ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوا تھا جس کے والد کو اپنے کاروبار سے فرصت نہیں تھی اور ماں پارٹیوں اور سہیلیوں میں مشغول رہتی تھی۔ اُس کے باپ کے منشی رنگین شاہ نے دونوں باپ بیٹوں کو عیش وعشرت، شراب وشباب کی ایسی لت لگائی کہ وہ انسانیت کے درجے سے گر کر جانوروں کی فطرت کا مظاہرہ کرنے لگے۔ باپ کے مرنے کے بعد امین نے کئی بار تہیہ کیا کہ وہ اس مکروہ زندگی سے نکل کر انسان کی جون میں پھر آجائے لیکن ہر مرتبہ رنگین شاہ کی عیاری اور اُس کے ارادوں کی کم مائیگی نے اُسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ اُس کی بیوی نے اُس کے حیوانی عادات وخصائل سے تنگ آکر اپنے تین بچوں کے ساتھ میکے کی راہ لی۔ شومئی قسمت کہ وہ جس ٹرین میں سوار ہوئی وہ ٹرین ایک حادثے کا شکار ہوئی۔ امین کی بیوی شبنم اور اُس کے چھوٹے بیٹے کی لاش ملی۔ بیٹی اور بڑے بیٹے کا کچھ پتہ نہ چلا۔ امین کی حالت غیر ہوئی وہ اپنے دوست انوکھے خان سے کہنے لگا:

"......میں نے اپنی بیوی کی قدر نہ کی جو ہر وقت مجھ پر سب کچھ فدا کرنے کو تیار رہتی تھی۔ میں وہی عیاشی کا کیڑا رہا۔ نہ جانے میری بیٹی اور بیٹے کا کیا حال ہوگا۔"

اس حادثے کے بعد امین اپنے دوست کے کہنے پر سمندر نگر چلا آیا تا کہ ہوا پانی بدلنے سے اُس کے دُکھ میں کمی ہو جائے۔ زندگی پھر رواں دواں ہوئی اور وہ پھر اپنی رنگ رلیوں میں مست ہوا۔

امین نے سمندر نگر میں کپڑے کا کارخانہ لگایا اور اپنی عیاری سے لوگوں کے دل جیتنے

میں کامیاب ہوا۔ایک دن امین کے کارخانے میں ایک لڑکا اقبال علی نوکری کی عرضی لے کر آیا اور امین نے اُس کی قابلیت دیکھ کر اُسے بحیثیت کلرک اپنے کارخانے میں نوکری پہ رکھ لیا۔اقبال علی نے خط لکھ کر اپنی ماں رقیہ کو اپنے پاس سمندر نگر بلا لیا۔اِدھر امین علی کے پاس دلال جمال آ کر یہ اطلاع دے گیا کہ طوائف رانی کے پاس ایک نوخیز کلی گلنار نام کی ہے جسے اُس کا دشمن صیاد شاہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔یہ سن کر امین سیدھے طوائف رانی کے کوٹھے پر جا پہنچا اور گلنار کو اپنے سامنے منگوایا لیکن وہ دادِ نشاط نہ دے سکا کیونکہ عین وقت پر اسے کسی کاروباری سلسلے میں جانا پڑا۔جاتے جاتے اُس نے منی بائی سے کہا کہ پورن ماشی تک وہ گلنار کو اپنے پاس امانت سمجھ کر محفوظ رکھے۔

اسی دوران کارخانے میں مزدوروں نے اپنے حق کی خاطر آواز بلند کی اور دیکھتے دیکھتے ہڑتال تک بات پہنچی۔اقبال علی بھی ہڑتالی مزدوروں کے ساتھ کچھ اس طرح شامل ہوا کہ سارے مزدور اُس کو اپنا لیڈر ماننے لگے۔ہڑتال نے طول پکڑا اور فاقوں تک نوبت پہنچی لیکن مزدور اپنے حق کیلئے ڈٹے رہے۔اقبال علی کو امین نے بلا کر لالچ دینے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی فطری اچھائی اور ایمان داری کے راستے کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ایک دن حادثاتی طور پر بازار میں اقبال علی اور گلنار کی ملاقات ہوئی اور دونوں بھائی بہن کے رشتے میں بندھ گئے۔

گلنار اور اقبال جب ایک دوسرے کے گلے میں ایک جیسا لاکٹ دیکھتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں۔اقبال کو اپنی ماں رقیہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لاکٹ تب سے اُس کے گلے میں تھا جب وہ اُسے نہایت کم عمری میں ایک ٹرین کے حادثے کے بعد اُسے ریت پر پڑا ملا تھا۔گلنار کی کہانی بھی بالکل ایسی ہی تھی۔یہ سمجھنے میں اُنہیں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ وہ حقیقی بھائی بہن ہیں۔یوں بچپن کے بچھڑے جوانی میں مل گئے۔طوائف منی بھائی نے آمین کی پرواہ کئے بغیر گلنار کو اپنے بھائی اقبال کے ہمراہ جانے دیا۔پورن ماشی کو جب امین منی بائی کے پاس گلنار کو حاصل

کرنے کے لئے آیا تو منی بائی نے جواب دیا:

"......کچھ جذبات، کچھ نیکیاں اتنی قیمتی ہوتی ہیں کہ ساری دنیا کی دولت مل کر بھی اُن کو نہیں خرید سکتی۔ گلنار کا بچھڑا ہوا بھائی مل گیا۔ اس کے گلے میں بھی وہی لاکٹ تھا جو ریل حادثے کے دوران مجھے ملی گلنار کے گلے میں ملا تھا۔"

مزدوروں کی ہڑتال میں تیزی آتی گئی۔ آخرش ایک ایسا دن آیا کہ مزدوروں نے کارخانے کے مالک امین کی حویلی میں آگ لگا دی۔ امین وہاں سے بھاگ گیا اور گرے پڑے اقبال کے دروازے پر پہنچا۔ جب گلنار نے اُسے دیکھا تو اُس نے چلانے کیلئے منہ کھولا ہی تھا کہ امین نے اس کا منہ بند کرلیا۔ امین کے ہاتھ میں بے ہوش ہوئی گلنار کا لاکٹ آ گیا۔ امین غور سے دیکھنے لگا۔

"یہ تو ویسا ہی لاکٹ ہے جیسا میں نے اپنے بیٹے کے گلے میں ڈالا تھا اور بعد میں شبنم نے ویسا ہی بیٹی اور چھوٹے بچے کو بھی پہنا دیا تھا۔"

پھر اُسے منی بائی کی باتیں بھی یاد آ گئیں۔ اس کا مطلب گلنار میری بیٹی اور اقبال میرا بیٹا ہے۔ اُسے اپنے گناہ یاد آنے لگے اور وہ وہاں سے تیزی سے نکل گیا۔

امین نے وکیل کے پاس جا کر اپنی ساری دولت اقبال اور گلنار کے نام کر دی اور خود کہیں دور چلا گیا۔ وہ کمزوری اور بیماری کی حالت میں ایک ڈاکٹر کو ملا جس نے اُس کا علاج کیا۔ امین نے سوچا کہ اپنے گناہوں کی معافی کیلئے مجھے یہیں رہ کر مریضوں کی خدمت گزاری میں باقی عمر گزارنی چاہیئے۔

امین کی فطرت بدل گئی۔ وہ جنون کی حد تک مریضوں کی خدمت میں لگ گیا۔ وہ ڈاکٹر کے ساتھ اُس گاؤں میں خدمت گزاری کیلئے چلا گیا جہاں ہیضہ پھوٹ پڑا تھا۔ ایک دن وہ خدمت کرتے کرتے خود ہیضے کی لپیٹ میں آ گیا۔

یہاں اقبال نے اخبار میں امین کی نوٹو نکلوائی جس میں لکھا تھا کہ ہم نے آپ کو غلط سمجھا آپ جلد از جلد اپنے گھر واپس آجایئے۔ یہ خبر جب ڈاکٹر نے پڑھی تو اُس نے اقبال کو پیغام بھیجا کہ امین اُس کے پاس ہے۔ امین نے ڈاکٹر کو اپنی ساری روداد سنادی۔ امین نے ڈاکٹر سے التجا کی کہ وہ راز کو راز ہی رکھے تا کہ وہ اپنی بدلی ہوئی فطرت کو قائم رکھتے ہوئے انسانیت کی خدمت کے عظیم مقصد سے مرتے دم تک جڑا رہے۔ جب اقبال اور گلنار وہاں پہنچے، امین نے اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کردی تھی۔

اس ناول کے اختتام پر وہی سوال قاری کے سامنے پھر آجاتا ہے کہ آیا فطرتِ انسانی کسبی ہے یا وہبی۔ اس سوال کے کئی ایک جوابات میں سے ایک یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انسان نہ شرِ مطلق ہے اور نہ خیرِ مطلق۔ انسان کے اندر ہمہ وقت شر اور خیر کے درمیان جنگ جاری رہتی ہے۔ کبھی انسان کے اعصاب پر شر غالب آتا ہے اور کبھی خیر۔ ہاں انسان اپنی ذات کے تدریجی سفر میں اگر آخر پر خیر کے رنگ میں خود کو رنگتا ہے تو وہ کامیاب و کامران ہوجاتا ہے۔ یہ ناولٹ روایتی طرز کے ناول کے تتبع میں لکھا گیا ہے۔ واقعات کا انتخاب کچھ اس طرح کیا گیا ہے کہ چند ابتدائی واقعات پڑھ کر ہی قاری کی آنکھوں کے سامنے ساری کہانی محاکاتی صورت میں رقص کرنے لگتی ہے۔ روایتی طرز کے اس ناول میں مقامات کے ناموں کو تمثیلی انداز میں برتنے کی کوشش کی گئی ہے جس نے کئی جگہوں پر مضحکہ خیز صورت پیدا کی ہے۔ مثلاً بازارِ حسن کا نام شریف گلی رکھا گیا ہے اور اُس علاقے میں جہاں مرکزی کردار رہنے کے لئے آتا ہے سمندر نگر اور طوائف رانی جیسے ناموں نے بھی ناولٹ کے معیار کو رخ پہنچائی ہے۔

ناولٹ نگار کا نظریۂ حیات ہر مرحلے پر واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ ناولٹ نگار مارکسی فکر کا حامی اور مثالی دنیا کا متمنی ہے۔ ناولٹ نگار نے انسانی اعمال و افعال میں ماحول او رمعاشرے کے رول کو بڑی عمدگی سے سامنے لایا ہے۔

ناولٹ :۔ مورتی............ (ترنم ریاض)

ناولٹ ''مورتی'' کشمیر ہی نہیں بلکہ برصغیر کی اہم فکشن نگار خاتون ڈاکٹر ترنم ریاض کا تراشا ہوا شہ پارہ ہے۔اس ناولٹ کا زماں اگرچہ عصرِ رواں ہے لیکن اس کا مکاں کشمیر سے دہلی اور دہلی سے سعودی عربیہ تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ ناولٹ فن، فنکار، قدردانِ فن اور ناقدردانِ فن کے چوکھٹے میں معنی، احساسات اور جذبات کی ایک دنیا سمائے ہوئے ہے۔ یہ تخلیق ڈاکٹر ترنم ریاض کا ناول کے جہاں میں پہلا مگر توانا قدم ہے۔ قارئین کی توقعات پر پورا اُترتے ہوئے انہوں نے اس کے بعد اور زیادہ بہتر شہ پارے قارئین کے سامنے پیش کئے ہیں۔ جن میں ''برف آشنا پرندے'' کی اپنی ایک الگ اہمیت اور پہچان ہے۔ ناولٹ ''مورتی'' کے تقریباً تمام واقعات کو ایک غیر مرئی سی مرکز جو طاقت Centrifuga force مرکزی کردار ملیحہ سے کسی نہ کسی صورت جوڑے رکھتی ہے۔ یوں ہمیں اِسے ناولٹ کہنے کا جواز بھی مل جاتا ہے۔ ناولٹ میں پیش کئے گئے قصے کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

ملیحہ ایک سنگ تراش ہے جس نے مجسمہ سازی میں ڈگری حاصل کی ہے۔ وہ آرٹ جیتی ہے اور چاہتی ہے کہ اُس کے اپنے بھی اس فنِ لطیف کے اور اُس کے آرٹ کے قدردان ہوں۔ شومئی قسمت کہیے یا زمانے کی ریت، اس کی شادی اکبر علی نام کے ایک ایسے شخص سے ہو جاتی ہے جس کا آرٹ اور جمالیات سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ وہ ایک عام بزنس مین ہے اور اُسی طرح زندگی گزارنے کا روادار ہے۔ نتیجتاً ملیحہ کی سوچ اور مادہ پرست دنیا کے بیچ ٹکراؤ اس حد تک اس کے اعصاب پر اثر ڈالتا ہے کہ وہ خود کو تکلیف پہنچا کر خود سے ہی اپنا انتقام لینے کا راستہ اپنا لیتی ہے۔

ملیحہ کی کالج کے دنوں کی دوست عافیہ جواب شادی کے بعد سعودی عربیہ میں سکونت پذیر ہے اپنے سسرال والوں خاص طور پر اپنے جواں سال دیور فیصل سے ملیحہ کی شوخ طبیعت اور

فنکاری کا اکثر و بیشتر ذکر کرتی رہتی ہے۔ فیصل جو کشمیری الاصل ہے سعودی عربیہ سے اپنا نیا کاروبار جمانے کی خاطر دہلی چلا آتا ہے۔ عافیہ جاتے وقت فیصل سے کہتی ہے کہ دہلی پہنچ کر وہ ملیحہ سے بھی مل جو کہ وہیں رہائش پذیر ہے۔

فیصل جب ملیحہ کے بنگلے پر پہنچتا ہے تو اُسے یقین نہیں آتا کہ اُس کی بڑی بھابی کی بچپن کی دوست اتنی جوان اور پُرکشش عورت ہوگی۔ پہلی نظر میں اُس نے اندازہ لگایا کہ یہ ملیحہ کی بیٹی ہوگی۔ فیصل چونکہ خود نہ صرف فن شناس بلکہ مردم شناس بھی تھا۔ اُس نے جلدی اندازہ لگایا کہ ملیحہ کی اس پُر وقار اور حسین شخصیت پر ناقدری کی ایک بھاری چادر پڑی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ملیحہ ساری دنیا سے کٹ کر اپنے اردگرد اکیلے پن کے بنائے ہوئے خول میں دُبکی بیٹھی ہے۔

فیصل کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہر ملاقات پر ملیحہ کی شخصیت اُس کے لئے مزید پُراسرار، دلچسپ اور پُرکشش ہوتی جارہی ہے۔ آہستہ آہستہ فیصل پر یہ راز کھلا کہ ملیحہ کی سنجیدہ اور فنکارانہ شخصیت کی زمانے اور اُس کے اپنوں نے اس حد تک ناقدری کی ہے کہ اب اُس کا ذہن الجھنوں کے ایک بھنور میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اگر اُسے سازگار ماحول نہ ملا تو لطیف سے ذہن و دل کی یہ مورتی چکنا چور ہو جائے گی۔

فیصل اپنے دل میں ملیحہ کے لئے ایک عجیب سی چاہت محسوس کرنے لگا۔ جب اُس نے اس بات کا اظہار اپنی بھابی عافیہ سے کیا تو اُس نے مذاق سمجھ کر اَن سنا کر دیا۔ اِدھر ملیحہ نے بھی فیصل کی اُس کے فن میں دلچسپی کو دیکھ کر اُسے گھر سے تہہ خانے میں بنائے سٹیوڈیو میں رکھے اپنے فن پارے دکھائے۔ ملیحہ کے لئے یہ تہہ خانہ اپنے اندر کے اُس فنکار کے لئے جائے پناہ بن گیا تھا، جس کی ناقدری زمانہ اور اُس کا شوہر اکبر علی برسوں سے کرتا آرہا تھا۔ فیصل نے دیکھا کہ ملیحہ ایک ایسا فن پارہ بھی تراش رہی ہے جس میں ایک ماں اپنے بچے کو سینے سے لگائے ہوئے نظر آرہی ہے۔ پتھر کی اس مورتی کو ملیحہ کے فنکارانہ ہاتھوں نے جانے کیسے توازن بخشا تھا

کہ بظاہر غیر متوازن نظر آنے والی مورت شان سے کھڑی تھی۔ فیصل نے اس مورتی کے اندر ملیحہ کے ہزاروں مانوں کا سنگم محسوس کیا۔ اُسے معلوم تھا کہ ایسے نادر فن پاروں کی خالق ملیحہ کی گود اب تک خالی تھی اور یہ مورتی اُس کے لاشعور میں چھپے کرب کا فنکارانہ اظہار تھی۔

فیصل ملیحہ کے اندر چھپے فنکار کو اس کا حق دلانے کی فکر میں رات دن ڈوبا جا رہا تھا۔ وہ اس تیاری میں جٹ گیا کہ ملیحہ کے فن پاروں کی ایک نمائش منعقد کرائی جائے۔ ادھر اپنے آپ کو اذیت دینے سے راحت پانے کے عمل کے نتیجے میں ملیحہ کچھ دنوں تک صاحب فراش رہی۔ اسی اثنا میں ملیحہ کے شوہر اکبر علی نے اُسے بتائے بغیر تہہ خانے کو بزنس شوروم میں بدلنے کے لئے کاریگروں کو کام پر لگایا۔ کاریگروں اور مزدوروں نے ملیحہ کے تراشے فن پاروں کو بے قدری سے اِدھر اُدھر پھینک دیا۔ کسی مورتی کی ناک ٹوٹی تو کسی کا کان۔ افسوس کہ اُس ماں اور بچے کی مورتی میں ایسی دراڑ پڑ گئی کہ پوری مورتی کا توازن بگڑ گیا۔ یہ دیکھ کر ملیحہ کی حالت غیر ہو گئی اور اکبر علی نے اُسے پاگل خانے لے جانے کے لئے ڈاکٹر طلب کیا۔ اکبر علی کا ماننا تھا کہ ملیحہ کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ فیصل فن اور فن کار کی اس ناقدری کو دیکھتا رہا۔ وہ ملیحہ کے شکاروں کے پاس سر جھکا کر اُس سے بولا:

"آپ......آپ
مت کیجئے اس طرح......
میں بہت بڑا اسٹوڈیو بناؤں گا۔ ہر قسم کا پتھر......دنیا کے ہر کونے سے......
آپ اچھی ہو جائیں۔"

وہ سوتی رہی۔ وہ آنکھ بند کئے روتا رہا:

"انہیں مت لے جایئے پاگل خانے......"

آخرش فیصل نے اُن ٹوٹے پھوٹے فن پاروں کی نمائش "ٹوٹے ہوئے ستارے"

کے نام سے منعقد کی۔ ہر دیکھنے والا عش عش کرتا اور اُن کے خالق کے بارے میں سوال کرتا، ساتھ ہی ان فن پاروں کی شکستہ حالت پر افسوس بھی کرتا۔

اس ناولٹ کی ایک اہم جہت تانیثیت کی بھی ہے۔ یہ مرد اساس معاشرے کے اُس چلن کے خلاف خاموش احتجاج بھی ہے جہاں عورت کے جذبات اور احساسات کو بے وقعت گردانا جاتا ہے۔ عورت کو بھیڑ بکری کی طرح کسی بھی کھونٹے سے باندھا جاتا ہے۔ جہاں عورت کی تخلیقیت اور قائدانہ صلاحیتوں کو نظر انداز کر کے اُس محض عشرت وزیبائش کی ایک شئے تصور کیا جاتا ہے۔

اس ناولٹ کا خوبصورت ترین پہلو اس کا بیانیہ ہے۔ فکشن کی عمارت بیانیہ پر ہی ٹکی ہوتی ہے۔ بیانیہ جتنا طاقتور ہو، ترسیلِ مضمون اتنی ہی موثر ہو جاتی ہے۔ یہاں جزئیات نگاری نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ ناولٹ نگار نے پیشِ منظر کو موٴثر بنانے کے لئے پسِ منظر کی ایسی جاندار تصویریں کھینچی ہیں کہ انسان کچھ دیر کے لئے پسِ منظر میں ہی کھو جاتا ہے۔ ترنم ریاض چونکہ ایک شاعرہ بھی ہیں لہٰذا انہوں نے اس ناولٹ کے جملوں کی تراش خراش میں شاعرانہ ہنر مندی سے بھی کام لیا ہے۔

ناولٹ کے آغاز میں مجسموں کی نمائش کا ذکر ہے۔ نمائش کے لئے رکھے گئے مجسموں کی تفصیل پڑھتے پڑھتے قاری کے ذہن میں معنی کے ایک طلسماتی جہاں کی ان گنت کھڑکیاں وا ہوتی ہیں،۔ مثلاً یہ چند سطور ملاحظہ کیجئے:

> ''مرد کے مجسمے کا کندھا ٹوٹ چکا تھا...... جسم اور شانے کی درمیانی درار واضح تھی...... پاس ہی ایک اور مجسمہ تھا، ہرن کے بچے کا۔ اُس نے کان کھڑے کر کے چوکنے انداز میں اپنی ننھی سی تھوتھنی ذرا سی اوپر اٹھا رکھی تھی...... کتے کی آدھی دُم بھی ٹوٹ گئی تھی اور اُسی پتھر پر پڑی تھی...... گملے کے برابر دھونی رمائے سادھو کا مجسمہ تھا جس کی نیم وا

آنکھوں کے اوپر ابروؤں کے عین درمیان سے پیشانی تک جاتی ہوئی چار آڑھی لکیریں اُبھری ہوئی تھیں۔"

ان علامات کے سہارے ناولٹ نگار نے قاری کے ذہن کو ابتدا میں ہی جھنجھوڑنے کی بھرپور کوشش کی ہے تاکہ وہ آگے آنے والے واقعات کے لئے اپنے ذہن و دل کو تیار رکھے۔ زبان و بیان کی چاشنی، تہذیب و ثقافت پر مصنفہ کی گہری نظر اور فن کی باریکیوں کے شعور نے اس ناولٹ کی اثر پذیری میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔

ناولٹ:۔دُردانہ............(دیپک کنول)

ناولٹ "دردانہ" کے خالق دیپک کنول ہے۔ دیپک کنول کئی دہائیوں سے فکشن لکھ رہے ہیں۔ اُن کے افسانوں اور ناولوں میں کشمیر کی منظری خوبصورتی (Scenic Beauty) کی عکاسی بڑے فنکارانہ انداز میں ملتی ہے۔ وہ کشمیر کے پہاڑوں، جھیلوں، جھرنوں اور آبشاروں کے شیدائی ہیں۔ اسی لئے وہ جب ان نظاروں کی تعریف میں قلم اُٹھاتے ہیں تو قاری کے جمالیاتی شعور کو بھی مہمیز کرتے ہیں۔ ان کے اکثر فن پاروں میں کہیں نہ کہیں ہندپاک سرحد کا ذکر موجود ہے وہ اِس خونی لکیر کے روادار نہیں ہیں، اسی لئے سرحدوں کی تاربندی پر اپنے قلم سے خاموش احتجاج کرتے ہیں۔

ناولٹ "دردانہ" کا پلاٹ گلمرگ کے کوہستانی سلسلہ سے لے کر سرحد کے اُس پار کے گاؤں تک پھیلا ہوا ہے۔ ناولٹ میں پیش کی گئی کہانی اس بات کی غماز ہے کہ محبت وہ توانا جذبہ ہے جو انسان کے اندر معجزاتی تبدیلی لاسکتا ہے۔ محبت جتنی کھری اور سچی ہو اتنے ہی اُس کے زخم گہرے ہوتے ہیں۔ سچی محبت کبھی ناکام نہیں ہوتی بلکہ سختیوں سے گزرنے کے بعد اپنی منطقی منزل سے ضرور ہم آہنگ ہوتی ہے۔

ناولٹ "دردانہ" کی کہانی ایک ایسے گجرلڑکے شیرو کے اردگرد گھومتی ہے جسے چرس

گانجے کی ایسی لت ایسی لگی ہے کہ وہ اس کی طلب مٹانے کے لئے چوری چکاری سے بھی پیچھے نہیں رہتا۔ ماں باپ کی ناراضگی کو دیکھ کر ہر دفعہ بُرے کام چھوڑنے کا وعدہ تو کرتا ہے لیکن اُسے وفا نہیں کر پاتا ہے۔ اس طرح وہ مہینے میں ایک آدھ بار حوالات کی ہوا کھا کر ضرور آتا ہے۔ شیرو اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ وہ لوگ ہمیشہ اس پریشانی سے گھرے رہتے ہیں کہ اُن کا بیٹا شیرو کب سدھرے گا۔ ایک دِن شیرو نے گاؤں کے مقدم کے یہاں سینندھ لگائی لیکن پکڑے جانے پر اتنا پِٹا کہ ادھ مرا ہو گیا۔ شیرو کے ماں باپ کو کسی نے صلاح دی کہ اگر شیرو کی شادی کردی جائے تو وہ صحیح راستے پر ضرور آجائے گا۔ لیکن دور اور نزدیک میں کوئی بھی شیرو جیسے آوارہ گرد اور چور کو اپنی بیٹی دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اُلٹا اُس کے باپ کو لوگوں نے سو باتیں سنا کر رسوا کر دیا۔

ایک دن کچھ ایسا ہوا کہ سرحد پر گولی چلی۔ کوئی عورت غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے اس طرف آئی تھی اور سپاہی اُس کے پیچھے پڑے تھے۔ شیرو کسی راہگیر کو لوٹنے کی غرض سے ایک پہاڑی کھڈ میں چھپا بیٹھا تھا۔ بھاگتے بھاگتے وہ عورت اُسی کھڈ میں آگری۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ وہ مصیبت کی ماری ایک لڑکی ہے۔ اُس کا نام دردانہ ہے۔ وہ سرحد پار سے اس طرف اپنے چچا کے پاس آئی ہے کیونکہ اس کی ماں اُس کی شادی کسی آوارہ گر سے کرانا چاہتی ہے۔ لڑکی کی چاند سی صورت نے شیرو کی آنکھوں کو جیسے خیرہ کر دیا۔ شیرو نے جان جوکھم میں ڈال کر دردانہ کو اپنے کوٹھے (گجروں کی جھونپڑی) پر پہنچایا۔ دردانہ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے پولیس ان کے کوٹھے پر بھی آئی لیکن شیروا اور اس کے ماں باپ دردانہ کو چھپانے میں کامیاب ہو گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں دردانہ اور شیرو عشق کے کچے دھاگے میں بندھ گئے۔

اسی اثناء میں شیرو کے باپ نے دردانہ کے چاچا کا پتہ لگایا۔ اگلے دن شیرو کا باپ دردانہ کے چاچا سے شیرو کے لئے دردانہ کا ہاتھ مانگنے گیا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی اور خوش اسلوبی

سے ہوا کہ شیرو کو کبھی کبھی لگتا تھا کہ شاید وہ کوئی حسین خواب دیکھ رہا تھا۔

دردانہ کے آنے سے گھر جنت کا نمونہ بن گیا۔ شیرو نے اپنی تمام بڑی عادتیں چھوڑ دیں۔ اب وہ اپنے باپ کے ساتھ رات دن کھیت پر کام کرتا تھا۔ ایک دن دردانہ نے شیرو سے ایک سونے کی انگوٹھی اور لال ساڑھی لانے کی فرمائش کی۔ یہ فرمائش پوری کرنے کے لئے شیرو نے گلمرگ میں کئی دنوں تک لکڑیوں کے ٹھیکیدار کے یہاں جی توڑ محنت کی۔ یہاں گاؤں کے مقدم شہنواز خان کی نظر دردانہ کے حسن و جمال پر پڑی۔ وہ علاقے کی ہر خوبصورت عورت کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اُس نے ایک ترکیب سوچی۔ شہنواز خان نے اپنے منشی کی مدد سے شیرو کے گھر کے پچھواڑے میں اپنے کچھ زیورات چھپائے اور پھر پولیس میں شکایت کی کہ شیرو نیا اس کے گھر سے زیورات چُرائے ہیں۔ پولیس نے جب شیرو کے گھر کے پچھواڑے سے زیورات برآمد کئے، اُسی وقت شیرو شہر سے دردانہ کے لئے سونے کی انگوٹھی اور لال ساڑھی لے کر گھر پہنچا ۔انگوٹھی دیکھ کر پولیس کا یقین اور پختہ ہو گیا۔ شیرو کو چوری کے الزام میں چھ مہینے قید کی سزا ہو گئی۔

مقدم نے شیرو کا ماضی دردانہ کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ دردانہ یہ سب برداشت نہ کر سکی اور اگلے دِن شیر واس کے چاچا کے پاس گیا لیکن دردانہ نے ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اُسے وہاں سے بھگا دیا۔ جب شیرو چھ مہینے کے بعد جیل سے چھوٹ کر آیا تو اُس نے منشی سے سچ اُگلوا کر پھر مقدم کا کام تمام کر کے دردانہ کے چاچا کے یہاں پہنچ کر دردانہ کو آواز دی۔ دردانہ نے باہر آ کر کہا:

"تم کس دردانہ سے ملنے آئے ہو۔ جس دردانہ سے تم ملنے آئے ہو وہ اُسی دن مر گئی، جس دن وہ تمہاری اصلیت جان گئی......

مت چھوؤ مجھے، مت چھوؤ...... تمہارے یہ ہاتھ ہاتھ نہیں کالے ناگ ہیں، جو مجھے ڈس لیں گے۔...... مجھے نفرت ہے تم سے، تمہارے ہاتھوں سے......"

شیر خان وہاں سے نامراد ہو کر چل دیا۔ تبھی پولیس دردانہ کو غیر قانونی طور پر سرحد پار

کرنے کے جرم میں پکڑ کر لے گئی۔ اگلے دن ایک پھٹی ہوئی لوئی اوڑھے شیرو پھر دردانہ کے چاچا کے یہاں پہنچا۔ یہ جان کر کہ پولیس دردانہ کو گرفتار کر کے لے گئی ہے وہ سیدھے تھانے اور پھر تھانے سے سرحد کی طرف دوڑا۔ یہاں پولیس نے دردانہ کو سرحد پار کے سپاہیوں کے حوالے کیا، وہاں شیرو جنون کے عالم میں دیوانہ وار سرحد کی طرف دوڑا۔ وہ دردانہ کے پاس پہنچ کر چلاّ رہا تھا:

> ''دیکھ دردانہ دیکھ۔ جن ہاتھوں سے تجھے گھن آتی تھی میں نے وہ ہاتھ ہی کاٹ کے پھینک دیئے......'' دردانہ دوڑتی ہوئی شیرو کے پاس آئی اور دونوں اُس جگہ ایک دوسرے سے ملے جسے No mans land کہا جاتا ہے۔''

یہ ناولٹ جہاں پوری طرح مقامی رنگ لئے ہوئے ہے وہیں اس کے موضوع کی معنویت آفاقی ہے۔ انسانوں کی بنائی ہوئی سرحدیں زمینوں کو تو بانٹ سکتی ہیں لیکن دلوں کو نہیں بانٹ سکتیں۔ محبت کا نہ کوئی علاقہ ہوتا ہے اور نہ ہی محبت کرنے والے نامراد ہوتے ہیں۔ یہی پیغام آج کی سسکتی اور بلکتی انسانیت کے دکھوں کا مداوا ہے۔

اس ناولٹ کی کردار نگاری دیدنی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناولٹ نگار کو گجروں کی معاشرت اور سماجی دروبست کا مکمل علم ہے۔ ناولٹ نگار نے ہر کردار کو اُس کی اپنی ایک مخصوص زبان بخشی ہے جس کی بدولت پورا ناولٹ ایک محاکاتی مرقعے میں ڈھل گیا ہے۔

............●●●............

●...... وید راہی

پسِ منظر

شکیلہ سٹوڈیو کے باہر پہنچی تو اُسے وہاں کوئی آٹو رِکشا یا ٹیکسی نظر نہیں آئی۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی بس سٹینڈ کی طرف چل پڑی۔ دیکھا تو وہاں لوگوں کا ہجوم بس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اِس وقت اُس کے لئے وہاں کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ یہ سوچ کر وہ وہاں سے چل دی کہ آگے کوئی ٹیکسی یا آٹو رِکشا ضرور مل جائے گا۔ آگے بڑھتے ہوئے اچانک پیچھے مڑ کر دیکھا تو بس سٹینڈ پر بس کھڑی ہو رہی تھی۔ لیکن اب وہ وہاں تک بھاگ کر نہیں جا سکتی تھی۔ پشیمان ہو کر اُس نے بس کو اپنے قریب سے گزرتے ہوئے دیکھا۔

وہ جلدی سے مُووی سٹنٹ آرٹسٹس ایسوسی ایشن کے آفس پہنچنا چاہتی ہے۔ وہاں سے منصور کے گھر کا ایڈریس حاصل کرنا چاہتی ہے۔ جب سے اُسے پتہ چلا ہے کہ منصور آج شوٹنگ کرتے ہوئے زخمی ہو گیا ہے اُس سے رہا نہیں جا رہا۔ اپنے اِس رویّے پر وہ خود حیران ہے۔ کئی برسوں سے وہ خود بھی سٹنٹ اور ڈپلی کیٹ کا کام کرتی ہے اور اکثر منصور کے ساتھ مل کر بھی کام کیا ہے۔ سٹنٹ کرنے والوں کے لئے زخمی ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حادثے ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں وہ آج منصور سے ضرور ملنا چاہتی ہے۔ دیکھنا چاہتی ہے کہ اُسے زیادہ تو نہیں لگی۔

پیچھے مُڑ کر دیکھا تو ایک خالی رِکشا آ رہا تھا۔ اشارے سے اُسے رُکنے کے لئے کہا اور اُس میں بیٹھتے ہوئے بولی، ''نیو لنک روڈ۔''

رِکشا چل پڑا۔

شکیلہ کو یاد آرہا ہے جب اُس نے سٹنٹ آرٹسٹ کا کام شروع کیا تھا تو پیسے کی ضرورت کے لئے ہی کیا تھا لیکن دھیرے دھیرے اُسے یہ کام اچھا لگنے لگا تھا۔ بے شک اِس کام میں ہر وقت ایک رِسک رہتا ہے لیکن اِس رسک میں ایک تھرِل محسوس ہوتا ہے، ایک نشہ جیسا۔ منصور جیسے لڑکے تو اِس نشے کے بِنا رہ ہی نہیں سکتے۔ اُس جیسے بہادر اور بے دھڑک سٹنٹ مین فلم اِنڈسٹری میں کم ہی ہیں۔ سب لوگ اُس کی دلیری کی تعریف کرتے ہیں۔ ہیرو کا ڈپلیکیٹ بنتا ہے وہ۔ شکیلہ بھی ہمیشہ اُس کی سراہنا کرتی آئی ہے۔ منصور جب بھی کسی بڑے خطرے والا سٹنٹ کرنے میں کامیاب ہوا ہے دوسرے لوگوں کے ساتھ اُس نے بھی تالیاں بجائی ہیں۔ لیکن اِس وقت اُسے منصور کے بے خوف رویےّ پر غصہ آرہا ہے۔ وہ جان کی بازی لگانے والے کرتب کیوں کرتا ہے؟ کیا ضرورت ہے ایسے خطرے اُٹھانے کی؟ پھر شکیلہ کو خیال آیا کہ یہ کام بنا رِسک لئے ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ خود کئی بار اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتی۔

آٹو رِکشا تیزی سے بھاگ رہا تھا۔

اب وہ سوچ رہی تھی منصور اُسے دیکھ کر خوش ہوگا یا حیران؟

اُس نے اب تک منصور کے اُن سوالوں کا جواب نہیں دیا جو وہ کئی مہینوں سے پوچھ رہا ہے۔ ایک بار وہ اکٹھے شوٹنگ کر رہے تھے اور ایک دوسرے سے سٹ کر بیٹھے تھے۔ منصور نے آہستہ سے اُسے پوچھا تھا، ''کیا تمہیں کبھی محسوس ہوا کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔؟'' اُس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن وہ دل ہی دل میں مانتی تھی کہ اُسے کچھ کچھ محسوس ہوتا ہے۔ آج منصور اُسے اپنے پاس آیا ہوا دیکھ کر اُس کے دل کی بات سمجھ لے گا۔ وہ چاہے منہ سے کچھ نہیں بولے گی لیکن اُس کا وہاں جانا ہی بہت کچھ کہہ دے گا۔ اُسے اچانک خیال آیا کہ اُس کا منصور سے ملنے جانا مناسب نہیں۔ گھر کے حالات ہی ایسے نہیں۔ ابھی اُسے اِس راستے پر آگے نہیں بڑھنا چاہیئے۔ اُس نے آٹو سے باہر جھانک کر دیکھا نیو لنک روڈ آگیا تھا۔ سٹنٹ ایسوسی ایشن کا آفس آنے والا تھا۔ اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ آفس سے منصور کے گھر کا پتہ نہیں پوچھے گی۔ اُس نے آٹو

والے سے رُکنے کے لئے کہا۔رُکتے رُکتے بھی آٹو ٹھیک وہاں جا کر رُکا جہاں سامنے ہی ایسوسی ایشن کا آفس تھا۔اُسے خیال آیا چلو یہاں تک آئی ہوں تو ممبر شپ فیس ہی بھر دیتی ہوں۔کئی مہینوں سے اِس طرف آنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔آٹو پر سے اُتر کر اُس نے آٹو والے کو پیسے دیئے اور آفس کی طرف مُڑ گئی۔

گلیارے کے اندر آ کر سیڑھیاں چڑھنے لگی تو اوپر سے امجد بھائی کو آتے دیکھ کر ٹھہر گئی۔ بیساکھیوں کے سہارے سیڑھیاں اُترتے ہوئے امجد بھائی کو تکلیف ہو رہی تھی۔کسی وقت زبردست سٹنٹ مین تھے امجد بھائی۔پہلوانی جُثہ تھا۔سَو فٹ اوپر سے چھلانگ لگاتے جھجکتے نہیں تھے۔آج اُنہیں اِس طرح لنگڑاتے ہوئے سیڑھیاں اُترتے دیکھ کر شکیلہ کا من اُداس ہو گیا۔

جب امجد بھائی سامنے پہنچے تو شکیلہ نے اسلام علیکم کہا۔

"وعلیکم۔جیتی رہ۔" امجد بھائی نے دعا دی۔

"کیا حال ہے اَب آپ کے پَیر کا، امجد بھائی؟"۔

"اب تو یہ پَیر چلتا کم ہے اور چلنے سے زیادہ منع کرتا ہے۔مجھے تو اس نے برباد کر دیا۔لگتا نہیں کہ اب میں دوبارہ کام کر سکوں گا۔"

شکیلہ کا دل بیٹھنے لگا۔

"اُس پروڈیوسر سے معاوضہ ملا؟"

پروڈیوسر کہتا ہے اِس وقت وہ کچھ نہیں دے سکتا۔کیس فیڈریشن میں گیا ہے۔اپنی ایسوسی ایشن تھوڑی بہت مدد کر رہی ہے۔لیکن کب تک؟

جب ہاتھ پاؤں سلامت تھے اِن باتوں کے بارے میں کس نے سوچا تھا، اچھا چلو اللہ حافظ۔" کہہ کر امجد بھائی باہر نکل گئے۔وہ جاتے جاتے بھی بڑبڑا رہے تھے۔شکیلہ نے اُداس ہو کر لمبی سانس لی۔سیڑھیاں چڑھ کر وہ آفس میں آ گئی۔سیکریٹری جسونت سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا حال ہے شکیلہ؟"

"ٹھیک ہوں جسونت بھائی۔امجد بھائی بہت پریشان ہیں؟"

"بے چارے کا سارا کیریئر خراب ہو گیا۔ کچھ اور کرنے کے لائق بھی نہیں رہا۔ پریشان تو ہو گا ہی۔"

"کوئی بُرا پروڈیوسر ہے جس کے سیٹ پر حادثہ ہوا۔"

"چھوٹی فلم، چھوٹا پروڈیوسر۔ پتہ نہیں ایسے لوگ فلمیں کیوں بناتے ہیں۔"

"ہم لوگوں کا کام ہی ایسا ہے۔"

"پھر بھی نئے ممبر بننے کے لئے دو سَو درخواستیں آئی ہوئی ہیں۔"

"اللہ" شکیلہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"دنیا اسی طرح چلتی ہے۔" جسونت سنگھ نے کہا "تمہیں منصور کے بارے میں پتہ چلا؟"

"ہاں" شکیلہ چونک اُٹھی۔ "زیادہ تو نہیں لگی؟"

"تم خود ہی دیکھ لو۔ اندر والے کمرے میں لیٹا ہوا ہے۔"

"یہاں ہے وہ؟"

"ہاں۔"

شکیلہ اپنے آپ کو روک نہیں پائی۔ وہ بھول گئی کہ ابھی ابھی اُس نے منصور سے نہیں ملنے کی بات سوچی تھی۔ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی وہ اندر چلی گئی۔ دیکھا تو منصور بڑے صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ آگے بڑھی۔ اُس کے ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور چہرے پر کچھ خراشیں بھی تھیں جن پر دوائی لگی ہوئی تھی۔ کچھ لمحوں تک وہ ایک ٹک دیکھتی رہی۔ اُسے جگانا نہیں چاہیئے۔ اُس نے سوچا۔ وہ مڑی۔ اُسی وقت منصور کی آنکھ کھل گئی۔ شکیلہ کو دیکھا تو اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"شکیلہ؟"

شکیلہ ٹھٹک گئی۔ مُڑ کر منصور کی طرف دیکھنے لگی۔ منصور مسکرا کر بولا۔" میں تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا؟"

"میرے بارے میں؟"

''ہاں''

''اِس حالت میں میرے بارے میں کیا سوچ رہے تھے؟''

''سوچ رہا تھا کہ کاش اِس وقت تم یہاں آجاؤ۔''

شکیلہ شرما گئی جیسے اُس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ وہ کوشش کرنے لگی کہ منصور بھانپ نہ لے۔

''بیٹھ جاؤ۔'' منصور تھوڑا بھانپ گیا تھا۔

شکیلہ سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

منصور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ماسٹر جان محمد کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے جس نے غلط اشارہ کیا اور میں غلط جگہ پر کُود گیا۔ لگی تو بے شک کچھ زیادہ مگر اِسی بہانے تم مجھے دیکھنے آگئیں۔ اِس کا مطلب ہے تمہارے مَن میں میرے لئے کچھ تو ہے۔''

''ہم ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لئے اتنی ہمدردی تو ہونی ہی چاہیئے۔'' شکیلہ نے بات کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''لیکن تم یہاں لیٹے ہوئے ہو۔؟ گھر کیوں نہیں گئے؟''

''گھر جاؤں گا تو میری اماں مجھے اِس حالت میں دیکھ کر پریشان ہو جائے گی۔ اُسے تو یہ بھی نہیں پتہ کہ میں ڈپلیکیٹ سٹنٹ مین کا کام کرتا ہوں۔

''توبہ! توبہ! تو کیا تم گھر جاؤ گے ہی نہیں؟''

''جب تک ماتھے پر پٹی بندھی رہے گی نہیں جاؤں گا۔''

''اللہ!''

''میں نے گھر میں کہا ہوا ہے کہ میں ایک پرانے فرنیچر کی دوکان پر کام کرتا ہوں۔''

''اتنا جھوٹ؟''

''کیا کِیا جائے۔ اِس دنیا میں جھوٹ کے بِنا کام نہیں چلتا۔''

''پھر تو تمہاری بات پر کوئی اعتبار ہی نہیں کرے گا۔''

''تمہارے ساتھ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا شکیلہ۔ تم یقین کرو کہ اب تو میں تمہارے

بغیر............"

"بس بس یہاں زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں۔"

"کاش میں تمہیں بتا سکتا کہ میں تمہیں کتنا............"

"اگر تم بولتے جاؤ گے تو میں جاتی ہوں۔" وہ کھڑی ہوگئی۔ "بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔ پلیز بیٹھ جاؤ۔" منصور نے منت کی۔

شکیلہ بیٹھ گئی۔

منصور بولا۔ "میں تمہیں اپنا دل کھول کر دکھانا چاہتا ہوں۔"

"منصور کاش میں تمہیں بتا سکتی کہ میرے حالات کیسے ہیں؟"

"کیوں نہیں بتاتیں۔ میں سننا چاہتا ہوں۔"

"کیسے بتاؤں۔ مجھ میں اتنی ہمّت نہیں۔"

"مجھے بتاؤ شاید میں تمہاری کچھ مدد کرسکوں۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

"آخر کیا ہے تمہاری مجبوری؟"

"کیسے بتاؤں۔"

دونوں چپ ہوگئے۔

"میں جاتی ہوں۔" شکیلہ دھیرے سے اُٹھی۔

منصور چاہتا تھا وہ نہیں جائے۔

"تھوڑی دیر اور بیٹھو۔"

"گھر والوں کو بتانا پڑتا ہے کہ دیر کیوں ہوئی۔"

منصور کچھ کہہ نہیں پایا۔ شکیلہ نے قدم بڑھایا تو منصور بولا، "آٹو میں جاؤ گی نا؟"

"ہاں"

"میرا گھر راستے میں پڑے گا۔ آٹو رُکوا کر مسیج دے دینا۔"

"اگر تمہاری امّاں نے پوچھا میں کون ہوں تو پھر؟"

"کہہ دینا کہ تم بھی اُسی فرنیچر والے کے پاس کام کرتی ہو۔"

پھر منصور نے اُسے گھڑی ہوئی ساری کہانی بتادی۔ وہاں سے نکلتے ہوئے شکیلہ نے پیچھے مُڑ کر منصور کو دیکھا تو وہ اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ منصور کو محسوس ہوا کہ شکیلہ کی نظریں کہہ رہی ہیں، میں تمہیں چاہتی ہوں۔ وہ آہستہ سے صوفے پر سے اُٹھا اور شکیلہ کے پاس آ گیا۔ شکیلہ اُسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ منصور نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر اُسے ہلکے سے دبایا۔ شکیلہ نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

......☆......

شکیلہ نے سوچا نہیں تھا کہ باہر سے دِکھ رہی کشادہ گلی اندر جا کر اتنی تنگ ہو جائے گی۔ کیچڑ اِتنا کہ نالی نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہی تھی روشنی بھی کم ہو رہی تھی۔ آخر ایک مکان کا نمبر پڑھ کر اُس نے اندازہ لگا لیا کہ اُس کے آگے دو گھر چھوڑ کر تیسرا گھر منصور کا ہے۔

اُس نے گھنٹی بجائی۔

رفیعہ نے دروازہ کھولا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایک ہی عمر کی دونوں لڑکیاں تھیں۔

"یہاں منصور علی رہتے ہیں؟" شکیلہ نے پوچھا۔

اُسی وقت ماں بھی کچن سے نکل کر آ گئی۔ "کون آیا ہے رفیعہ؟"

پھر اُس نے شکیلہ کو دیکھا تو پوچھنے لگی۔ "کِس سے ملنا ہے؟"

دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر شکیلہ ذرا گھبرائی۔ اس کو جھوٹ بولنا تھا۔ کہنے لگی۔ میں اشرف علی پرانے فرنیچر والے کے شورُوم سے آئی ہوں۔ اُنہوں نے منصور علی کو تین دِنوں کے لئے مالیگاؤں بھیجا ہے۔ بس یہی بتانے میں یہاں آئی ہوں۔" شکیلہ یہ کہہ کر واپس جانے کے لئے مُڑی۔ ماں نے کہا۔ "اندر آ جا بیٹی۔ چائے پی کر جاؤ۔"

"نہیں مجھے گھر پہنچتے دیر ہو جائے گی۔" کہہ کر شکیلہ واپس بازار کی طرف چل دی۔

ماں اندر چلی گئی تو رفیعہ شکیلہ کے پیچھے پیچھے گلی میں آ گئی۔

اُس نے آواز دی، ''ذرا رُکیئے تو۔''

شکیلہ کھڑی ہوگئی۔ مُڑ کر رفیعہ کی طرف دیکھا۔ رفیعہ شکیلہ کے پاس آ گئی۔ اُس کے چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ اُس نے پوچھا۔ ''آپ کا نام کیا ہے؟''

''میرا نام شکیلہ ہے۔''

''آپ کا نام آپ کی طرح ہی خوبصورت ہے۔''

''جی، جی۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''آپ گھبرایئے مت۔ آپ ہمارے منصور بھائی سے کہہ دیجئے کہ اُن کی پسند ہمیں بھی پسند ہے۔''

''جی۔ جی یہ آپ............میں تو............' ''میں آج اشرف علی کی دوکان پر گئی تھی۔ پتہ چلا کہ منصور بھائی وہاں کام نہیں کرتے۔ میرا شک پکا ہوگیا کہ وہ فلموں میں کام کرتے ہیں۔ ہیں نا؟ آپ بھی اُن کے ساتھ ہی کام کرتی ہوں گی۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔'' کہتے ہوئے رفیعہ مسکرائے جا رہی تھی۔

پہلے تو شکیلہ گھبرائی۔ پھر وہ بھی مسکرانے لگی۔

''اماں کو تو نہیں بتایا آپ نے؟''

''نہیں میں نے اُنہیں نہیں بتایا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔'' اب شکیلہ کو ایک نیا جھوٹ گھڑنا پڑا۔ بولی''

''دراصل منصور کو آج ایک آؤٹ ڈور شوٹنگ کیلئے مہابلیشور جانا ہے۔''

''پھر تو آپ بھی جا رہی ہوں گی۔''

شکیلہ کو لگا کہ اُس کا جھوٹ پکڑا گیا ہے۔ اُسے ایک اور جھوٹ بولنا پڑا۔ ''ہاں ہاں، میں بھی جا رہی ہوں لیکن مجھے ایک دن کے بعد جانا ہے۔''

رفیعہ نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہی ہاتھ کچھ دیر پہلے منصور نے بھی پکڑا تھا۔ اُس سے تو

چھڑالیا تھا لیکن اِس سے نہیں چھڑا سکی۔ رفیعہ نے اُس کا ہاتھ سینے سے لگالیا اور کہنے لگی، ''آپ کتنی اچھی ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد جب شکیلہ اُس کیچڑ بھری گلی سے باہر نکل رہی تھی تو اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پہلے بھی کئی بار یہاں آچکی ہے۔ وہ گلی اُسے اپنی گلی جیسی لگ رہی تھی۔ گلی کے سِرے پر پہنچ کر اُس کے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو رفیعہ گھر کی دہلیز پر کھڑی ہاتھ ہلا کر بائی بائی کر رہی تھی۔ اُس نے بھی ہاتھ ہلا کر جواب دیا اور پھر بڑی سڑک پر آ گئی۔

......☆......

شکیلہ کو دیکھ کر اُس کی چھوٹی بہن شمی کھڑکی سے ہٹ کر جلدی جلدی دروازے کے پاس آئی اور چپکے سے دروازے کھول دیا۔ شکیلہ ابھی اندر بھی نہیں آئی تھی کہ شمی نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''آپا اتنی دیر کہاں لگادی؟

اماں اور ابا غصے سے بھرے بیٹھے ہیں۔ سوچ سمجھ کر بات کرنا۔ لنڈن والا گجراتی سیٹھ جی آیا تھا، تمہارا انتظار کر کے گیا ہے۔''

شمی کی باتیں سُن کر شکیلہ اُداس ہوگئی۔ گھبراہٹ بھی ہونے لگی۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آواز سُن کر افضل خان اپنے کمرے سے نکلا اور اُس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلا آیا۔ بڑے کرخت لہجے میں پوچھنے لگا۔ ''اتنی دیر تک کہاں تھی؟''

''ایسوسی ایشن کے آفس میں چلی گئی تھی۔ کئی مہینوں سے فیس نہیں بھری تھی۔''

''فون کر کے ہمیں بتانا تھا۔''

''میرا موبائل تو آپ نے لے لیا تھا۔''

''ایسوسی ایشن کے آفس سے فون کر سکتی تھیں۔''

''مجھے خیال نہیں آیا۔''

''یہی تو خراب بات ہے تمہیں گھر کا خیال نہیں رہتا۔ یہ کہتے کہتے افضل خان اُس کے قریب آ گیا۔ شکیلہ کو اُس کے منہ سے شراب کی بُو آئی وہ پیچھے ہٹ گئی۔ افضل خان بڑی شان

سے بتانے لگا۔ ''وہ لنڈن والا سیٹھ کچھ روز کے لئے ہندوستان آیا ہوا ہے۔ ابھی ابھی یہاں بیٹھا تیرا انتظار کر کے گیا ہے۔ وہ تجھے تاج محل ہوٹل لے جانا چاہتا تھا۔''

''مجھے نہیں جانا اُس کے پاس۔'' شکیلہ نے دل کو مضبوط کر کے کہا۔

''کیوں نہیں جانا؟'' افضل خان کو غصہ آنے لگا۔

''بس نہیں جانا۔''

''بعد میں وہ تمہیں لنڈن بھی لے جانا چاہتا ہے۔''

''مجھے لنڈن جا کر کیا کرنا ہے۔''

''تو بے وقوف ہے۔''

''بے وقوف ہی سہی۔''

افضل خان آگے بڑھا اور بالکل اُس سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا ''تمہاری عمر کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ کیا تم خوش حال زندگی نہیں چاہتیں۔؟''

''بڑی ناسمجھ ہے تو شکیلہ۔ اب تو بچی نہیں ہے۔ تجھے اپنا اچّھا بُرا خود سوچنا چاہیئے۔ میری بات مان۔ چل میرے ساتھ۔ میں خود تجھے سیٹھ کے پاس لے جاتا ہوں۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔''

''نہیں جانا تو جا بھاڑ میں جا۔'' افضل خان طیش میں آ گیا، ''تیری ماں ہی تجھے سمجھائے گی۔ اگر تو نے ماں سے مار ہی کھانی ہے تو تیری مرضی۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

شکیلہ رونے لگی۔ روتے روتے وہ بستر پر لڑھک گئی۔ تھوڑی دیر بعد شمّی اُس کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور اپنے دوپٹے سے اُس کے آنسو پونچھنے لگی۔ شکیلہ کُھل کر رونے لگی اُس نے شمّی کو گلے سے لگا لیا۔

دروازہ کھلا اور اُن کی ماں حمیدہ بیگم اندر آ گئی۔ آتے ہی اُس نے حکم دیا، ''شمّی تو باہر جا۔'' شمّی ڈرتے ڈرتے باہر چلی گئی۔

شکیلہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ حمیدہ اُس کے قریب جا کر بیٹھ گئی اور اُسے سینے سے لگا کر پیار کرنے

لگی۔ شکیلہ کو اُس کے کپڑوں سے وہی بُو آئی جو تھوڑی دیر پہلے افضل خاں کے مُنہ سے آئی تھی۔ اُسے گھن آنے لگی۔

حمیدہ نے دُلارتے ہوئے کہا، ''بیٹی اَب تو بڑی ہوگئی ہے۔ کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو سمجھنے کی کوشش کیا کر۔ تو بمبئ میں رہتی ہے۔ یہ بڑا ظالم شہر ہے۔ مگرمچھ کی طرح آدمی کو چبا جاتا ہے۔ عورتوں کے لئے تو اور بھی مشکل ہے۔ کوئی اپنا نہیں۔ سب پھاڑ کھانے کی تاک میں رہتے ہیں۔ اگر بچ کر رہنا ہے تو اپنے پاس وسیلہ ہونا چاہیئے۔ طاقت ہونی چاہیئے۔ سب سے بڑی طاقت پیسہ ہے۔ اپنے پاس پیسہ ہے تو کوئی خطرہ نہیں۔ تیرا ابا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اُس کی بات پر سوچ کر دیکھ۔ بڑی مشکل سے لنڈن والا سیٹھ ہاتھ میں آیا ہے اگر تو نے یہ چانس بھی............''

''امّاں میں ایسی زندگی نہیں جینا چاہتی۔''

''پھر ہم سب کی گزر بسر کیسے ہوگی؟''

''میں تو کما رہی ہوں نا امّاں؟''

''تمہاری اِس کمائی سے کچھ نہیں ہونے والا۔ اور کتنی دیر تم یہ کام کر سکو گی؟ یہ زور کب تک رہنے والا ہے؟ اور پھر یہ بھی کوئی کام ہے ہاتھ پیر سلامت ہیں تو ٹھیک، کچھ ہوگیا تو کوئی پوچھنے والا نہیں۔''

''امّاں تمہیں اللہ پر بھروسہ نہیں؟''

حمیدہ زور سے ہنس پڑی۔ بولی، ''اللہ پر بھروسہ کرنے کا مطلب ہے اللہ نے جو دیا ہے اُس پر بھروسہ کرو۔ اُس نے تمہیں زندگی دی ہے تو زندگی سنوارنے کے لئے جوانی دی ہے۔ یہ جوانی ہمیشہ رہنے والی نہیں۔ میں اور تیرا ابا ہمیشہ رہنے والے نہیں۔ ہمارے بعد تیرا کیا ہوگا؟ شمّی کا کیا ہوگا؟ سوچ کر دیکھ بیٹی۔ اللہ نے تجھے دماغ دیا ہے نا؟ دماغ سے کام لے۔ آنے والے دنوں کے بارے میں سوچ۔''

''امّاں مجھے سوچنے کے لئے تھوڑا وقت چاہیئے۔'' شکیلہ کو سچ مچ محسوس ہوا کہ سوچنا ضروری ہے۔

''زیادہ سوچوگی تو پاگل ہوجاؤ گی۔ تیری عمر میں، میں بھی پاگل ہوجانے سے بڑی مشکل سے بچ پائی تھی۔ بیٹی میں تجھے اپنے تجربے سامنے رکھ کر بچانا چاہتی ہوں۔ میں اِنہی راستوں سے گزر کر آئی ہوں۔ میں چاہتی ہوں جو مجھ پر گزری وہ تجھ پر نہ گزرے۔ یہ کبھی مت بھولنا کہ یہ مردوں کی دنیا ہے۔ مرد کوشش کرتا ہے کہ عورت کی گردن اپنے گھٹنوں میں دبا کر رکھے۔ مردوں سے بچنے کے لئے مردوں کی ہی ضرورت پڑتی ہے۔ تیرے ابا کو میں نے کیسے نکیل ڈال کر رکھا ہے، یہ مجھے ہی پتہ ہے۔''

شکیلہ کو دھیرے دھیرے محسوس ہونے لگا کہ اماں کی باتوں میں سچائی ہے۔ اُس نے سب کچھ سہن کیا ہوا ہے۔ وہ بہت کچھ جانتی ہے لیکن ماں کو یہ نہیں پتہ کہ دنیا میں منصور جیسے مرد بھی ہیں۔ وہ میرے پیار کی بھیک مانگ رہا ہے۔''

اماں پھر بولنے لگی، ''پہلے سب مرد کچھ اور ہوتے ہیں بعد میں کچھ اور ہوجاتے ہیں۔ تم دونوں لڑکیوں کا جو اصلی ابا ہے، اُسے میں نے اِسی لئے چھوڑا تھا۔ اُس نے صرف میری کمائی پر عیش کرنا شروع کردیا۔ اوپر سے مرد ہونے کا رُعب بھی دکھاتا تھا۔ میں نے اُسے لات مار کر گھر سے نکال دیا۔ تمہارا یہ ابا اور کچھ نہیں تو شراب پی کر سویا تو نہیں رہتا۔ جاگتا رہتا ہے۔ ہماری حفاظت کرتا ہے۔ تمہیں پتہ نہیں کچھ روز پہلے تیرے ابا کو اِس وارڈ کے کونسلر نے بُلا کر فرمائش کی کہ ہم اُسے گھر میں بلائیں۔''

یہ بات سُن کر شکیلہ کا دل کانپ اُٹھا۔ حمیدہ دیکھ رہی تھی کہ اُس کی باتوں کا اثر ہو رہا ہے۔ وہ بولتی جارہی تھی، ''یہ تیرے ابا کی ہوشیاری تھی کہ اُس نے اُس حرامزادے کونسلر کو کسی ترکیب سے ٹال دیا۔ اگر گھر میں کوئی مرد نہیں ہوگا تو اِن آفتوں سے کیسے بچیں گے؟ ٹیڑھے کاموں میں عقل بھی ٹیڑھی چاہیئے۔''

امّاں جو کہہ رہی تھی وہ سچ تھا لیکن اس میں بے حد تلخی تھی۔ گھٹن تھی۔ جان لیوا سچ تھا یہ۔ اِس سے بچنا مشکل تھا۔ شکیلہ کو پھر منصور کی یاد آئی۔ کیا وہ مجھے اِس پھندے سے نکال سکتا ہے۔؟ جب اُسے پتہ چلے گا کہ میں کون سی غلاظت میں ڈوبی ہوئی ہوں تو کیا وہ مجھے ہاتھ بھی لگائے

گا؟ وہ اندر ہی اندر کانپ اُٹھی۔ اُس نے امّاں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا، ''امّاں مجھے سوچنے کا موقع دو۔''

''وہ سیٹھ دو دن کے بعد لندن چلا جائے گا۔''

''اُسے جانے دو امّاں! مجھے سوچنے کے لئے کچھ دن چاہئیں۔'' حمیدہ بیگم بستر پر سے اُٹھی۔ دروازے کے قریب جا کر پھر رک گئی۔ بولی، ''شکیلہ بیٹی، تیرے پاس سوچنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی راستہ ہوتا تو مجھے نہیں ملتا کیا؟ تب سوچ سوچ کر میرا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ ٹیڑھے ٹیڑھے راستوں پر تمہیں نہیں ڈالنا چاہتی۔ پھر بھی تو نے اپنی ضد نہیں چھوڑی تو............''

وہ دوبارہ شکیلہ کے پاس آ کر بیٹھ گئی، اور کہنے لگی ''شمّی ابھی چھوٹی ہے، پڑھ رہی ہے۔ کیا اُسے اِس کام میں لگانا ٹھیک ہوگا؟''

شکیلہ گھبرا کر بولی، ''امّاں یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ یہ بات تم نے سوچی بھی کیسے؟''

''اگر میں تمہارے بارے میں ایسا سوچ سکتی ہوں تو اُس کے بارے میں کیوں نہیں؟ تم دونوں میرے جگر کے ٹکڑے ہو۔ مجبور ہو کر سب کچھ سوچنا پڑتا ہے۔ خدا کسی کو اِتنا مجبور نہ کرے۔ بے شک شمّی چھوٹی ہے۔ میں چاہتی ہوں ابھی اُسے اِس کام میں نہ لگاؤں۔ تم جانتی ہو آج کل پڑھائی لکھائی بھی ضروری ہے۔ پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی لڑکیوں کی مانگ بڑھ گئی ہے۔ تو فلموں میں کام کرتی ہے اِس سے بھی تمہاری کشش بڑھ گئی ہے۔ اِسی لئے یہ سیٹھ تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ تم سوچنے کا وقت مانگ کر موقع گنوانا چاہتی ہو تو تمہاری مرضی۔ میری ایک بات گانٹھ باندھ لو، وقت آنے پر سب کو اپنا فرض نبھانا پڑتا ہے۔ میں نے تم دونوں کو پال پوس کر بڑا کیا، کس کے لئے؟ اب میرا جسم لاغر ہوتا جا رہا ہے۔ جان میں دم نہیں رہا۔ اب جو کرنا ہے تمہیں ہی کرنا ہے۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے۔ یہ کہہ کر حمیدہ بیگم اُٹھی، دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔

شکیلہ کو محسوس ہوا کہ اُس کے دل کی دھڑکن رُکنے لگی ہے۔ اُس کی سانس گھٹنے لگی۔ تکیئے پر سر رکھ کر وہ دل ہی دل میں تڑپنے لگی۔

پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا۔

شمّی نے جھنجھوڑ کر کہا، ''آپا کھانا کھالو''

شکیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا، لیکن اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے آپا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔''

شکیلہ کچھ بولی نہیں۔ اُس نے شمّی کو اپنی بانہوں میں بھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ شمّی حیران تھی ، آپا کو کیا ہوا ہے۔

رات شکیلہ کو نیند نہیں آرہی تھی۔ کچھ روز پہلے اُس نے ایک فلم کی شوٹنگ کی تھی جس میں ہیروئین کی ڈپلیکیٹ بنی ہوئی وہ کانٹے دار جھاڑیوں کے جنگل میں تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ اُس کے پیچھے کچھ غنڈے بھیڑیوں کی طرح لگے ہوئے تھے۔ وہ ایک جگہ کانٹوں میں پھنس گئی۔ پھر بھی اُسے رُکنا نہیں تھا۔ وہ زور لگا کر کانٹوں سے چھوٹ گئی لیکن اُس کے ہاتھ پاؤں مُنہ سب جگہوں پر خراشیں آگئیں۔ کپڑوں کی دھجیاں اُڑ گئیں۔ خون بہنے لگا۔ لیکن وہ رکی نہیں۔ بھاگتی رہی۔ اِس وقت اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اُسی طرح لہولہان ہو کر بھاگتی جا رہی ہے۔ اُس کا کام یہی ہے۔ یہ فرض اُسے نبھانا ہی پڑے گا۔

کانٹے دار جھاڑیوں سے بھرے جنگل میں بھاگتے ہوئے آخر وہ ایک کگار پر پہنچ گئی۔ دور نیچے ایک ندی بہہ رہی تھی۔ پیچھے مُڑ کر دیکھا بھیڑیئے بڑھے آرہے تھے۔ وہ بالکل نزدیک پہنچ گئے تھے۔ اُس نے کگار سے چھلانگ لگا دی۔ وہ چونک اُٹھی۔ گھبرا کر بیٹھ گئی۔ کلیجہ دھونکنی کی طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ پسینہ پسینہ ہو گئی۔ رات آدھی سے زیادہ بیت گئی تھی۔ ہر طرف گہرا اندھیرا تھا۔ اُس وقت سٹنٹ آرٹسٹ ایسوسی ایشن کے آفس میں صوفے پر پسرے ہوئے منصور کو بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ شکیلہ کا خیال اُسے گھیرے ہوئے تھا۔ بہت سی شوٹنگوں میں اُنہوں نے ایک ساتھ کام کیا ہوا تھا۔ ایک شوٹنگ میں فلم کی ہیروئین کی جگہ شکیلہ پانی میں ڈوب رہی تھی اور منصور کو ہیرو کا ڈپلیکیٹ بن کر اسے پانی سے باہر نکالنا تھا۔ جُھوٹ مُوٹ غوطے کھاتی ہوئی شکیلہ کو منصور نے اپنی بانہوں میں اُٹھا لیا تھا۔ گہرے اندھیرے میں اِس وقت شکیلہ کی یادیں منصور کو

سونے نہیں دے رہیں تھیں۔ اُس کا رُواں رُواں مضطرب تھا۔ ایک شوٹنگ میں ایک مکان کو آگ لگی ہوئی تھی۔ منصور شکیلہ کو اُٹھا کر آگ سے باہر لے آیا تھا۔ لیکن شکیلہ کے کپڑوں نے آگ پکڑی تھی۔ منصور نے بے تاخیر اُسے زمین پر لٹا کر اُس کے کپڑوں میں لگی آگ کو بجھا دیا تھا۔ اُن لمحوں کی یادوں میں منصور جل رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ جان گیا تھا کہ شکیلہ کے بنا جینا مشکل ہے۔

......☆......

شکیلہ قد آدم آئینہ کے سامنے بیٹھی ہے اور خاتون اُس کا میک اَپ کر رہی ہے اور کہہ رہی ہے۔ ''میں آج تمہارا کتنا بھی میک اَپ کروں، تمہارے چہرے پر جو اُداسی ہے اُسے چھپا نہیں سکتی۔''

شکیلہ نے ذرا مسکرا کر جواب دیا۔ ''ہم ڈپلیکیٹ ہیں۔ کیمرے میں ہمارا پورا چہرہ تو کبھی دکھائی نہیں دے گا۔ کسی کو ہماری اُداسی کا پتہ نہیں لگ سکتا۔''

''لیکن میں نے تو جان لیا۔'' خاتون نے اُس کے چہرے پر پف پھیرتے ہوئے کہا۔

''تمہاری نظر ہر وقت چہروں پر رہتی ہے تم سے کچھ بھی چھپانا ناممکن ہے۔''

''مگر تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم اِس قدر اُداس کیوں ہو؟''

شکیلہ نے جواب نہیں دیا۔

خاتون بولی۔ ''پیار کرنے کے بعد ہی کوئی اِتنا اُداس ہوتا ہے۔''

شکیلہ مسکرائی مگر اُس کی مسکراہٹ میں بھی اُداسی تھی۔

''تمہیں سچی بات بتاتی ہوں مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ لوگ پیار کر کے اُداس کیوں ہو جاتے ہیں۔'' خاتون نے کہا۔

شکیلہ نے لمبی سانس لی اور کہا۔ ''پیار کی قیمت چکانی پڑتی ہے اور وہ قیمت سب کے پاس نہیں ہوتی۔''

''میرا تجربہ کچھ اور کہتا ہے۔'' خاتون میک اَپ کرتے کرتے رک گئی۔ ''پیار کوئی قیمت

نہیں مانگتا وہ بنا مانگے سب کچھ دیتا ہے۔ خوشی ہی خوشی سرور ہی سرور، نشہ ہی نشہ۔"

"بہت خوش قسمت ہو تم۔"

"جس نے محبت کی خوشی دیکھ لی ہو اگر اُس کی زندگی میں غم آ بھی جائے تو وہ اِتنا دکھی نہیں ہوتا۔"

"یہ خوشی سب کی تقدیر میں نہیں ہوتی۔"

"تم اناڑی ہو۔ پہلے وہ خوشی حاصل کرو پھر تمہارا غم تمہیں اِتنا غم نہیں دے گا۔"

شکیلہ ایک ٹک خاتون کی طرف دیکھنے لگی۔ خاتون اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "سُکھ لینے کے لئے پیار کو نچوڑنا پڑتا ہے۔ ہماری زندگی دکھوں سے بھری ایک گٹھری ہے۔ اُسے کھولنے کا جو طریقہ ہے اُسی کا نام پیار ہے۔ جو بے وقوف ہوتے ہیں وہ پیار کو بھی اُس گٹھری میں بند کر دیتے ہیں۔"

شکیلہ نے خاتون کو گھورتے ہوئے کہا۔ "تمہیں تو اپنا اُستاد بنانا چاہیئے۔"

خاتون ہنس پڑی۔ بولی "مجھے اُستاد بناؤ گی تو فائدے میں رہو گی۔ میں تم سے کوئی فیس وغیرہ نہیں لوں گی۔" یہ کہہ کر وہ پھر اُس کا میک اَپ کرنے لگی۔

اچانک شکیلہ نے شیشے میں سے دیکھا خاتون کے پیچھے دروازے کے پاس منصور کھڑا تھا۔ ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ منصور نے بھی شیشے میں دیکھ لیا کہ شکیلہ نے اُسے دیکھا ہے تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔

خاتون نے میک اَپ کے آخری ٹچ دیتے ہوئے کہا۔ "شکیلہ بی بی اگر غم ہی سہنا ہے تو پیار کرنے کا کیا فائدہ؟"

"اپنے ہاتھ میں تو نہیں پیار کرنا۔" کہتے کہتے شکیلہ کھڑی ہو گئی اور "میں ابھی آتی ہوں" کہہ کر باہر نکل گئی۔ باہر ایک نکڑ میں کھڑے ہو کر منصور اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ شکیلہ اُس کے قریب چلی گئی اور بولی۔ "منصور اگر ہم اِس طرح ملیں گے تو لوگ باتیں بنائیں گے۔"

شکیلہ اُس کی طرف دیکھتی رہی۔

منصور نے پوچھا۔ ''میرے گھر گئی تھیں؟''

''ہاں'' شکیلہ بولی۔ ''تمہاری بہن کو پتہ لگ چکا ہے کہ تم فلموں میں کام کرتے ہو۔''

''اُسے کیسے پتہ چلا''

''وہ فرنیچر والی دوکان پر گئی تھی۔''

''باپ رے''

''رفیعہ، بہت اچھی ہے مجھ سے بہت پیار سے پیش آئی۔''

''تمہارے بارے میں جان گئی؟''

''ہاں''

''چلو، اچھا ہوا۔''

''منصور۔'' شکیلہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں دھیمے دھیمے بولنا شروع کیا۔ ''میں چاہتی ہوں ہماری بات یہاں سے آگے نہیں بڑھے۔'' منصور کو دھکا سا لگا۔

''تمہیں کیا ہو گیا۔؟'' منصور نے پوچھا۔

شکیلہ نے مُنہ پھیر لیا۔ اُس کا جسم کانپ رہا تھا۔ وہ اندر جانے کے لئے مُڑی۔

منصور نے کہا۔ ''شکیلہ!''

شکیلہ رُک گئی۔ منصور بالکل اُس کے قریب جا کر بولا۔ ''میں ساری رات سو نہ سکا''

''میں بھی نہیں سوئی۔''

''میرا بھی یہی خیال تھا کہ تم جاگ رہی ہو گی۔ میں تو ایسوسی ایشن کے آفس میں ہی تھا۔ آدھی رات کو آفس بند کر کے باہر آ گیا۔ تھوڑی دور جا کر ایک آٹو رکشا ملا۔ اُس میں بیٹھ کر باندرہ گیا اور تمہارے گھر کا چکرّ لگا کر واپس آ گیا۔''

اُس کی بات سن کر شکیلہ حیران ہو کر بولی۔ ''منصور یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''

''بہت مزہ آ رہا ہے پاگلوں جیسی باتیں کر کے۔''

''پہلے تو تم کبھی ایسا نہیں کرتے تھے۔''

''پہلے میں دل ہی دل میں تمہیں چاہتا تھا۔ اشاروں اشاروں میں تمہیں جتاتا رہا۔ تم مذاق سمجھ کر ٹالتی رہتی تھیں لیکن شکیلہ اب مجھے تمہارے بغیر کچھ نہیں سوجھتا۔ اب میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتا۔''

''کاش میں تمہیں اپنے بارے میں بتا سکتی۔ میں بہت مجبور ہوں منصور۔''

''مجھے بتاؤ تمہاری کیا مجبوری ہے۔''

''نہیں بتا سکتی۔'' اب وہ منصور سے آنکھ بھی نہیں ملا رہی تھی۔

''تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔'' منصور منت کرتے ہوئے بولا۔ ''شوٹنگ کے بعد ایسوسی ایشن کے آفس میں آنا۔ میں انتظار کروں گا۔ چاہے تھوڑی دیر ہی بیٹھنا۔ میں خود تمہیں باندرہ چھوڑ آؤں گا۔''

''میں نہیں آؤں گی منصور''

''پلیز ضرور آنا۔ میں انتظار کروں گا۔'' یہ کہہ کر منصور باہری گیٹ کی طرف چل دیا۔ شکیلہ اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ رونا چاہتی تھی۔ مگر اُس جگہ کیسے روتی؟

اندر جا کر جب وہ ڈریس چینج کرنے لگی تو خاتون بولی۔ ساری شکیلہ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر منصور کے ساتھ تمہیں باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔ تم بڑی خوش قسمت ہو۔ ایسا لڑکا تمہیں چاہتا ہے؟ وہ ہزاروں میں ایک ہے۔ پھر بھی تم اِتنی غمگین ہو؟''

شکیلہ اُسے کیا بتاتی۔ چپ چاپ کپڑے بدلتی رہی۔

......☆......

منصور بے چین کمرے میں یہاں سے وہاں، وہاں سے یہاں چکر لگا رہا ہے۔ وقت گزرتا جا رہا ہے اور شکیلہ کے آنے کی اُمید کم ہوتی جا رہی ہے۔

وہ باہر کے کمرے میں آ گیا۔ جہاں جسونت سنگھ فائیٹر آرٹسٹوں کے ساتھ بات چیت کر رہا ہے۔ منصور اُن لوگوں کو نہیں جانتا۔ وہ کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ سڑک پر ٹریفک جام تھا۔ لیکن شکیلہ کہیں نہیں تھی۔ مایوس نظروں سے باہر دیکھتے دیکھتے وہ جسونت سنگھ اور

فائیٹر آرٹسٹوں کی باتیں سننے لگا۔

جسونت سنگھ کہہ رہا تھا۔ ''پروڈیوسر نے آپ کے پیسے دینے سے اِنکار کر دیا ہے۔ اَب یہی ہو سکتا ہے کہ ایسوسی ایشن آپ کا کیس فیڈریشن میں دے دے۔''

ایک فائیٹر بولا، ''وہاں تو مہینوں لگ جاتے ہیں فیصلہ ہونے میں۔''

جسونت سنگھ نے کہا۔ ''دیر تو لگ جاتی ہے لیکن اِس دوران پروڈیوسر پر دباؤ ڈالنے کے لئے کوئی فائیٹر اُس کی شوٹنگ نہیں کرے گا۔'' دوسرا فائیٹر بولا، ''آپ اُس کے پاس جا کر اُس کو یہ ساری بات سمجھاؤ۔'' جسونت نے کہا۔ ''میں کئی بار اُسے فون کر چکا ہوں۔ اُس نے پندرہ دن کی مہلت مانگی ہے۔''

''یہ بھی کر لیں گے۔'' کہہ کر دونوں چل پڑے۔ جسونت کھڑکی کے پاس کھڑے منصور کے پاس آ گیا۔

''کیوں دوست، کس کا انتظار ہو رہا ہے؟''

''شکیلہ کا۔''

''بہت خوب! میں تبھی سمجھ گیا تھا جب وہ تمہیں دیکھنے آئی تھی۔ معاملہ کچھ گمبھیر ہے؟''

''ہاں۔ مجھے خود ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ شکیلہ کے بنا لمحہ بوجھل ہو گیا ہے۔ ہر وقت اُسی کا خیال رہتا ہے۔''

''پھر تو تمہاری مدد کرنا ضروری ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم اگلے ہفتے شِملہ کیوں نہیں جا رہے؟''

''شِملہ؟ مجھے تو کسی نے نہیں کہا۔''

''شکیلہ جا رہی ہے۔''

''شکیلہ؟'' منصور چونک اُٹھا۔

''ہاں شکیلہ اور بہت سی لڑکے لڑکیاں۔''

''تمہیں کیسے پتہ؟''

''ساری بکنگ اِسی آفس کے ذریعے کی گئی ہے۔ دس دنوں کا آوٹ ڈور ہے، وہاں تمہیں

شکیلہ کے پاس رہنے کا چانس ملے گا۔"

"مگر ساری بکنگ تو ہو گئی۔ اَب چانس کا سوال کہاں؟ وہاں سٹنٹ ڈائریکٹر کون ہے؟"

"عظیم بھائی۔"

"پھر تو میری ضرورت نہیں ہو گی۔ اگر ہوتی تو عظیم بھائی ضرور بلاتے۔"

جسونت مسکراتے ہوئے بولا۔ "میری بات مان۔ عظیم بھائی کو اندر کی ساری بات سمجھادے۔ وہ ضرور کوئی جگت لڑائیں گے۔ وہ تو تیرے اُستاد ہیں۔"

منصور کے چہرے کی اُداسی کم ہونے لگی۔

......☆......

اسٹوڈیو سے نکل کر شکیلہ اُس بس میں سفر کر رہی ہے جو اُسے ایسوسی ایشن کے آفس کے پاس اُتارے گی۔ منصور ضرور اُس کا انتظار کر رہا ہو گا۔ لیکن وہ منصور کو بتائے گی نہیں کہ آج شوٹنگ میں کیا ہوا؟ آج اُس سے ایک ایسی غلطی ہو گئی جس کی شرمندگی اُسے ابھی تک ہے۔ وہ جب ہیروئین کے بدلے سیڑھیوں سے گرنے اور لڑھکنے کا شارٹ دے رہی تھی تو اپنے بچاؤ کے لئے سَر کو اُٹھا کر رکھنا بھول گئی۔ پھر بھی بچ گئی۔ ماسٹر شیٹی نے فوراً دیکھ لیا۔ لیکن شوٹنگ کے دوران اُسے کچھ نہیں کہا۔ جب شارٹ ہو گیا تو ایک جانب لے جا کر کہا۔ "شکیلہ آج تمہاری طبیعت کچھ خراب ہے؟"

شکیلہ گھبرا کر بولی۔ "کیا ہوا ماسٹر جی؟"

"جب تم سیڑھیوں پر سے لڑھک رہی تھی تو سَر کو اُٹھا کر رکھنا بھول گئی۔ میرا خیال ہے تمہیں کچھ لگی بھی ہے۔"

خفت محسوس کرتے ہوئے شکیلہ نے کہا۔ "ہاں لگی ہے تھوڑی سی۔"

ہاتھ بڑھا کر ماسٹر شیٹی نے اُس کے سر میں پڑا ہوا روڑا دیکھا۔ "خدا نے تمہیں بچالیا۔ کہیں اور تو نہیں لگی؟" شکیلہ نے شرمندگی سے سر جھکالیا۔ "تمہیں تو کام کرتے ہوئے کئی سال ہو گئے۔ تمہارا دھیان کہیں اور تھا کیا؟"

فائیٹر آرٹسٹوں کی باتیں سننے لگا۔

جسونت سنگھ کہہ رہا تھا۔ ''پروڈیوسر نے آپ کے پیسے دینے سے اِنکار کردیا ہے۔ اَب یہی ہوسکتا ہے کہ ایسوسی ایشن آپ کا کیس فیڈریشن میں دے دے۔''

ایک فائیٹر بولا، ''وہاں تو مہینوں لگ جاتے ہیں فیصلہ ہونے میں۔''

جسونت سنگھ نے کہا۔ ''دیر تو لگ جاتی ہے لیکن اِس دوران پروڈیوسر پر دباؤ ڈالنے کے لئے کوئی فائیٹر اُس کی شوٹنگ نہیں کرے گا۔'' دوسرا فائیٹر بولا، ''آپ اُس کے پاس جاکر اُس کو یہ ساری بات سمجھاؤ۔'' جسونت نے کہا۔ ''میں کئی بار اُسے فون کرچکا ہوں۔ اُس نے پندرہ دن کی مہلت مانگی ہے۔''

''یہ بھی کرلیں گے۔'' کہہ کر دونوں چل پڑے۔ جسونت کھڑکی کے پاس کھڑے منصور کے پاس آگیا۔

''کیوں دوست، کس کا انتظار ہورہا ہے؟''

''شکیلہ کا۔''

''بہت خوب! میں تبھی سمجھ گیا تھا جب وہ تمہیں دیکھنے آئی تھی۔ معاملہ کچھ گمبھیر ہے؟''

''ہاں۔ مجھے خود ایسا محسوس ہورہا ہے۔ شکیلہ کے بنا لمحہ لمحہ بوجھل ہوگیا ہے۔ ہر وقت اُسی کا خیال رہتا ہے۔''

''پھر تو تمہاری مدد کرنا ضروری ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم اگلے ہفتے شِملہ کیوں نہیں جارہے؟''

''شِملہ؟ مجھے تو کسی نے نہیں کہا۔''

''شکیلہ جارہی ہے۔''

''شکیلہ؟'' منصور چونک اُٹھا۔

''ہاں شکیلہ اور بہت سی لڑکیاں۔''

''تمہیں کیسے پتہ؟''

''ساری بکنگ اِسی آفس کے ذریعے کی گئی ہے۔ دس دنوں کا آوٹ ڈور ہے، وہاں تمہیں

شکیلہ کے پاس رہنے کا چانس ملے گا۔"

"مگر ساری بکنگ تو ہوگئی۔ اَب چانس کا سوال کہاں؟ وہاں سٹنٹ ڈائریکٹر کون ہے؟"

"عظیم بھائی۔"

"پھر تو میری ضرورت نہیں ہوگی۔ اگر ہوتی تو عظیم بھائی ضرور بلاتے۔"

جسونت مسکراتے ہوئے بولا۔"میری بات مان۔ عظیم بھائی کو اندر کی ساری بات سمجھادے۔ وہ ضرور کوئی جگت لڑائیں گے۔ وہ تو تیرے اُستاد ہیں۔"

منصور کے چہرے کی اُداسی کم ہونے لگی۔

......☆......

اسٹوڈیو سے نکل کر شکیلہ اُس بس میں سفر کررہی ہے جو اُسے ایسوسی ایشن کے آفس کے پاس اُتارے گی۔ منصور ضرور اُس کا انتظار کررہا ہوگا۔ لیکن وہ منصور کو بتائے گی نہیں کہ آج شوٹنگ میں کیا ہوا؟ آج اُس سے ایک ایسی غلطی ہوگئی جس کی شرمندگی اُسے ابھی تک ہے۔ وہ جب ہیروئین کے بدلے سیڑھیوں سے گرنے اور لڑھکنے کا شارٹ دے رہی تھی تو اپنے بچاؤ کے لئے سَر کو اُٹھا کر رکھنا بھول گئی۔ پھر بھی بچ گئی۔ ماسٹر شیٹی نے فوراً دیکھ لیا۔ لیکن شوٹنگ کے دوران اُسے کچھ نہیں کہا۔ جب شارٹ ہوگیا تو ایک جانب لے جا کر کہا۔"شکیلہ آج تمہاری طبیعت کچھ خراب ہے؟"

شکیلہ گھبرا کر بولی۔"کیا ہوا ماسٹر جی؟"

"جب تم سیڑھیوں پر سے لڑھک رہی تھی تو سَر کو اُٹھا کر رکھنا بھول گئی۔ میرا خیال ہے تمہیں کچھ لگی بھی ہے۔"

خفت محسوس کرتے ہوئے شکیلہ نے کہا۔"ہاں لگی ہے تھوڑی سی۔"

ہاتھ بڑھا کر ماسٹر شیٹی نے اُس کے سر میں پڑا ہوا روڑا دیکھا۔"خدا نے تمہیں بچالیا۔ کہیں اور تو نہیں لگی؟" شکیلہ نے شرمندگی سے سر جھکالیا۔"تمہیں تو کام کرتے ہوئے کئی سال ہوگئے۔ تمہارا دھیان کہیں اور تھا کیا؟"

فائیٹر آرٹسٹوں کی باتیں سننے لگا۔

جسونت سنگھ کہہ رہا تھا۔ ''پروڈیوسر نے آپ کے پیسے دینے سے اِنکار کر دیا ہے۔ اَب یہی ہوسکتا ہے کہ ایسوسی ایشن آپ کا کیس فیڈریشن میں دے دے۔''

ایک فائیٹر بولا، ''وہاں تو مہینوں لگ جاتے ہیں فیصلہ ہونے میں۔''

جسونت سنگھ نے کہا۔ ''دیر تو لگ جاتی ہے لیکن اِس دوران پروڈیوسر پر دباؤ ڈالنے کے لئے کوئی فائیٹر اُس کی شوٹنگ نہیں کرے گا۔'' دوسرا فائیٹر بولا، ''آپ اُس کے پاس جا کر اُس کو یہ ساری بات سمجھاؤ۔'' جسونت نے کہا۔ ''میں کئی بار اُسے فون کر چکا ہوں۔ اُس نے پندرہ دن کی مہلت مانگی ہے۔''

''یہ بھی کر لیں گے۔'' کہہ کر دونوں چل پڑے۔ جسونت کھڑکی کے پاس کھڑے منصور کے پاس آ گیا۔

''کیوں دوست، کس کا انتظار ہو رہا ہے؟''

''شکیلہ کا۔''

''بہت خوب! میں تبھی سمجھ گیا تھا جب وہ تمہیں دیکھنے آئی تھی۔ معاملہ کچھ گمبھیر ہے؟''

''ہاں۔ مجھے خود ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ شکیلہ کے بنا لمحہ لمحہ بوجھل ہو گیا ہے۔ ہر وقت اُسی کا خیال رہتا ہے۔''

''پھر تو تمہاری مدد کرنا ضروری ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم اگلے ہفتے شِملہ کیوں نہیں جا رہے ہو؟''

''شِملہ؟ مجھے تو کسی نے نہیں کہا۔''

''شکیلہ جا رہی ہے۔''

''شکیلہ؟'' منصور چونک اُٹھا۔

''ہاں شکیلہ اور بہت سی لڑکے لڑکیاں۔''

''تمہیں کیسے پتہ؟''

''ساری بکنگ اِسی آفس کے ذریعے کی گئی ہے۔ دس دنوں کا آؤٹ ڈور ہے، وہاں تمہیں

شکیلہ کے پاس رہنے کا چانس ملے گا۔"

"مگر ساری بکنگ تو ہوگئی۔ اَب چانس کا سوال کہاں؟ وہاں سٹنٹ ڈائریکٹر کون ہے؟"

"عظیم بھائی۔"

"پھر تو میری ضرورت نہیں ہوگی۔ اگر ہوتی تو عظیم بھائی ضرور بلاتے۔"

جسونت مسکراتے ہوئے بولا۔"میری بات مان۔ عظیم بھائی کو اندر کی ساری بات سمجھادے۔ وہ ضرور کوئی جگت لڑائیں گے۔ وہ تو تیرے اُستاد ہیں۔"

منصور کے چہرے کی اُداسی کم ہونے لگی۔

......☆......

اسٹوڈیو سے نکل کر شکیلہ اُس بس میں سفر کر رہی ہے جو اُسے ایسوسی ایشن کے آفس کے پاس اُتارے گی۔ منصور ضرور اُس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ لیکن وہ منصور کو بتائے گی نہیں کہ آج شوٹنگ میں کیا ہوا؟ آج اُس سے ایک ایسی غلطی ہوگئی جس کی شرمندگی اُسے ابھی تک ہے۔ وہ جب ہیروئین کے بدلے سیڑھیوں سے گرنے اور لڑھکنے کا شارٹ دے رہی تھی تو اپنے بچاؤ کے لئے سَر کو اُٹھا کر رکھنا بھول گئی۔ پھر بھی بچ گئی۔ ماسٹر شیٹی نے فوراً دیکھ لیا۔ لیکن شوٹنگ کے دوران اُسے کچھ نہیں کہا۔ جب شارٹ ہوگیا تو ایک جانب لے جا کر کہا۔"شکیلہ آج تمہاری طبیعت کچھ خراب ہے؟"

شکیلہ گھبرا کر بولی۔"کیا ہوا ماسٹر جی؟"

"جب تم سیڑھیوں پر سے لڑھک رہی تھی تو سَر کو اُٹھا کر رکھنا بھول گئی۔ میرا خیال ہے تمہیں کچھ لگی بھی ہے۔"

خفت محسوس کرتے ہوئے شکیلہ نے کہا۔"ہاں لگی ہے تھوڑی سی۔"

ہاتھ بڑھا کر ماسٹر شیٹی نے اُس کے سر میں پڑا ہوا روڑا دیکھا۔"خدا نے تمہیں بچالیا۔ کہیں اور تو نہیں لگی؟" شکیلہ نے شرمندگی سے سر جھکالیا۔"تمہیں تو کام کرتے ہوئے کئی سال ہوگئے۔ تمہارا دھیان کہیں اور تھا کیا؟"

''نہیں نہیں میرا دھیان اور کہیں نہیں تھا۔ چلئے آپ اگلا شارٹ لیجئے۔اب مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوگی۔''

بس میں بیٹھی ہوئی شکیلہ ابھی تک پشیمان تھی۔اگر کچھ ہو جاتا تو اُس نے بھی پٹی باندھی ہوئی ہوتی، منصور کی طرح۔

منصور کا خیال آیا تو اُس نے بس کے باہر جھانک کر دیکھا۔ابھی تین چار سٹاپ آگے ہے ایسوسی ایشن کا آفس۔اُسے منصور کا کہا یاد آیا کہ آدھی رات کو آٹو رکشا لے کر اُس نے اُس کے گھر کا چکر لگایا تھا۔کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ سچ مچ کیا منصور اُس سے اِتنی محبت کرتا ہے؟

ہاں کرتا ہے۔ضرور کرتا ہے۔کیا میں بھی اُس سے اِتنی ہی محبت کرتی ہوں؟ نہیں، میں اُس سے زیادہ شمّی سے محبت کرتی ہوں۔میں اُس کی زندگی کو برباد نہیں ہونے دوں گی۔اُس کی خاطر میں اپنے آپ کو قربان کر دوں گی۔پھر میں کیوں منصور سے ملنے جا رہی ہوں؟ کیا میں اُس کی پاگل محبت کے سامنے کھڑی ہو سکتی ہوں؟ اُسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا سکتی ہوں؟ بتا بھی دوں تو کیا حاصل ہوگا۔؟ کچھ نہیں، کچھ نہیں۔کیا لینے جا رہی ہوں اُس کے پاس؟ کوئی مطلب ہے جانے کا؟ نہیں، میں نہیں جاؤں گی۔

شکیلہ نے بس سے باہر جھانک کر دیکھا۔آنے والا اگلا سٹاپ ایسوسی ایشن کا آفس ہی تھا۔اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ وہاں نہیں اُترے گی۔پھر بھی دل تذبذب میں تھا۔وہ منصور کو چاہتی ہے مگر حالات اُس کی طرف جانے نہیں دے رہے۔وہ اُداس ہوگئی۔اُسے خیال آیا آخر وہ منصور کو اپنی مجبوری کیوں نہیں بتا دیتی۔ہو سکتا ہے وہ کوئی راستہ نکالے۔منصور تو اُس کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔اُس کے ساتھ وہ بے انتہا محبت کرتا ہے۔اُس کا من پھر ڈانواں ڈول ہوگیا۔

بس کی رفتار کم ہونے لگی۔بس سٹاپ آنے والا تھا۔وہ اُترنے کے لئے کھڑی ہوگئی مگر جب بس رُکی تو وہ پھر بیٹھ گئی۔اُس کی سوچوں نے پھر اُس کے دل پر قابو پا لیا۔اُس سٹاپ پر اُترنے والے اُتر گئے۔چڑھنے والے چڑھ گئے۔شکیلہ نے بس کنڈکٹر سے کہا۔''ایک باندرہ کا

ٹکٹ دینا۔"

رات کو حمیدہ بیگم نے پوچھا۔ "تم نے کیا فیصلہ کیا؟" شکیلہ نے جواب دیا۔ "میں سنیچر وار کو شملہ جارہی ہوں۔ واپس آکر پکا فیصلہ سنادوں گی۔"

......☆......

نماز پڑھ کر منصور کی امّاں نے دعا مانگی کہ اُس کے بیٹے کی لمبی عمر ہو اُس کا جلدی نکاح ہو اور میں جلدی اپنے پوتے کا مُنہ دیکھوں۔ دُعا پڑھ کر وہ اُٹھی اور مصلیٰ اُٹھانے لگی۔ اُسی وقت رفیعہ کمرے سے آئی اور کہنے لگی۔ "امّاں، بھائی جان نے رحمان کے ہاتھ پیغام بھیجا ہے کہ وہ آنے والے ہیں۔ امّاں کے چہرے پر رونق آگئی۔ آنکھیں چمکنے لگیں۔ بولی۔ "تو ابھی جا کر آدھا کلو جلیبیاں لے کر آ، میں دال والا گوشت بناتی ہوں۔ جا جلدی کر۔" امّاں بے چین ہوگئی تھی۔

منصور دو تین دن لگاتار عظیم بھائی کے پیچھے پڑا رہا کہ وہ اُسے اپنے ساتھ شملہ لے جائیں۔ تنگ آکر عظیم بھائی نے اپنے ایک اسٹنٹ کا جانا رد کیا اور اُس کی جگہ منصور کو ایڈجسٹ کیا۔ منصور اُن کا خاص آدمی تھا۔ اُس کے ساتھ اُنہیں ہمدردی تھی۔ منصور کو جب یقین ہوگیا کہ وہ شملہ جارہا ہے تو اُس نے گھر جانے کی بات سوچی۔ ڈاکٹر نے پٹی بھی کھول دی لیکن زخم کا نشان باقی تھا۔

رفیعہ ماں کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔ مشین کی سی تیزی سے اُس کے ہاتھ پاؤں چل رہے تھے۔ منصور کے پہنچنے سے پہلے وہ اُس کے لئے سب چیزیں بنا دینا چاہتی تھی۔ چنے کی دال والا گوشت، مسالے سے بھری ہوئی بھنڈی، پراٹھے سب کچھ۔ رفیعہ اُس کے پاس بیٹھ گئی۔

"پراٹھے میں بناؤں؟" رفیعہ نے پوچھا۔

"نہیں، میں بنالوں گی۔"

تھوڑی دیر چُپ رہ کر رفیعہ نے دھیمی آواز میں کہا۔ "امّاں، رحمان نے بھائی جان کے

بارے میں ایک اور بات بتائی ہے۔"

"کیا؟" پراٹھا تلتے ہوئے امّاں نے پوچھا۔

"وہ کہہ رہا تھا ایک فلم میں اُس نے بھائی جان کو پیٹھ پیچھے سے پہچان لیا ہے۔"

"پیٹھ پیچھے سے پہچان لیا ہے کیا مطلب؟"

"رحمان کہہ رہا تھا بھائی جان فلموں میں وہ کام کرتے ہیں جو ہیرو لوگ نہیں کر سکتے۔ بھائی جان کیمرے کی طرف پیٹھ کر کے اُس کا کام کرتے ہیں۔ جیسے گھوڑا دوڑانا، چھلانگ لگانا، موٹر چلانا۔"

"موٹر بھی چلاتا ہے؟" امّاں کو دھچکّا سا لگا۔ اُس نے تو منصور کو اسکوٹر چلانے سے بھی منع کر رکھا ہے؟" آنے دو اُسے پوچھتی ہوں۔"

دراصل رفیعہ چاہتی تھی یہ بات کُھل جائے۔ اچّھا ہوگا امّاں کو بھی معلوم ہو جائے۔ آخر اِس میں ہرج بھی کیا ہے۔ یہ تو بڑی بہادری کا کام ہے۔ فخر کرنے والی بات ہے۔ لوگوں کو پتہ چلے گا تو اُن کی نظروں میں بھائی جان کی عزت بڑھ جائے گی۔ ویسے رفیعہ جانتی تھی یہ بات سن کر امّاں چونک جائے گی۔ لیکن وہ اِتنی ناراض ہو جائے گی، اِس کا اُسے پتہ نہیں تھا۔

اُسی وقت باہر کی گھنٹی بجی۔ رفیعہ نے فوراً اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے منصور کھڑا تھا۔ رفیعہ نے خوش ہو کر آواز لگائی؟" امّاں بھائی جان آ گئے۔"

"رحمان نے میرا پیغام دے دیا تھا؟" منصور نے پوچھا۔

"ہاں۔" رفیعہ نے منصور کے کندھے پر سے بیگ اُتار کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ پھر سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "بھائی جان امّاں کو معلوم ہو گیا ہے کہ آپ فلموں میں کام کرتے ہیں۔ ناراض ہے آپ سے۔ ذرا سنبھل کر بات کرنا۔"

منصور ہوشیار ہو کر آگے بڑھا۔

امّاں کھڑی ہو گئی تھی۔

"سلام علیکم امّاں جی۔"

''وعلیکم، جیتا رہ، لمبی عمر ہو'' کہتے کہتے امّاں نے اُسے گلے سے لگالیا۔ پھر جب اُس کا ماتھا چومنے لگی تو زخم کے نشان پر نظر گئی۔ ''یہ کیا ہوا؟''

''کچھ خاص نہیں۔ دروازے سے ذرا سر ٹکرا گیا تھا۔''

''دروازے سے ٹکرا گیا تھا یا گھوڑے پر سے ِگر گیا تھا؟''

''یہ کیا کہہ رہی ہو امّاں؟''

''مجھے سب معلوم ہے'' کہہ کر وہ پھر کھانا بنانے میں لگ گئی۔ چہرے پر غصہ اور تناؤ تھا۔ آنکھوں میں نمی ہونے لگی تھیں۔

منصور نے رفیعہ کی طرف دیکھا۔ رفیعہ نے اُس کی طرف، پھر منصور ماں کے پاس مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ دھیرے سے بولا۔ ''امّاں تم نہیں چاہتی کہ ہم رفیعہ کی شادی بڑی دھوم دھام سے کریں؟ ایک ہی تو بہن ہے میری۔ میں اِسی لئے فلموں میں کام کرتا ہوں کہ تھوڑی رقم ہاتھ لگے۔ آج کل مہنگائی کتنی بڑھ گئی ہے۔ ہر چیز کا بھاؤ دوگنا ہو گیا ہے۔ میں نے تھوڑے پیسے جمع کر لئے ہیں۔ تُو بے شک رفیعہ کے لئے چیزیں خریدنا شروع کردے۔ اگر تجھے میرا یہ کام پسند نہیں تو میں وعدہ کرتا ہوں رفیعہ کی شادی کے بعد یہ کام نہیں کروں گا۔'' یہ کہہ کر منصور نے بہن کی طرف دیکھا۔ رفیعہ زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ امّاں نے ابھی بھی منہ پھلا کے رکھا تھا۔ اُس نے منصور کی طرف دیکھے بغیر جلیبیاں رکابی میں رکھیں اور رکابی منصور کے ہاتھ میں دے دی۔

......☆......

سگنل ڈاؤن ہوا۔ ہری جھنڈی ہلنے لگی۔ سیٹی بجی۔ بھیڑ میں شکیلہ بیگ اُٹھائے بھاگتی دوڑتی چلی آرہی تھی۔ اُس کے آگے آگے اٹیچی اُٹھائے قلی ٹرین کی طرف بھاگ رہا تھا۔ قلی نے لوگوں کو پیچھے ہٹا کر اٹیچی ٹرین کے اندر رکھی۔ پیچھے پیچھے شکیلہ بھی ڈبّے میں چڑھ گئی۔ اُسی وقت ٹرین حرکت میں آئی۔ شکیلہ نے جلدی جلدی پرس کھولا اور پچاس کا نوٹ نکال کر ٹرین کے ساتھ بھاگ رہے قلی کے ہاتھ میں تھمایا۔ نوٹ لے کر قلی کھڑا ہو گیا۔ گاڑی آگے نکل گئی۔

شکیلہ نے پرس بند کیا۔ کندھے سے لٹکتے ہوئے بیگ کو سنبھالا اور اٹیچی کی طرف دیکھا وہ

منصور کے ہاتھ میں تھی۔ شکیلہ حیران رہ گئی۔ منصور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم ایک منٹ اور لیٹ ہو جاتیں تو گاڑی چھوٹ جاتی۔''

شکیلہ بولی۔ ''میرے ساتھ ہمیشہ ایسے ہی ہوا ہے۔''

''کچھ گاڑیاں تم نے ضرور مِس کی ہوں گی۔''

''ایک بھی نہیں۔ کسی بھی صورت میں میں گاڑی پکڑ لیتی ہوں۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تمہاری کوئی گاڑی کبھی مِس نہ ہو۔'' شکیلہ غور سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

منصور مسکرا کر بولا۔ ''میرے پیچھے پیچھے چلی آؤ مجھے تمہاری سیٹ کا پتہ ہے۔''

منصور اٹیچی اُٹھائے آگے آگے اور شکیلہ بیگ کندھے پر لئے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ اُسے منصور کا اِس طرح اچانک ملنا اچھا لگا ہے لیکن دل میں انتشار ہے۔

فاسٹ ٹرین کا یہ سیکنڈ کلاس ائر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ تھا۔ شکیلہ کی برتھ اُوپر تھی۔ منصور نے وہاں اُس کی اٹیچی رکھ دی اور پھر اُس کے ہاتھ سے بیگ لے کر اٹیچی پر رکھ دیا۔ نیچے کی سیٹوں پر پانچ لڑکیاں لڑکے بیٹھے تھے۔ سب ساتھ جا رہے تھے اور ایک دوسرے کو پہچانتے تھے۔ منصور لڑکوں میں بیٹھ گیا شکیلہ لڑکیوں میں۔ اُن میں ایک خاتون بھی تھی۔

رات جب سب نے کھانا وغیرہ کھالیا تو لڑکے لڑکیاں آمنے سامنے بیٹھ کر اَنتاکشری کھیلنے لگے۔ شکیلہ کی اُس میں دلچسپی نہیں تھی۔ اُس نے سوچا کپڑے بدل لیتی ہوں۔ اٹیچی میں سے نائٹ سوٹ نکال کر باتھ روم کی طرف چل دی۔ کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر گلیارے میں آئی تو دیکھا منصور ایک طرف کھڑا تھا۔ منصور نے اُسے دیکھا۔ شکیلہ نے نظریں جھکالیں۔

''اُس روز تم آئی نہیں۔ میں تمہارا انتظار کرتا رہا۔'' منصور نے کہا۔ شکیلہ بولی۔ ''میں نے کب کہا تھا کہ میں آؤں گی۔؟''

''تم مجھ سے دور کیوں رہنا چاہتی ہو؟''

''کاش میں تمہیں اِس کا جواب دے سکتی۔''

''شکیلہ، میں تمہارے بارے میں کچھ جاننا ہی نہیں چاہتا۔''

شکیلہ کافی دیر تک خاموش رہی تو منصور نے کہا۔'' کچھ بولو تو سہی۔''

''منصور تم مجھے بھول جاؤ۔'' کہہ کر شکیلہ جلدی سے باتھ روم میں داخل ہو گئی۔

منصور کو محسوس ہوا کہ اُس کا دل بیٹھ رہا ہے۔ وہ بے چین ہو گیا۔ باتھ روم کے اندر جا کر شکیلہ رونے لگی۔ کپڑے بدلنے میں کافی دیر لگی گئی۔

منصور حیران تھا کہ وہ اِتنی دیر تک اندر کیا کر رہی ہے۔ اُس نے سوچا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیئے۔ لیکن کھٹکھٹایا نہیں۔ اُسے گھبراہٹ ہونے لگی اور کچھ نہیں سوجھا تو اُس نے باہر والا دروازہ کھول دیا۔ گاڑی کے چلنے کی آواز ایک دم اونچی ہو گئی باہر گھنا اندھیرا تھا۔ اُس نے باہر جھانکا تو محسوس ہوا اندھیرے کو چیر کر گاڑی گولی کی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔

آنسو پونچھ کر شکیلہ نے نائٹ ڈریس پہنا اور منہ دھو کر باتھ روم سے باہر نکل آئی۔ وہ چاہتی تھی منصور کی طرف دیکھے بغیر اندر چلی جائے لیکن منصور کو کُھلے ہوئے دروازے کے پاس کھڑے دیکھ کر وہ رُک گئی۔ باہر کا اندھیرا دیکھ کر اُسے ڈر لگا۔ گاڑی کی آواز بھی دل دہلانے والی تھی۔

''یہ دروازہ کیوں کھول دیا؟''

شکیلہ کی آواز سن کر منصور نے مُڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ پاجامے کُرتے میں وہ اور بھی حسین لگ رہی تھی۔ کاندھے پر بکھرے ہوئے بالوں میں چہرہ اور بھی نکھر گیا تھا۔ رونے سے آنکھیں شفاف ہو کر خوبصورتی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ منصور نے دروازہ بند کر دیا اور بولا۔'' تم نے کیا سمجھا میں باہر جا گروں گا؟''

شکیلہ بنا پلکیں جھپکائے منصور کو دیکھے جا رہی تھی۔ منصور بھی ایک ٹک اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ دھیرے سے بولا۔'' شکیلہ اگر تم میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کرو گی تو......'' شکیلہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں پائی۔ ایک ہاتھ میں وہ کپڑے لئے ہوئے تھی۔ دوسرا ہاتھ اُس نے یوں پیشانی پر رکھا جیسے اپنی مجبوری کو کوس رہی ہو۔ اُسے الفاظ نہیں مل رہے تھے کہ کچھ بولے۔ منصور چاہتا تھا وہ کچھ بولے۔ لیکن وہ بنا بولے ہی اندر جانے لگی۔ پھر اچانک رُک گئی۔ عجیب نظروں

سے منصور کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''جا کر سوتے کیوں نہیں؟ دروازے کی چٹخنی لگادو۔'' کہہ کر وہ اندر چلی گئی۔ منصور لمحوں کی ستم ظریفی پر مسکرانے لگا۔ وہ سمجھ گیا شکیلہ نہیں چاہتی کہ میں دروازہ کھول کر کھڑا رہوں کہیں میں ،گر ہی نہ جاؤں۔

......☆......

انا کشری کا دور ختم ہو چکا تھا۔ سبھی سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ شکیلہ نے اپنی اٹیچی نیچے والی سیٹ کے نیچے رکھ دی اور ریلوے اٹینڈنٹ جو بستر چھوڑ گیا تھا اُسے سیٹ پر بچھا دیا۔ منصور بھی چپ چاپ آ کر اپنا بستر بچھانے لگا۔

شکیلہ نے دیکھا کہ اُس کی سیٹ کے ساتھ جو لکڑی کی پارٹیشن ہے اُس کے دوسری طرف منصور کی سیٹ ہے۔ دونوں کی درمیان صرف ایک باریک سی لکڑی کی حد بندی ہے۔ دونوں نے اپنے اپنے بستر بچھائے اور لیٹ گئے۔ دونوں کو عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے کتنے قریب لیٹے ہوئے تھے اور دونوں کے بیچ کا فاصلہ بھی کتنا بے کنار تھا۔ شکیلہ نے کروٹ بدلی تو اچانک اُس کی کُہنی لکڑی کی دیوار سے جا ٹکرائی اور ہلکی سی ٹھک کی آواز پیدا ہوئی۔ آواز سن کر منصور چونکا۔ اُس نے سوچا ہو سکتا ہے شکیلہ نے جان بوجھ کر آواز پیدا کی ہو۔ وہ بے چین ہو گیا۔ اُس نے بھی ہلکے سے اپنی کُہنی لکڑی سے ٹکرائی۔ شکیلہ نے وہ آواز سنی تو اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُٹھتے اُٹھتے اُس کا ہاتھ پھر دیوار سے ٹکرا گیا۔ منصور بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ سوچنے لگا کیا سچ مچ شکیلہ نے اُس کے پیار کا جواب دیا ہے؟ اُس کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ خیال آیا کہ ہو سکتا ہے جواب دیا ہو۔ یہ سوچ کر اُس نے پھر ہلکے سے لکڑی پر ہاتھ مارا۔ شکیلہ گھبرا گئی۔ اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر چپ چاپ لیٹ کر چادر میں مُنہ چھپا لیا۔ منصور بہت دیر تک اپنی آواز کے جواب کا انتظار کرتا رہا لیکن لا حاصل۔ پھر وہ بھی چپ چاپ لیٹ گیا۔ دونوں طرف کا اندھیرا ہی اُن دونوں کے اضطراب کا گواہ تھا۔

......☆......

دوسرے روز شملہ پہنچتے پہنچتے دن ڈھلنے لگا۔ ہوٹل میں سیٹل ہو کر اور چائے کافی پی کر سب

یہاں وہاں مٹرگشتی کرنے لگے۔ منصور نے دیکھا شکیلہ اُس کے قریب نہ آنے کی کوشش کررہی ہے۔ وہ اکیلا ہی ہوٹل کے پائیں باغ میں ایک بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ ہوٹل ایک پہاڑی کے اوپر بنا ہوا تھا۔ منصور جہاں بیٹھا تھا وہاں سے دور دور تک کوہساروں کے سلسلے دکھائی دے رہے تھے۔ سب سے اونچے کوہسار کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ وہ پہلے بھی کئی بار یہاں آچکا تھا۔ اُس نے تو سوچا تھا شکیلہ کے ساتھ یہ خوبصورت نظارے اور بھی خوبصورت ہو جائیں گے۔ لیکن اِس وقت وہ اور بھی دل گرفتہ ہو گیا تھا۔

رات کو کھانا کھا کر جب سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں پہنچے تو شکیلہ کو یہ دیکھ کر اچھا لگا کہ اُس کے کمرے میں میک اَپ آرٹسٹ خاتون بیگم کو بھی ایڈجسٹ کیا گیا ہے۔ خاتون بھی خوش تھی۔ بولی۔ ''شکیلہ بانو یہ بتاؤ منصور میاں سے تمہارا عشق کہاں تک پہنچا۔؟'' شکیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا تو خاتون پھر بولی۔ ''مجھے تو منصور سارے راستے میں گُپ چُپ گُپ چُپ لگا۔ پہلے تو وہ ایسا نہیں تھا۔ میں پہلے بھی کئی بار اسی طرح اُس کے ساتھ آوٹ ڈور شوٹنگ پر آئی ہوں۔''

''اُس کے بارے میں، میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ اُسے ہی پتہ ہوگا کہ وہ اِتنا خاموش کیوں ہے۔''

شکیلہ کی آواز میں اُس کے دل کا درد چھپا ہوا تھا۔

''تو نے اپنی اُداسی اُسے بھی دے دی ہے۔ کاش تمہاری جگہ میں ہوتی۔ شکیلہ بانو کسی نیک بندے کو دکھ دینا کوئی اچھی بات نہیں۔''

شکیلہ بستر میں لیٹ گئی۔ لحاف لیتی ہوئی بولی۔ ''میں کیوں اُسے دکھ دوں گی؟ دکھی تو میں ہو گئی ہوں۔''

خاتون نے اپنا لحاف سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ ''تم شوٹنگ تو بے شک بہادر لڑکیوں والی کرتی ہو لیکن دنیا داری کے معاملوں میں لگتا ہے بہت نا تجربہ کار اور ڈرپوک ہو۔ عشق کا تو نام بدنام کر دیا تو نے۔''

"تب پھر تمہیں بتاؤ میں کیا کروں؟" لحاف کو ذرا اپنے اوپر سے ہٹاتے ہوئے وہ بولی۔
اِس وقت وہ باتیں کرنے کے موڑ میں تھی۔

"میں ذرا باتھ روم ہو کر آتی ہوں۔"

اُدھر جس کمرے میں منصور تھا اُس میں فائیٹ ماسٹر عظیم بھائی بھی تھے۔ اُنہوں نے منصور کو اِس شرط پر ساتھ لایا تھا کہ وہ ڈپلیکیٹ کے ساتھ اُن کے اِسسٹنٹ کے طور پر بھی کام کرے گا۔ کچھ دیر پہلے عظیم بھائی کو پروڈیوسر ڈائریکٹر کا پیغام ملا تھا کہ وہ دوسرے ہوٹل میں آکر اُن سے ملیں۔ اب تک تو اُن کو واپس آجانا چاہیئے تھا۔ منصور کمرے میں اکیلا بیٹھ کر اُن کا انتظار کر رہا تھا۔

دروازہ کھلا اور عظیم بھائی اندر داخل ہوئے۔

"بہت دیر کر دی اُستاد جی۔؟"

"کیا کیا جائے اِن لوگوں کا۔ سب پینے پلانے میں لگے رہتے ہیں۔ جب اُن کو احساس ہوا کہ میں تو پی ہی نہیں رہا تو اُنہوں نے میرے ساتھ شوٹنگ کی بات کرنا شروع کی۔"

"کیا فیصلہ ہوا؟"

"ہیرو اور ہیروئین کل شام کو پہنچ رہے ہیں۔ اِس لئے ہم سارا دن ڈپلیکیٹوں کی شوٹنگ کریں گے۔ تم اور شکیلہ تیار رہنا۔"

"سین تو سنا دیجئے۔"

"ہیرو اور ہیروئین کی کار کے پیچھے ویلن اپنی کار میں چلا آرہا ہے۔ وہ اُنہیں جان سے مار دینا چاہتا ہے۔ ایک مقام پر آکر راستہ بند ہو جاتا ہے۔ آگے گہری کھائی ہے۔ ایک طرف ایسی ڈھلان ہے جہاں سے لڑھکنا یا پھسلنا ممکن ہے۔ یہ دیکھ کر ہیرو ہیروئین کو اپنے بازوؤں میں لے کر لڑھکنا شروع کر دیتا ہے۔ کل تم دونوں کے لڑھکنے کے شارٹس لیں گے۔ شام تک جتنے شارٹس ملیں گے، لے لیں گے۔"

منصور کو لگا کہ اُس کے دل کی مُراد پوری ہو گئی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

عظیم بھائی سونے کی تیاری کرر ہے تھے۔رضائی میں دُبکتے ہوئے بولے۔ ''تمہارا خیال رکھ کر ہی میں نے یہ شارٹ سوچا ہے۔''

منصور کی ساری اُداسی دُور ہوگئی تھی۔ وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ چکا تھا۔اُس طرف شکیلہ انتظار کرر ہی تھی کہ خاتون باتھ روم سے باہر آئے تو وہ اُس سے کھل کر بات کرے۔اُسے محسوس ہورہا تھا کہ وہ باتھ روم میں بہت دیر لگا رہی ہے آخر جب خاتون باہر نکلی تو شکیلہ نے دیکھا خاتون نے بہت ہی خوبصورت نائٹ گاؤن پہنا ہوا تھا۔خاتون نے بتی بجھادی اور لحاف میں جاتے جاتے بولی۔ ''یہ گاؤن میرے میاں نے دوبئی سے لایا تھا میرے لئے۔ہماری شادی کو تین سال ہوگئے ہیں۔آؤٹ ڈور شوٹنگ میں مجھے مجبور ہو کر آنا پڑتا ہے لیکن وہ مجھ سے وعدہ لیتا ہے کہ میں یہ گاؤن پہن کر ہی سوؤں گی۔شکیلہ بانو تم سن رہی ہو نا؟''

''ہاں سن رہی ہوں'' شکیلہ بولی، ''خاتون تم بہت خوش نصیب ہو۔''

خاتون نے کہا۔ ''خدا نے تمہیں سب کچھ دیا ہے لیکن تم نے اُس کی قدر نہیں کی۔''

''کیا کروں۔میری قسمت............''

''قسمت کو دوش مت دو۔تم خود موقع ہاتھ سے کھو رہی ہو۔منصور تمہیں کتنا چاہتا ہے۔تم اُس کے پیار کا جواب پیار سے کیوں نہیں دیتیں؟''

''میں دینا چاہتی ہوں مگر............''

''یہ اگر مگر کا کیا مطلب ہے؟''

''میری مجبوریاں، میرے گھر کے حالات۔''

''کیا منصور کو ٹھکرا کر تمہارے گھر کے حالات بدل جائیں گے؟'' شکیلہ جواب نہیں دے سکی۔خاتون بولی۔ ''تمہارے گھر کے حالات جو دکھ تمہیں دیتے ہیں اُن کی شدت کم ہو جائے گی اگر تم منصور کی محبت قبول کرلو۔اُس کا پیار لے کر اور اُسے پیار دے کر تمہیں کئی راستے نظر آئیں گے۔تمہارے اندر اُن مجبوریوں سے لڑنے کی ہمت پیدا ہوگی جنہیں تم نے اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔کیا پتہ تمہارے گھر کے حالات بھی نیا موڑ لے لیں۔''

شکیلہ کو محسوس ہوا کہ جو اُسے چاہیئے تھا وہ اُسے مل رہا ہے۔ اُسے خاتون کی باتوں میں وہ سچائی نظر آرہی تھی جو پہلے نظر نہیں آتی تھی جس تک پہلے پہنچی نہیں تھی۔

خاتون کہہ رہی تھی۔ ''مان لو تمہارے گھر کے حالات ٹھیک نہیں ہوتے۔ تمہاری مجبوریاں ختم نہیں ہوتیں لیکن اُن کے ساتھ منصور کی محبت کا کیا تعلق ہے؟ یہ تو ویسی بات ہوئی جیسے ایک آدمی اپنی منزل کی طرف دوڑتا جارہا ہے۔ وہ تھک گیا ہے۔ نڈھال ہو چکا ہے اُسے بھوک لگی ہے پیاس لگی ہے سانس لینا مشکل ہو گیا ہے۔ اچانک راستے میں اُسے ٹھنڈے پانی کا چشمہ دکھائی دیتا ہے لیکن وہ پانی نہیں پیتا۔ وہ سوچتا ہے پہلے منزل پر پہنچ جاؤں پھر پانی پیوں گا۔ اُس کی سوچ غلط نہیں ہے کیا؟ وہ بے وقوف ہے۔ وہ کیوں نہیں سوچتا کہ اگر وہ پانی پی لے گا تو منزل پر پہنچنا آسان ہو جائے گا۔ تمہیں منصور کے پیار کی ضرورت ہے۔ اُسی پیار کی آگ تمہارے جسم میں خدا نے پیدا کی ہے۔ اگر تم اِس آگ سے چھٹکارا نہیں پاؤ گی تو وہ تمہیں ہی جلا کر خاک کردے گی۔''

شکیلہ کو ایک روشنی سی دکھائی دے رہی تھی۔

......☆......

ایک جیپ، ایک کار، ایک بس پورا قافلہ اُس لوکیشن پر پہنچ گیا جہاں شوٹنگ کی جانی تھی۔ جیپ میں بیٹھے ہوئے عظیم بھائی اور اُن کے اسٹنٹ باہر نکل آئے۔ عظیم بھائی اور منصور کار میں سے نکلتے ہوئے ڈائریکٹر اور کیمرہ مین کے پاس چلے گئے۔ بس میں سے سب لڑکیاں لڑکے میک اَپ مین، ڈریس مین اور سپاٹ بوائے نکلے۔ شکیلہ اور خاتون بھی اُنہی میں تھیں۔ شکیلہ کا میک اَپ ہوٹل کے کمرے میں ہی خاتون نے کردیا تھا۔ شکیلہ نے جو کپڑے پہنے تھے وہ بالکل ویسے تھے جیسے اگلے دن ہیروئین کو پہننے تھے۔

ڈائریکٹر، کیمرہ مین اور عظیم بھائی پہاڑی کے قریب جا کر کھڑے ہوگئے۔ عظیم بھائی نے اسٹنٹ گلاب کو کہا کہ وہ شکیلہ کو بلا کر لے آئے۔

منصور نے دُور سے شکیلہ کو آتے ہوئے دیکھا۔ آج اُس کے دل میں خوشی بھی تھی اور

جوش بھی تھا۔ شکیلہ جب نزدیک پہنچی تو اُس نے ہلکے سے مسکرا کر منصور کو "ہیلو" کہا۔ آج اُس کے چہرے پر بھی اُداسی نہیں تھی۔ شگفتگی سی تھی۔ دونوں کو محسوس ہوا کہ آج دونوں کی آنکھوں میں ایک نئی چمک ہے۔

عظیم بھائی اُن کے قریب آ کر بولے۔ "منصور تم اور شکیلہ پہاڑی کے اوپر، وہ جہاں ایک جھاڑی دکھائی دے رہی ہے، وہاں چلے جاؤ۔ تم دونوں نے وہاں سے ایک دوسرے کو اپنے بازوؤں میں لے کر رول کرتے ہوئے نیچے آنا ہے۔ شارٹ ذرا مشکل ہے۔ دھیان سے کرنا تم شکیلہ کو لے کر اوپر چلے جاؤ پہلے یہ دیکھ لینا کہ جہاں رول کرنا ہے وہاں کوئی روڑا، پتھر یا کوئی ایسی چیز تو نہیں جس سے چوٹ لگنے کا خطرہ ہو۔ دونوں اپنے اپنے سر کو بچا کر رکھنا۔ ہوشیار رہنا۔ چلو اب وہاں چلے جاؤ۔"

منصور اور شکیلہ پہاڑی پر چڑھنے لگے۔

عظیم بھائی ڈائریکٹر اور کیمرہ مین کے پاس جا کر اُنہیں بتانے لگے کہ دونوں کیمرے کہاں کہاں رکھے جائیں۔

منصور اور شکیلہ تیزی سے چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ شکیلہ نے اونچی ایڑی کی سینڈل پہنی تھی جسے اُس نے ہاتھوں میں لے لیا۔ جھاڑی کے پاس پہنچ کر دونوں کھڑے ہو گئے۔ شکیلہ نے دھیمی آواز میں منصور سے کہا۔ "تمہارے ماتھے کا زخم ابھی بھرا نہیں، تمہیں کیا ضرورت تھی اِس آؤٹ ڈور میں آنے کی؟"

"تمہارے لئے آیا ہوں" منصور بولا "عظیم بھائی کی کتنی منت خوشامد کرنی پڑی۔" شکیلہ چُپ ہو گئی۔ منصور پھر بولا۔ "تمہیں میرے زخموں کا خیال ہے لیکن میرا خیال بالکل نہیں۔ شکیلہ، میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ پیار کر کے اِتنا دکھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ تمہیں سچ مچ میرا خیال کبھی نہیں آتا؟ تم اِتنی سنگدل کیوں ہو؟"

شکیلہ ایک ٹک اُسے دیکھنے لگی۔ اُس نے دھیرے سے منصور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔ "تمہیں میرے بارے میں غلط فہمی ہے۔ خیر اِس وقت میں صرف ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔

یہ ایک مشکل شارٹ ہے۔اِس کی طرف دھیان دو۔باقی باتیں بعد میں بھی کی جاسکتی ہیں۔"

"بعد میں پتہ نہیں موقع ملے گا یا نہیں۔خدا کی قسم شکیلہ میں تمہیں............"

"قسمیں مت کھاؤ منصور۔شارٹ کی طرف دھیان دو۔"

عظیم بھائی کی آواز آئی۔وہ اونچی آواز میں کہہ رہے تھے۔"بس یہیں سے تم دونوں کو رول کرنا ہے۔پہلے تم اکیلے جا کر دیکھ آؤ کہ کوئی لگنے والی چیز تو وہاں نہیں۔"

شکیلہ وہیں کھڑی رہی اور منصور آدھا بیٹھ کر آدھا کھڑا رہ کر ڈھلان اُترنے لگا۔ایک دو جگہ پر چھوٹے کانٹے دار پودے تھے اُنہیں اُکھاڑ پھینک دیا۔نیچے جا کر اُس نے اشارے سے عظیم بھائی کو بتایا کے بس یہیں تک لُڑھک سکیں گے۔

عظیم بھائی، ڈائریکٹر اور کیمرہ مین تھوڑا اور اوپر چڑھ گئے۔نیچے والے کیمرہ مین نے بھی کیمرے کو تھوڑا اور پیچھے لے لیا۔

منصور چڑھائی چڑھتا ہوا شکیلہ کی طرف چل دیا۔

شکیلہ متواتر منصور کی طرف دیکھ رہی تھی۔ہیرو جیسے کپڑے اُس کے گٹھے ہوئے جسم پر زیب دے رہے تھے۔اُس کی چال میں ایک بانکپن تھا۔ایسی چڑھائی چڑھنا اُس کے لئے بہت ہی معمولی بات تھی۔اِس وقت شکیلہ منصور کو ستائش کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔

عظیم بھائی نے اونچی آواز میں پوچھا۔"سب ٹھیک ہے، منصور؟"

"ہاں، سب ٹھیک ہے۔"

عظیم بھائی نے کیمرہ مین سے پوچھا۔"شارٹ لیں؟" کیمرہ مین نے ڈائریکٹر کی طرف دیکھا۔ڈائریکٹر نے کہا رہرسل کی ضرورت نہیں سیدھا ٹیک کرو۔ٹھیک نہیں ہوا تو دوبارہ لے لیں گے۔"

عظیم بھائی نے زور لگا کر آواز دی "شارٹ لیں؟"

منصور نے انگوٹھا اوپر اُٹھا کر "ریڈی" کہا۔وہ زمین پر لیٹ گیا۔شکیلہ بھی اُس کے برابر لیٹ گئی۔دونوں کی سانسیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔

منصور نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''رات کو جب سب سو جائیں تو تم ہوٹل کے پائیں باغ میں آنا۔''

''میں نہیں آؤں گی۔''

''پلیز''

''نہیں''

ڈائریکٹر عظیم بھائی نے کہا۔ ''چلو شارٹ لیتے ہیں۔''

کلیر بوائے نے کلیپ دیا۔

عظیم بھائی چلایا۔ ''رول''

دونوں کیمرے چلنے لگے۔

عظیم بھائی نے پھر چلا کر کہا۔ ''ایکشن''

رول کرتے کرتے شکیلہ نے کہا۔ ''منصور سر کو تھوڑا اُٹھا کر رکھ۔''

''پہلے وعدہ کرو کہ رات کو آؤ گی۔'' منصور نے رول کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میں نہیں آؤں گی۔''

اُنہیں رول کرتے ہوئے یونٹ کے سب لوگ دیکھ رہے تھے۔

دونوں کیمرے چل رہے تھے۔

عظیم بھائی جانچتی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

منصور نے لڑھکتے ہوئے پھر کہا۔ ''پلیز شکیلہ ضرور آنا۔''

''میں نہیں آؤں گی۔''

کیمرہ مین کیمرے میں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''ویری گڈ''

ڈائریکٹر بُت بنا ہوا دیکھ رہا تھا۔

منصور اور شکیل رول کرتے ہوئے نیچے پہنچ گئے۔

یونٹ کے تمام لوگوں نے بے ساختہ تالیاں بجانی شروع کر دیں۔

عظیم بھائی نے چلا کر کہا۔ ''او۔کے''

ڈائریکٹر کے مُنہ سے نکلا۔ ''ایکسی لینٹ۔''

کیمرہ مین نے ڈائریکٹر کی طرف دیکھ کر اپنا انگوٹھا اُٹھالیا۔

منصور اور شکیلہ دونوں کھڑے ہوگئے۔

شکیلہ نے پوچھا۔ ''کہیں لگی تو نہیں؟''

منصور نے کہا۔ ''تو نے میرا سر تھام لیا تھا کیسے لگتی۔''

شکیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں رات کو آؤں گی۔''

منصور مبہوت سا اُسے دیکھتا رہ گیا۔

شام کو شوٹنگ سے واپس آکر جب سب لوگ ہوٹل پہنچے تو منصور کمرے میں جانے کی بجائے ہوٹل کے پائیں باغ میں چلا گیا۔ وہ معائینہ کرنے لگا کہ جب شکیلہ اُس سے ملنے آئے گی تو اُنہیں کہاں بیٹھ کر بات چیت کرنی چاہیئے۔ کوئی ایسی جگہ ہونی چاہیئے جہاں کسی کی نظر نہ پڑے۔ اُس نے دیکھا باغ کی آخری حد کے پاس ایک بہت بڑا دیودار کا درخت تھا۔ اُس کے پیچھے بیٹھنے کے لئے کافی ہموار جگہ تھی۔ دل ہی دل میں اُس نے وہ جگہ فِکس کر لی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی خاتون نے فون اُٹھایا اور رُوم سروس والوں کو دو چائے لانے کا آرڈر دیا۔ پھر شکیلہ سے بولی۔ ''چائے پی کر تھوڑا آرام کروں گی۔'' شکیلہ نے کہا۔ ''مجھے تو پہلے نہانا ہے۔ سارا دن مٹی میں لوٹ پوٹ ہو کر منہ میں بھی مٹی بھر گئی ہے۔''

''آج تو تمہاری موج مستی کا دن تھا۔ تم دونوں شوٹنگ نہیں کر رہے تھے، عشق کر رہے تھے۔ تم دونوں بھول گئے تھے کہ دنیا میں کوئی اور بھی ہے۔ سبھی کی نگاہیں تم پر تھیں۔ میں غور سے دیکھ رہی تھی تم نے ایک ہاتھ سے منصور کا سر تھام رکھا تھا۔''

''بہت تیز نظریں ہیں تمہاری۔ اصل میں اُسے یہ شارٹ دینا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ صرف میرے لئے اُس نے یہ جوکھم اُٹھایا۔ اُس کے ماتھے کا زخم ابھی پوری طرح بھرا نہیں۔ اگر اُسے کچھ ہو جاتا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرتی۔''

''اِس سے ثابت ہوا کہ تم دونوں ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہو۔ منصور کتنا خوش ہوا ہوگا۔ لیکن تم کو اتنا بے لاگ لگاؤ کیوں سمجھ میں نہیں آتا۔ میری بات مانو۔ منصور جیسا لڑکا تمہیں پھر نہیں ملے گا۔ اِتنا حسین، اِتنا شریف، اِس قدر محبت کرنے والا۔ سارا دن اُس کے اِتنا قریب رہ کر بھی تم پگھلی نہیں؟''۔

''میں پگھل گئی ہوں خاتون، بے بس ہوگئی ہوں۔'' شکیلہ نے سنجیدگی سے کہا۔'' مجھے تمہاری باتوں نے جھنجھوڑ دیا ہے۔ میں اپنے دل کی آواز سننے لگی ہوں۔ میری سمجھ میں آگیا ہے کہ منصور کی محبت کو ٹھکرا کر میں اپنے آپ سے ناانصافی کر رہی ہوں۔ بعد میں شاید مجھے پچھتانے کا بھی موقع نہ ملے۔ اِسی لئے میں آج رات کو منصور کے پاس جارہی ہوں۔''

''یہ ہوئی نا بات'' خاتون خوشی سے اُچھل پڑی۔ اُس نے شکیلہ کو گلے سے لگالیا اور اُس کے گال پر گہرا بوسہ دیتے ہوئے بولی۔''تو نہا کر آ۔ آج میں تیرا اسپشل کروں گی۔''

کھانا کھا کر منصور اور عظیم بھائی کمرے میں داخل ہوئے تو منصور نے کہا۔'' اُستاد جی آپ سوئیے میں شکیلہ سے ملنے جارہا ہوں۔''

''بیسٹ آف لک'' عظیم بھائی نے مسکرا کر کہا۔'' میں دروازہ اندر سے کھلا رکھوں گا۔ تم باہر سے بند کر کے جاؤ۔''

منصور چلا گیا تو عظیم بھائی نے مصلّے نکال کر بچھایا۔ اور عشاء کی نماز پڑھنے لگے۔

......☆......

رات ٹھنڈی تھی۔ اوس پڑ رہی تھی۔ بہت کم روشنی تھی باغ میں۔ دیودار کے درخت کے پیچھے کھڑا منصور بار بار منہ باہر نکال کر ہوٹل کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دل میں خدشہ تھا کہ اگر شکیلہ نہیں آئی تو؟

ہوا اور بھی سرد تر ہوتی جارہی تھی۔ شملہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اونچے اونچے پہاڑ بھی نظر نہیں آرہے تھے لیکن اُن کے اوپر کہیں کہیں بکھرے ہوئے گھروں کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ لگتا تھا اندھیرے میں معلّق مدھم مدھم تارے ٹمٹما رہے ہیں۔ سب کچھ نیند میں ڈوبا ہوا

تھا۔ ہوٹل بھی، دروازے کے پاس جلتا ہوا بلب بھی، باغ کے پھول پودے بھی۔ لیکن منصور کے دل کی دھڑکن جولانیوں پر تھی۔

اچانک دھیرے سے دروازہ کھلا۔ منصور نے دیکھا شال لپیٹے ہوئے شکیلہ باہر آرہی ہے۔ اُس کے دل کی دھڑکن اور بھی تیز ہوگئی۔ باغ کے اندر آکر شکیلہ کی نظریں اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں لیکن اُسے منصور دکھائی نہیں دیا۔ تھوڑا اور آگے بڑھ کر وہ پھولوں کی کیاری کے پاس کھڑی ہوگئی۔ منصور کی آواز سنائی دی "شکیلہ" وہ چونک گئی۔ دبی دبی آواز پھر سنائی دی "شکیلہ" وہ آگے بڑھ گئی۔ اُس نے دیودار کے تنے کے پیچھے سے منصور کا چہرہ باہر نکلا ہوا دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "یہاں آجاؤ۔" وہ تنے کے قریب پہنچی اور منصور کے پاس بیٹھ گئی۔

رات اوس کی بوندوں میں ڈھل کر رس رہی تھی۔ کُہرا گھنا ہو رہا تھا۔ گہرا سکوت تھا چاروں طرف۔ ہوا نے بھی سانس روکی ہوئی تھی۔

سارا شملہ، ساری کائنات سوئی ہوئی تھی۔

......☆......

شکیلہ شملہ سے واپس آئی تو وہ، وہ نہیں رہ گئی تھی، بدل گئی تھی۔ شملہ کی راتوں نے دبے ہوئے گہرے راز افشا کردیئے تھے۔ اُس کی چال ڈھال، بالوں کا سٹائل، کپڑے پہننے کا سلیقہ ہی نہیں بدلا تھا اس کی سوچوں میں بھی فرق آگیا تھا۔ منصور کی محبت نے اُس کے اندرون میں خود اعتمادی پیدا کردی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ اُس کے پاس ایک ایسی متاع ہے جس کی قیمت کوئی نہیں آنک سکتا۔ اُس نے محسوس کیا کہ پیار دینے سے کم نہیں ہوتا، بڑھتا ہے۔

گھر پہنچے سے پہلے وہ کوئی فیصلہ نہیں کرسکی کہ امّاں اور ابّا کی باتوں کا کیا جواب دے گی۔ لیکن اُس کا یہ فیصلہ پکا تھا کہ وہ منصور کے بِنا نہیں رہے گی۔ آج دوسرا دن تھا۔ واپس آئے ہوئے لیکن امّاں یا ابّا نے اُس بارے میں کوئی بات نہیں چھیڑی تھی۔ عام سی باتیں ہی کیں۔ کیسی شوٹنگ ہوئی۔ کون کون ہیرو ہیروئین تھے، کوئی حادثہ تو نہیں ہوا، طبیعت کیسی رہی وغیرہ وغیرہ۔ ویسے اُن سے شکیلہ کا بدلا ہوا روپ پوشیدہ نہیں تھا۔ جہاندیدہ لوگ تھے۔

اپنی لڑکی کا اُٹھنا بیٹھنا پہچانتے تھے۔اُس کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر چوکنے ہو گئے تھے۔ سوچنے لگے تھے کہ اِتنا بدلاؤ کسی لڑکی کی زندگی میں تبھی آتا ہے جب بند دروازے کھل جائیں۔ اُس کے ہاتھ میں کوئی نیا آسمان آجائے۔اُس کی آنکھوں میں سوئے ہوئے خواب جاگ اُٹھیں۔اُنہوں نے آپس میں کھسر پُھسر کی اور شکیلہ کو اپنے کمرے میں بلایا۔شکیلہ نے آوٹ ڈور کی کمائی کے سارے پیسے ماں کی ہتھیلی پر رکھ دیئے اور خاموشی سے سامنے بیٹھ گئی۔

حمیدہ بیگم نے نوٹوں کی گڈی سرہانے کے نیچے رکھی اور پوچھا۔"شکیلہ بیٹی آخر تو نے کیا سوچا؟"

"کس بارے میں؟"

"تو نے کہا تھا آوٹ ڈور سے لوٹ کر تم اپنا فیصلہ سناؤ گی۔"

شکیلہ نے گردن اُٹھائی اور بولی۔"امّاں جیسا آپ چاہتے ہیں، میں کسی سیٹھ کے پاس نہیں جاؤں گی۔"

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" افضل خاں نے پوچھا۔اُس کی آواز میں غصّہ تھا۔شکیلہ چپ رہی تو حمیدہ بیگم نے پھر پوچھا۔"اُس روز تمہیں اِتنا سمجھایا تھا۔لیکن شاید بات تمہارے دماغ میں نہیں گئی۔ساری زندگی کا دارومدار اِس پر ہی ہے۔تم اِتنی چھوٹی بھی نہیں کہ تم سے زور زبردستی کی جائے۔آگے پیچھے اور اونچ نیچ کا خیال کر۔میں کچھ دن تمہیں اور دیتی ہوں۔اچھی طرح سوچ لے۔"

شکیلہ نے چین کی سانس لی۔کچھ دنوں کی مہلت مل گئی۔وہ اِن دنوں کو فضول جانے دینا نہیں چاہتی تھی۔وہ تیار ہو کر منصور سے ملنے چل پڑی۔اُسے پتہ تھا منصور کہاں شوٹنگ کر رہا ہے۔وہ موبائل فون ساتھ لے گئی جو منصور نے اُسے شملہ میں پریزنٹ کیا تھا۔اُس میں سم کارڈ بھی ڈلوانا تھا تا کہ جب بھی دل چاہے وہ آپس میں بات کر سکیں۔

وہ اسٹوڈیو پہنچی۔منصور شوٹنگ کرتے ہوئے ایک خطرناک شارٹ دے رہا تھا۔اُس کو دُور سے بھاگ کر آنا تھا اور ایک بڑے شیشے کو سر مار کر توڑنا تھا اور پار جا گرنا تھا۔اُس شارٹ کو

دیکھنے کیلئے بہت سے لوگ جمع تھے۔شکیلہ آگے نہیں ہوئی۔منصور کی یکسوئی میں خلل پڑ جائے اور کوئی غلطی کر بیٹھے۔وہ باہر آکر ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔اُس کا دھیان شوٹنگ کی طرف تھا،تھوڑی دیر بعد اندر سے شیشہ ٹوٹنے کی آواز سُن کر وہ چونکی تالیوں کی آواز آئی تو بھی وہ سہمی رہی۔پھر جب تالیوں کا سلسلہ جاری رہا تو اُس کی تسلّی ہوئی۔کوئی حادثہ ہوتا تو تالیاں بند ہو جاتیں اور اندر باہر بھاگ دوڑ شروع ہو جاتی۔وہ وہاں کھڑی رہی۔لوگ باہر آنے لگے۔منصور بھی باہر آیا تو اُس نے شکیلہ کو دیکھا۔وہ جلدی سے اُس کے پاس آگیا۔اُس کے چہرے پر ایک فاتح کا غرور جھلک رہا تھا۔''تم نے شارٹ دیکھا؟''

''نہیں''

''کیوں؟''

''میں نہیں چاہتی کہ تم یہ خطرناک کھیل کھیلو۔''

''شکیلہ یہ میرا پروفیشن ہے۔''

''میں چاہتی ہوں اب آگے تم ایسے شارٹ مت دو۔''

''یہ تم کہہ رہی ہو؟''

''ہاں۔''

''پہلے تو تم بھی تالیاں بجاتی تھیں۔''

''پہلے کی بات اور تھی۔''

''تمہیں پتہ ہے یہ شارٹ دے کر مجھے پچیس ہزار روپے ملے ہیں۔دس ہزار ہیرو نے اور بھی اپنی جیب سے دیئے ہیں۔''

''دیئے ہوں گے لیکن آگے سے......''

''چلو اِس بات کو یہیں ختم کرو۔تم آج بہت حسین لگ رہی ہو۔''

منصور کی بات سُن کر اُس کے چہرے کا تناؤ کم ہونے لگا۔وہ مسکرانے لگی۔منصور نے اُس سے موبائل لے کر سم کارڈ ڈالا۔یہ سم کارڈ اُس نے اپنے نام پر لیا تھا تا کہ شکیلہ کے ساتھ

جب چاہے بات ہو سکے۔ پھر اُس نے شکیلہ سے کہا۔ ''تم یہیں کھڑی رہو میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔''

......☆......

ہوٹل کے اُس ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں شملہ کی راتیں جاگ پڑیں۔

وہی سردی، وہی اندھیرا۔

خاموشی

وقت بھی رُک گیا تھا۔

اچانک منصور کے فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ خاموشی کا شیشہ یوں ٹوٹا جیسے کسی نے ٹھہرے ہوئے پانی میں بڑا سا پتھر پھینک دیا ہو۔ اندھیرے میں رنگ ٹون تو سنائی دے رہی تھی۔ لیکن موبائل کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ منصور اندھیرے میں ٹٹولنے لگا۔''

......☆......

ہوٹل سے نکل کر وہ ٹیکسی میں بیٹھے تو ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دونوں کو لگ رہا تھا کہ وہ اُڑ رہے ہیں۔ دونوں کو زندگی انتہائی خوبصورت محسوس ہو رہی تھی۔ شکیلہ نے منصور کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ منصور نے پوچھا۔ ''کل کہاں ملوگی؟''

''تمہیں بتاؤ''

''اِسی ہوٹل میں۔''

''نہیں یہ ہوٹل بہت مہنگا ہے۔''

''ہماری محبت سے تو مہنگا نہیں۔''

''پھر بھی روز روز یہاں ملنا بھاری پڑے گا۔''

''پھر؟''

''کل تمہاری شوٹنگ ہے؟''

''نہیں''

''میری بھی نہیں۔ہم کل صبح ملیں گے۔دن بھر اکٹھے رہیں گے۔''

''یہ ٹھیک ہے۔کل صبح کہاں آؤ گی تم؟''

''باندرہ بینڈ سٹینڈ۔''

''کتنے بجے؟''

''11 بجے''

''او۔کے''

''شکیلہ کا گھر قریب آرہا تھا۔اُسے امّاں اور ابّا کی باتیں یاد آنے لگیں۔اب تک دل جس وجد و سرور میں ڈوبا ہوا تھا اُس کے بجھنے کے آثار دکھائی دینے لگے۔اُس نے اُداس ہو کر منصور کی طرف دیکھا۔منصور یہ دیکھ کر رنجیدہ تھا کہ شکیلہ اُسے چھوڑ کر جانے والی تھی۔

''بس یہیں موڑ پر روک دینا۔''شکیلہ نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

ٹیکسی رُکی۔دونوں باہر نکلے۔دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ کو ہلکے سے دبایا۔شکیلہ بلڈنگ کے اندر داخل ہو گئی۔

منصور ٹیکسی میں بیٹھا۔ٹیکسی چل دی۔

......☆......

شکیلہ نے گھنٹی بجائی۔امّاں نے دروازہ کھولا۔پیچھے ابّا بھی تھا۔شکیلہ نے کسی سے آنکھ نہیں ملائی۔وہ جس خمار میں تھی اُس سے باہر نہیں آنا چاہتی تھی۔وہ اندر اپنے کمرے میں جانے لگی امّاں نے ترش لہجے میں پوچھا۔''کہاں تھی اب تک؟''

شکیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''ٹیکسی میں تمہارے ساتھ کون تھا؟''

شکیلہ پھر بھی کچھ نہیں بولی۔

افضل خاں نے اپنی بھاری آواز میں کہا۔''اِس وقت رہنے دو حمیدہ۔صبح بات کریں گے۔

شکیلہ کو تسلّی ہوئی کہ بات کل تک ٹل گئی۔وہ اندر چلی گئی۔

کمرے میں اندھیرا تھا کھڑکی سے سڑیٹ لائٹ کی ہلکی سی پرچھائیں اندر آرہی تھی۔ اُس نے پرس ایک طرف رکھا۔ سینڈل کھولی اور سوچنے لگی کپڑے بدلے یا نہیں۔ پلنگ پر لیٹی ہوئی شمّی نے دھیرے سے پکارا۔ ''آپا۔''

''تم ابھی جاگ رہی ہو؟''

''ہاں آپا۔ میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔''

''کیوں؟'' شکیلہ اُس کے ساتھ لیٹ گئی۔ اُس نے سوچا کہ وہ کپڑے نہیں بدلے گی۔

''کتنے دن تو آپا تم شملے میں رہیں اور جب سے آئی ہو میں تم سے کوئی بات بھی نہیں کر سکی۔''

شمّی نے اُس کے قریب سرکتے ہوئے کہا۔ ''آپا تمہارے کپڑوں سے خوشبو آرہی ہے۔''

''یہ پیار کی خوشبو ہے۔'' شکیلہ نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''آپا تم کسی سے پیار کرنے لگی ہو؟''

''ہاں''

''کس سے؟''

''منصور سے، سٹنٹ مین منصور علی۔ وہ بھی مجھے بہت چاہتا ہے۔''

''بہت خوش قسمت ہے منصور علی۔ جسے میری آپا محبت کرتی ہے۔''

کہتے کہتے شمّی اور بھی شکیلہ کے قریب سرک گئی۔

''نہیں شمی خوش نصیب تو میں ہوں۔ اتنے اچھے گھر کا لڑکا مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے۔ مرتا ہے مجھ پر۔ مجھے اُس کی محبت پر پورا یقین ہے۔''

''آپا، میری کلاس میں بھی ایک لڑکا ہر وقت میری طرف دیکھتا رہتا ہے۔''

''کچھ کہتا ہے تمہیں؟''

''دیکھ شمّی تو ابھی اِن جھمیلوں میں نہ پڑ۔ پڑھائی کر بس پڑھائی کر۔ اگر پڑھائی نہیں کرے گی تو عمر بھر اِس گھر کے کیچڑ میں دھنسی رہے گی۔ یہ ایسا کیچڑ ہے جو ایک بار اِس میں پھنس

گیا پھر وہ کبھی باہر نہیں آتا۔"

"میں جانتی ہوں آپا۔"

اُسی وقت موبائل کی گھنٹی بجی۔ شمّی فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ "آپا، تمہارے پرس میں موبائل ہے؟"

"ہاں" شکیلہ نے پرس کھول کر موبائل نکالا۔

اُدھر منصور بول رہا تھا۔ "تم ابھی سوئی نہیں؟"

"سونے لگی تھی، تمہارا فون آ گیا۔"

"میں نے سوچا تمہیں بتا دوں کہ میں ٹھیک ٹھاک گھر پہنچ گیا ہوں۔"

"اچھا کیا بتا دیا؟"

"تمہیں ایک بات کا پتہ ہے۔؟"

"کیا؟"

"آئی لو یُو "

شکیلہ ہنس کر بولی، "آئی لو یو ٹو" کل ٹھیک ٹائم پر آنا......تم بھی

"سو جاؤ اب۔ گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ۔" فون بند کر کے شکیلہ پھر لیٹ گئی۔

"یہ فون منصور نے مجھے شملہ میں پریزنٹ کیا تھا۔"

"میں جان گئی آپا، وہ تم سے بہت پیار کرتا ہے۔"

"ہاں کرتا ہے۔ لیکن جب اُسے معلوم ہوگا کہ میں.........."

دونوں چُپ ہو گئیں۔

تھوڑی دیر بعد شمی دھیرے سے بولی۔ "آپا، تم کل منصور سے کیسے ملوگی؟"

"کیوں؟"

"لنڈن والا سیٹھ آ گیا ہے۔"

شکیلہ کا دل ڈوبنے لگا۔ ''تمہیں کیسے پتہ؟'' اُس نے پوچھا۔

''امّاں اور ابّا کھسر پھسر کر رہے تھے۔ تھوڑی بھنک میرے کانوں میں بھی پڑی۔'' اِتنا کہہ کر شمّی کو پشیمانی ہوئی۔ اُسے محسوس ہوا کہ اِس وقت یہ بات نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ رات بھر آپا سو نہیں پائے گی۔ اُس نے شکیلہ سے پوچھا۔ ''آپا یہ سیٹھ ہے کون؟''

''مجھے کیا معلوم؟ میں نے تو اُسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔''

''تمہارے ہی پیچھے کیوں پڑا ہے؟''

''امّاں کہتی ہے ایک بار ابّا اُسے میری شوٹنگ دکھانے لے آیا۔ اُس وقت میں کوئی بہادری والا سٹنٹ کر رہی تھی۔ اُس نے دیکھا تو مجھے پسند کرلیا۔ میں نے تو اُسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔''

''آپا اگر تمہیں کل سیٹھ کے پاس جانا پڑا تو تم منصور کو کیا کہو گی۔''

''میں نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا ہے جو وہ چاہے گا وہی ہوگا۔'' یہ کہہ کر شکیلہ نے آہ بھری اور پھر بولی۔ ایک بات تو پکّی ہے شمّی میں منصور سے کبھی جھوٹ نہیں بولوں گی۔''

''تمہارا سیٹھ کے پاس جانا اُسے برداشت ہوگا؟''

''کیا پتہ میرے نصیب میں کیا ہے۔'' کہہ کر شکیلہ رونے لگی۔ شمّی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے شکیلہ کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اُس کے آنسو پونچھنے لگی۔ مت رو آپا۔''

''روؤں نہیں تو کیا کروں؟ اگر منصور مجھ سے ملنا بند کردے گا تو میں جان دے دوں گی۔''

شکیلہ روتی رہی۔ شمّی اُس کے آنسو پونچھتی رہی۔

اندھیرا گہرا ہوتا جارہا تھا اور دونوں اندھیرے کی دلدل میں ڈوبتی جارہی تھیں۔ دونوں کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ شمّی نے دھیمے سے کہا۔ ''آپا، تمہیں منصور جیسا محبت کرنے والا دوبارہ نہیں ملے گا۔ تم اُس سے نکاح کرلو۔ میں سیٹھ کے پاس چلی جاؤں گی۔''

''کیا کہا تُو نے؟'' شکیلہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''میں تجھے پڑھا رہی ہوں اور تو اُس گجراتی سیٹھ کے پاس میری جگہ جانے کی سوچ رہی ہے؟ شمّی میں مرجاؤں گی مگر تیری زندگی

خراب نہیں ہونے دوں گی۔ آگے سے ایسی بات منہ سے نہیں نکالنا، سوچنا بھی نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ شمی اُس کے سینے سے لگ گئی۔

......☆......

صبح شمی کی آنکھ پہلے کھلی۔ سوئی ہوئی آپا کی طرف دیکھ کر اسے رات کی باتیں یاد آ گئیں۔ وہ سوچنے لگی اُس کی آپا اُس سے کتنا پیار کرتی ہے۔ بہت دیر تک وہ اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ اُس کا جی سکول جانے کو نہیں کر رہا تھا لیکن یہ سوچ کر اُٹھ گئی کہ آپا ناراض ہو گی۔

جب شکیلہ جاگی تو شمی سکول جا چکی تھی۔ اُسے ایک کام یاد آیا کہ ۱۱ بجے بینڈ سٹینڈ پہنچنا ہے۔ ۹ بج چکے تھے۔ وہ اُٹھنے لگی تو شمی کی بات یاد آ گئی۔ آج امّاں اور ابّا اُسے سیٹھ کے پاس جانے کے لئے کہیں گے۔ وہ کیا کہے گی۔ اُدھر منصور انتظار کرے گا۔ وہ اُس کے پاس ضرور جائے گی۔ لیکن اُس سے کیا کہے گی؟ کیا میں اُسے سب کچھ بتا دوں؟ نہیں۔ ابھی اُسے بتانا ٹھیک نہیں۔ بتاؤں بھی کیوں؟ خدا جب تک خوشیوں کے یہ لمحے دیتا ہے ان سے محروم کیوں رہوں۔ کیا یہ منصور سے دھوکا ہے؟ نہیں، یہ دھوکا نہیں۔ میں جتنا اُس سے لے رہی ہوں۔ اُتنا دے بھی رہی ہوں۔ جتنا پیار وہ مجھے کرتا ہے، میں بھی کرتی ہوں۔ حقیقت پر سے پردہ اُٹھا کر میں اُسے دکھ ہی دوں گی۔ میں اُسے یہ غم نہیں دینا چاہتی۔ بے شک اُسے ایک دن یہ غم اُٹھانا ہی ہوگا۔ لیکن جب تک اُسے پتہ نہیں لگتا، میں اُسے اِتنا پیار دوں گی کہ باقی کچھ بچے گا ہی نہیں۔ کوئی حسرت، کوئی خواہش باقی نہیں رہے گی۔ دل میں کچھ زیادہ ہی اُمنگیں لے کر وہ تیار ہونے لگی۔ بہترین میک اَپ کر کے اُس نے اپنے بہترین کپڑے پہنے۔ امّاں نے پوچھا۔ "آج شوٹنگ ہے؟"

"نہیں"

"پھر کہاں جا رہی ہو؟"

"منصور سے ملنے۔"

"منصور کون؟"

"میرا فرینڈ جو رات کو مجھے چھوڑ کر گیا تھا۔"

''آج تمہیں لنڈن والے سیٹھ نے بلایا ہے۔ پانچ بجے اُس کی گاڑی آئے گی تمہیں لینے۔'' شکیلہ کا دل کانپ اُٹھا۔ ''امّاں تم نے مجھے دو چار دنوں کی مہلت دی تھی۔؟'' حمیدہ بیگم نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں مہلت دینا چاہتی تھی مگر تو بڑی بیٹی ہے سمجھنے کی کوشش کر۔ ہم مجبور ہیں۔ وہ اچانک آگیا ہے آج تمہیں جانا ہی پڑے گا۔ سیٹھ بہت زور ڈال رہا ہے۔ وہ کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے، اس لئے......''

''ٹھیک ہے میں چار بجے گھر پہنچ جاؤں گی۔'' اُس پریشانی کے عالم میں شکیلہ وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ حمیدہ بیگم تیوری چڑھائے اُسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ تول بھی رہی تھی۔

گیارہ بج رہے تھے۔ آٹو رکشا بس سٹینڈ کے پاس پہنچنے ہی والا تھا۔ شکیلہ نے پرس سے چھوٹا رومال نکال کر آنسوؤں کو اِس ڈھنگ سے پوچھا کہ آنکھوں کا کاجل بکھر نہ جائے۔ وہ چاہتی تھی اُس کے دل کی کھلبلی منصور پر ظاہر نہ ہو بلکہ اُسے لگنا چاہیئے کہ میں اِتنی خوش کبھی نہیں تھی جتنی آج ہوں۔ اس میں شک بھی نہیں کہ اُس نے مجھے بے حساب خوشی دی ہے۔

لیکن آج مجھے اور زیادہ خوشی چاہیئے۔ آج مجھے پوری طرح جینا ہے، پوری طرح مرنا ہے۔ منصور کے پاس رہ کر جینا ہے سیٹھ کے پاس جا کر مرنا ہے۔

منصور بس سٹینڈ کے پاس کھڑا تھا۔ اُس نے دور سے شکیلہ کو آٹو رکشا میں بیٹھے ہوئے دیکھ لیا۔ شکیلہ آٹو سے اُتر کر پیسے دینے لگی تو منصور اُس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ شکیلہ کو دیکھتا رہ گیا۔ جب وہ سمندر کی لہروں کی طرف چلنے لگے تو منصور نے کہا ''آج تم غضب کی حسین لگ رہی ہو۔ خدا کی قسم......''

''بس بس، قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں۔'' شکیلہ ہنس کر بولی۔ ''میں جانتی ہوں میں کتنی خوبصورت ہوں۔''

''آج تو تمہاری ہنسی بھی غضب کی ہے۔ اگر تم دن بہ دن یونہی خوبصورت ہوتی جاؤ گی تو......''

''اگر مجھ میں کوئی تبدیلی آئی ہے تو یہ سب تم سے ملنے کا اثر ہے۔''

''مجھ پر تو یہ اثر ہوا ہے کہ میں اب ہر وقت تمہارے بارے میں سوچتا ہوں۔ شکیلہ میری بات مان جاؤ۔ آج بھی اُسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔''

شکیلہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''میں بھی تم سے یہی بات کہنے والی تھی۔ لیکن منصور میں چار بجے چلی جاؤں گی۔''

''کیوں؟''

''گھر میں مہمان آرہے ہیں۔ میرا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔'' یہ کہتے ہوئے شکیلہ کو کوشش کرنا پڑی کہ اُس کے چہرے کی بشاشت غائب نہ ہو جائے۔ ٹیکسی جب ہوٹل کی طرف جارہی تھی تو وہ سوچ رہی تھی کہ صرف چار گھنٹے میرے پاس ہیں۔ اِن چار گھنٹوں کے بعد ہوسکتا ہے میری زندگی اندھیرے میں ڈوب جائے۔ کیا پتہ پھر منصور سے ملنے کی ہمت ہی نہ پڑے۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ میں اُس پر پوری حقیقت آشکار کردوں؟ اور اگر منصور اِتنی تلخ حقیقت کو قبول نہ کرے اور پھر وہ کبھی مجھے نہ ملے۔

منصور نے کہا۔ ''آج تم بات بات پر ہنس رہی ہو، کیا بات ہے۔''

آج میں بہت خوش ہوں۔''

''اِس خوشی کی کوئی وجہ تو ہوگی۔''

''وجہ؟ آج میں نے جان لیا کتنا پیار تم کرسکتے ہو۔''

منصور کو اندیشہ تھا کوئی ایسی بات ضرور ہے جسے شکیلہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔ آج اُس کے رویئے میں ایک انجاناپن تھا۔ اُس کے جانے کے بعد وہ کتنی دیر تک یہی سوچتا رہا۔

......☆......

حمیدہ بیگم اور افضل خاں باہر والے کمرے میں بیٹھے ہوئے شکیلہ کا انتظار کررہے تھے۔ جب وہ اندر داخل ہوئی تو اُس کے چہرے کی پریشانی کو سمجھنا اُن کے لئے مُشکل نہیں تھا۔ حمیدہ بیگم نے کرخت آواز میں کہا۔ ''تمہیں کہا نہیں تھا کہ ۵ بجے سیٹھ کی کار آنے والی ہے۔''

''میں آتو گئی ہوں۔'' شکیلہ نے جھلا کر کہا۔

"جلدی سے نہا دھو لے، اچھے کپڑے پہننا، اچھا میک اپ کرنا۔"

شکیلہ اپنے کمرے میں آ کر رونا چاہتی تھی۔ لیکن شمی کو دیکھ کر رو نہیں سکی۔

"آپا، منصور سے ملنے گئی تھی۔" شمی نے پوچھا۔

"ہاں میں اُسے یوں مل کر آئی ہوں جیسے کوئی آخری بار کسی سے ملتا ہے۔"

"ایسا مت کہو آپا، کیا تمہیں خدا پر بھروسہ نہیں رہا۔؟"

"کیا کہوں۔ کیا خدا کو معلوم نہیں کہ سیٹھ کی کار آ رہی ہے؟"

"میں صبح سے دعا مانگ رہی ہوں کہ سیٹھ مر جائے۔"

"ایسا مت کہہ شمی۔ تقدیر کسی ایک آدمی سے بندھی ہوئی نہیں ہوتی۔ ایک سیٹھ مر جائے گا تو دوسرا پیدا ہو جائے گا۔"

"مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا آپا کہ مجھے بچانے کی خاطر تم اپنی زندگی کو برباد کر دو۔"

"تم غلط سوچ رہی ہو۔ میں تمہاری خاطر کچھ نہیں کر رہی۔ ہم دونوں نے جس گھر میں جنم لیا ہے اُس گھر کے طور طریقوں کے مطابق ہی سانس لینا ہے۔ تو نے کبھی سوچا کہ ہماری امّاں نے بھی جوانی میں یہی کچھ دیکھا ہوگا۔ اُس نے بھی کسی سیٹھ کے مرنے کی دعا مانگی ہوگی اور تو دیکھ رہی ہے وہ آج بھی کس جانور کے ساتھ رہ رہی ہے۔"

"پتہ نہیں امّاں اِسے کہاں سے لے آئی ہے۔"

"یہ دنیا مردوں کی ہے شمی۔ اِس بات کو کبھی نہیں بھلانا۔ عورتیں مجبور ہوتی ہیں۔ ہر عورت کو کسی مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

پھر شکیلہ باتھ روم چلی گئی۔ جلدی نہا دھو کر آ گئی اور میک اَپ کرنے بیٹھ گئی۔ شمی بستر پر لیٹی تھی۔ آنکھوں پر دوپٹہ رکھ لیا تھا اُس نے۔

"شمی ذرا میرے بال بنا دو۔" شکیلہ نے میک اَپ کرتے ہوئے کہا۔

رنجیدہ لہجے میں شمی نے ہاں کہا۔ شکیلہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

لیکن مسکراتے ہوئے بولی۔ "تم نے کبھی قربانی کے بکرے کو نہیں سجایا؟"

شمی کو یاد آیا کہ اُس نے ایک بار قربانی کے بکرے کو سجایا سنوارا تھ، اُسے گلے سے لگا کر پیار بھی کیا تھا اور پھر اُس کی گردن پر چھری چلتی ہوئی بھی دیکھی تھی۔ پھر اُس نے اُس کا گوشت بھی کھایا تھا۔ لیکن اِس وقت اُس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ سیٹھ کے پاس جا رہی آپا کو سجائے، سنوارے۔

شکیلہ نے آنسو پونچھ کر آنکھوں میں کاجل ڈالا اور بولی۔ ''آج بکرا خود ہی اپنی قربانی کے لئے سج سنور کر تیار ہو جائے گا، تم بے فکر رہو۔''

شمی سے برداشت نہیں ہوا۔ وہ اُٹھی اور شکیلہ کی گود میں سر رکھ کر رونے لگی۔ شکیلہ اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

......☆......

شورلیٹ کار ممبئی کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ ایئر کنڈیشننگ کی وجہ سے اندر کافی ٹھنڈ تھی۔ پھر بھی شکیلہ کو پسینہ آ رہا تھا۔ وہ بار بار رومال سے ماتھا پونچھ رہی تھی۔ اِس طرح میک اَپ خراب ہوسکتا تھا۔ امّاں کے کہنے پر اُس نے گھنا میک اپ کیا ہوا تھا۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ مِڈی پہن کر جانا۔ یہ سیٹھ لوگ اپنے گھروں کی عورتوں کے لِباسوں سے اُکتائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ابّا نے تاکید کی تھی شراب پینی پڑے تو ایک آدھ چُسکی لگالینا۔ ابّا کا چہرہ یاد آتے ہی گھن آ گئی۔ یا اللہ، میرا ایسا امتحان کیوں لے رہے ہو۔ مجھے اِسی لئے پیدا کیا تھا کیا؟ مجھے اِس جہنم سے بچا۔ میری دُعا قبول کر۔ اِس کار کا ایکسڈنٹ کرادے۔ میری جان لے لے۔

اُسی وقت موبائل کی رِنگ ٹون بجی۔ وہ سمجھ گئی منصور بات کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اُس میں جرأت نہیں تھی کہ اِس وقت اُس سے بات کر سکے۔ گھنٹی بجتی جا رہی تھی۔ اُس نے سرخ بٹن دبا کر فون بند کر دیا۔

پھر اُس نے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ بائیں طرف سے اُس کے چہرے کا جتنا حصّہ نظر آ رہا تھا اُس سے لگتا تھا بڑی عجیب شکل ہے۔ ادھیڑ عمر کا، ساؤتھ انڈین، کالا رنگ، موٹی ناک، بڑے بڑے کان بالوں سے بھرے ہوئے۔

"ڈرائیور صاحب، آپ گاڑی اِتنی سلو کیوں چلا رہے ہیں؟" شکیلہ نے بے چینی اور ناراضگی سے کہا۔

ڈرائیور نے سامنے دیکھتے ہوئی مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔"ہمارے سیٹھ صاحب، نے ایسے ہی چلانے کی تاکید کی ہے۔"

"لیکن مجھے تو آہستہ چلنا اچھا نہیں لگتا۔تھوڑا تیز چلاؤ۔ورنہ مجھے دو میں چلاتی ہوں۔"

"نہیں نہیں میڈم، ہم کسی کو بھی گاڑی چلانے کے لئے نہیں دے سکتے۔آپ کہتی ہیں تو میں تھوڑا فاسٹ چلاتا ہوں۔"

ڈرائیور نے کار کی سپیڈ بڑھادی۔

موبائل کی گھنٹی پھر بجی۔شکیلہ کی پریشانی بڑھ گئی۔وہ کیا کرے؟ اُس کے ہاتھ میں کیا تھا؟ اُس کی مرضی سے تو کار کا ایکسیڈنٹ بھی نہیں ہو پارہا تھا۔اُس نے موبائل کا سرخ بٹن دبا کر بند کر دیا۔

ساڑھے چھ بجنے والے تھے۔

ممبئی میں ہزاروں آفس اِس وقت بند ہوتے ہیں۔لاکھوں لوگ ایک دم اپنے ڈربوں سے باہر نکل پڑتے ہیں۔لوکل سٹیشنوں کی طرف جانے والی بھیڑ کے ریلے اُمڈ۔تے ہیں۔جدھر دیکھو کاروں، ٹیکسیوں، بسوں کی یلغار ایسی افراتفری میں تیز کار چلانا آسان نہیں، پھر بھی ڈرائیور کوشش کر رہا تھا۔شکیلہ مضطرب، پریشان، بے صبر۔"اور تیز چلاؤ" اُس نے ڈرائیور سے کہا۔

"میڈم، اس ٹریفک میں اور کتنا تیز چلاؤں؟"

کوشش کرو اور تیز چلاؤ۔میں جلدی میں ہوں۔"

بے چارے ڈرائیور نے تھوڑا اور ایکسی لیٹر دبایا۔اُسی وقت آگے موڑ آ گیا۔موٹر مُڑتے ہی دیکھا تھوڑے فاصلے پر سگنل تھا۔ہری بتی دکھائی دے رہی تھی۔کار کی رفتار تیز تھی ڈرائیور نے سوچا گاڑی نکل جائے گی۔سگنل پر پہنچتے ہی پیلا سگنل ہو گیا۔ڈرائیور روکنے لگا۔لیکن شکیلہ نے چیخ کر کہا۔"نکل جاؤ گاڑی کو روکنا نہیں۔" ڈرائیور گھبرا کر نکلنے لگا۔لال بتی روشن ہو گئی۔ڈرائیور نے ایک دم اِتنے زور سے بریک لگائی کہ شکیلہ ایک جھٹکے سے اُچھل کر آگے کی سیٹ پر اُلٹنے لگی۔

اُس کے مُنہ سے چیخ نکل گئی اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ لیکن اُس کا سر ''ڈیش بورڈ'' سے جا ٹکرایا اور پیشانی سے خون رِسنے لگا۔

ڈرائیور بوکھلا گیا۔ چوراہے کے پار پہنچ کر اُس نے کار کو ایک طرف کھڑا کیا اور سیٹھ سے موبائل پر بات کرنے لگا۔ اُس نے ساری بات سنادی۔ یہ بھی بتا دیا کہ شکیلہ کے ماتھے سے خون رس رہا ہے۔ سیٹھ نے اُسے حکم دیا کہ شکیلہ کو فوراً واپس گھر چھوڑ آئے اور اُس کے باپ کو ساتھ لے کر ہوٹل میں آجائے۔

جب گاڑی مڑی تو شکیلہ کو چوٹ لگنے کا غم نہیں تھا۔ وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر بجالا رہی تھی جس نے اُس کی دُعا سن لی۔

......☆......

منصور کے دل سے یہ خدشہ نہیں نکل رہا تھا کہ آج شکیلہ نے ضرور اُس سے کوئی بات چھپائی ہے۔ اُس نے کئی بار فون کیا لیکن ہر بار شکیلہ نے فون کٹ کر دیا۔

ایسی کیا بات ہوسکتی ہے؟ اِسی فکر میں غلطاں تھا کہ رفیعہ اُس کے کمرے کے دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی۔

''بھائی جان، ہم اندر آجائیں۔''

''کیوں نہیں۔ آؤ بیٹھو۔''

رفیعہ اُس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ''بھائی جان، میں بتاؤں آپ اِس وقت کیا سوچ رہے ہیں؟''

''بتاؤ۔ اگر ٹھیک بتاؤ گی تو ہم تمہیں سو روپے دیں گے۔'' کہہ کر منصور نے اپنے بٹوے میں سے سو روپے کا نوٹ نکال کر سامنے رکھ دیا۔

''ہار جائیں گے آپ۔''

''تم بتاؤ تو سہی۔ تمہیں سو روپیہ دے کر مجھے گھاٹا نہیں پڑے گا۔''

''آپ شکیلہ کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔''

''تم نے ٹھیک کہا۔ اُٹھالو نوٹ۔''

رفیعہ نے نوٹ اُٹھالیا۔ ''آج تقدیر میرے ساتھ ہے۔ اچھا بھائی جان، آپ یہ بتایئے آپ شکیلہ کے بارے میں کیا سوچ رہے تھے؟''

''اگر یہ بھی تم ہی بتادو تو سو روپے اور ملیں گے۔''

''یہ تو میں نہیں بتا سکتی۔ آپ ہی بتائیں۔''

''میں کیا بتاؤں؟ میں تو اُس کے بارے میں بہت کچھ سوچتا رہتا ہوں''

''اِتنا بھی سوچنا ٹھیک نہیں۔ میری بات مانیں تو اُسے گھر بلایئے، کھانا کھلایئے تاکہ امّاں بھی اُس کے ساتھ بیٹھ کر اپنی تسلّی کر لے۔''

''ابھی اِتنی جلدی کیا ہے۔''

''جلدی ہے اِسی لئے تو کہہ رہی ہوں۔ امّاں آج کل جس مجلس میں جاتی ہے وہاں کی دو عورتیں گھر آئی ہوئی تھیں۔ اُن میں سے کوئی امّاں کو کوئی لڑکی پسند آجائے اور دل ہی دل میں اِرادہ پکا کر لے۔''

منصور نے صلاح دی۔ ''اُسے وہاں جانے ہی نہ دو''

اِسی لئے آپ شکیلہ کو جلدی گھر بلالو۔''

''میں شکیلہ کو کہہ کر دیکھتا ہوں۔''

''اُسے ابھی فون کریئے۔''

''میں نے کئی بار فون کیا ہے۔ لیکن......'' اُس نے پھر نمبر لگایا لیکن شکیلہ نے پھر کٹ کر دیا۔

......☆......

گھر واپس آتے ہوئے شکیلہ نے ایک نرسنگ ہوم میں پٹی کروالی اور انجکشن بھی لے لیا۔ زیادہ تو نہیں لگی تھی صرف ایک ٹانکا لگا۔ پٹی کروانے سے خون رسنا بند ہوگیا۔ کار جب گھر کے سامنے پہنچی تو افضل خاں اپنی عادت کے مطابق کھڑکی میں کھڑا تھا۔

شکیلہ کو کار سے باہر نکلتے دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔ ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی دیکھ کر تو وہ گھبرا گیا۔ فوراً باہر کے کمرے میں جا کر اُس نے دروازہ کھولا۔ شکیلہ کے ساتھ ڈرائیور بھی اندر آ گیا۔ شکیلہ نے کہا۔ "یہ بڑا ہوشیار ڈرائیور ہے۔ اِس کی وجہ سے ایک بڑا حادثہ ہوتے ہوتے ٹل گیا۔ لیکن بریک اتنے زور سے لگی کہ میرے ماتھے پر یہ چوٹ آ گئی۔ پٹی کروانی پڑی۔"

ڈرائیور بولا۔ "میں نے سیٹھ جی سے اُسی وقت بات کی۔ اُنہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اِسی وقت اِنہیں گھر چھوڑ دوں اور آپ کو لے کر ہوٹل چلا آؤں۔"

تبھی حمیدہ بیگم بھی وہاں آ گئی۔ اُس نے شکیلہ کو سینے سے لگا کر پیار کیا اور بانہہ سے پکڑ کر اندر لے گئی۔

افضل خاں ڈرائیور کے ساتھ ہوٹل روانہ ہو گیا۔

شمی شکیلہ کے ماتھے کی پٹی دیکھ کر چیخ مارتے مارتے رہ گئی۔ حمیدہ نے شکیلہ کو بستر پر لٹا دیا اور بولی۔ "میں تمہارے لئے دودھ گرم کر کے لاتی ہوں۔" وہ باہر نکلی تو شمی شکیلہ کے قریب آ کر دھیرے سے بولی۔ "آپا میں نے تو دُعا مانگی تھی کہ اُس نامراد کو کچھ ہو جائے یہ تمہیں کیا ہو گیا؟" شکیلہ نے شمی کو گلے لگا کر کہا۔ "تمہاری دُعا قبول ہوئی، اِسی لئے مجھے یہ چوٹ لگی اور میں آج اُس ڈیول سے بچ گئی۔"

"مگر ہوا کیا؟"

اُسی وقت موبائل کی گھنٹی بجی۔

"منصور کا فون ہوگا۔" شمی نے کہا۔

"اور کسی کے پاس تو میرا نمبر ہی نہیں۔" کہتے ہوئے شکیلہ نے فون کٹ کر دیا۔

"آپا تم منصور سے بات نہیں کرنا چاہتیں؟"

امّاں دودھ گرم کر کے لے آئی۔ "لے بیٹی، گنگنا ہی کیا ہے۔ پی کر سو جا۔" شکیلہ دودھ پینے لگی اور اماں اُس کے پاس بیٹھ کر اُس کی پیٹھ پر ہاتھ سے سہلانے لگی۔ شکیلہ نے دودھ پی کر گلاس شمی کو دیتے ہوئے کہا۔ "کچن میں رکھ دے۔" شمی گلاس لے کر چلی گئی۔

''درد تو نہیں ہو رہا؟'' اماں نے پوچھا۔

''نہیں اماں، آپ فکر نہ کریں۔ پٹی کرنے والے ڈاکٹر نے کہا کہ گہری چوٹ نہیں ہے۔ تم جاؤ اماں، میں سونے کی کوشش کروں گی۔''

''ساڑھے نو بجے میں تمہیں کھانے کے لئے اُٹھالوں گی۔''

''بھوک لگے گی تو میں خود کہوں گی۔'' شکیلہ نے کہا۔

حمیدہ بیگم چلی گئی۔ شمی پھر شکیلہ کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''آپا، اب تم کبھی منصور سے بات نہیں کرو گی؟''

''کیا بات کروں؟ اُسے سیٹھ کے بارے میں بتا دوں؟''

شمی ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھنے لگی۔

''جب اُسے پتہ چلے گا کہ میں کس جہنم میں رہتی ہوں تو پہلے تو اُسے یقین نہیں آئے گا۔ وہ مجھے اِتنا چاہتا ہے کہ میرے بارے میں سب کچھ جان کر پتہ نہیں کیا کرلے گا۔ میں اُسے اِتنا دکھ کیسے دوں؟ اِتنا دکھ دے کر میں بھی کیسے زندہ رہوں گی؟''

''اب تم اُس سے ملو گی ہی نہیں؟''

''ایک دو دن تو میں ویسے ہی اُس کے سامنے نہیں جا سکتی۔ وہ مجھے پوچھے گا یہ چوٹ کیسے آئی؟ کہاں جا رہی تھی؟ کس کی کار میں بیٹھی ہوئی تھی؟ کیسے کتنے جھوٹ بولوں گی؟'' تھوڑی دیر چپ رہ کر شکیلہ پھر بولی۔'' ابا سیٹھ سے مل کر لوٹے گا تو میری تقدیر کا پتہ چلے گا۔ پھر سوچوں گی منصور کے بارے میں۔''

''آپا، پیار میں اِتنا غم کیوں ہے؟''

''اللہ جانے۔''

رات بارہ بجے افضل خاں کو سیٹھ کی کار گھر چھوڑ گئی۔ نشے میں دُھت تھا وہ۔ آتے ہی پچاس ہزار کے نوٹ اُس نے حمیدہ بیگم کے ہاتھ میں تھمائے اور کہنے لگا۔ ''سیٹھ بڑا نیک دل انسان ہے۔ شکیلہ کے زخمی ہونے کا اُس کو ملال تھا۔ کہہ رہا تھا اُس کا ٹھیک سے علاج کراؤ۔ وہ دو

دن کے بعد لندن جارہا ہے۔دس دن کے بعد واپس آئے گا۔آنے سے پہلے فون کرے گا۔"

صبح جب شکیلہ کو اماں سے پتہ چلا کہ سیٹھ لندن جائے گا اور دس دن کے بعد لوٹے گا تو شکیلہ کو محسوس ہو کہ جس پھندے سے اُسے پھانسی لگنے والی تھی وہ ٹوٹ گیا ہے۔دس دن ہی سہی۔ کھل کر سانس تو لے سکتی ہے۔منصور کو اپنا پیار دے سکتی ہے۔اُس کا پیار لے سکتی ہے۔اُسے یہ بھی خیال آیا کہ یہ دس دن دینے والا خدا آگے کوئی اور معجزہ بھی کرسکتا ہے۔اُس کے پاس مہلت میں دینے والے دنوں کی کمی نہیں ہے۔اُس کے جی میں آیا کہ وہ آج نماز پڑھے۔

اُس نے منصور کو فون کیا۔

گھنٹی سن کر منصور نے فون اُٹھایا تو دیکھا شکیلہ فون کر رہی تھی۔اُسے ایک دم محسوس ہوا کہ وہ ڈوب رہا تھا اور بچ گیا ہے۔جیسے بہت دیر سے بلیک آوٹ ہوا پڑا تھا اور ایک بلب جل اُٹھا ہے۔وہ بات کرنے کے لئے بٹن دبانے ہی لگا تھا کہ اُس کا ہاتھ رُک گیا۔اُس کے دل کا غبار جاگ پڑا۔ناراضگی نے پھن اُٹھالیا۔غصّہ حاوی ہوگیا۔اُس نے سرخ بٹن دبا کر فون کٹ کردیا۔فون کٹ کرتے ہی پشیمانی ہونے لگی۔سوچنے لگا کہ میں نے ٹھیک نہیں کیا۔یہ غلطی نہیں کرنی چاہئے تھی۔پتہ نہیں اُس کی کیا مجبوری ہو۔کسی مصیبت میں بھی پھنسی ہوسکتی ہے۔ بات تو کرنی ہی چاہیئے تھی۔وہ پھر فون کی گھنٹی کا انتظار کرنے لگا۔

شکیلہ سمجھ گئی منصور ناراض ہوگیا ہے۔غلطی میری ہے۔میں نے اُسے کتنا تڑپایا۔

اُس کا غصہ جائز ہے۔مجھے ہی اب منانا پڑے گا۔پھر نمبر لگایا۔منصور نے بے تاخیر بٹن دبایا اور 'ہیلو' کہا۔

شکیلہ نے کہا۔"منصور آئی ایم ساری۔ویری ساری" وہ منت سماجت کرنے کے لہجے میں بول رہی تھی۔

"تم فون کیوں کر رہی ہو؟" منصور نے رُکھائی سے پوچھا۔

"مجھے تم سے معافی مانگنا ہے۔"

"کس بات کی معافی ؟"

''پلیز منصور، میرے ساتھ بے گانوں جیسی بات نہ کرو۔ میں تمہاری قصور وار ہوں۔ میں نے تم سے زیادتی کی ہے۔ تمہیں دکھ دیا۔ مگر میری بھی بہت بڑی مجبوری تھی، تمہیں بتاؤں گی۔ مجھے معاف کردو۔ بس ایک بار معاف کردو۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''میں تم سے ملوں گی لیکن ایک دو دن کے بعد۔''

''آج فون کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ دو دن کے بعد کرتیں۔''

''پلیز اب غصہ چھوڑو۔ مجھے معاف کرو بس دو دن اور۔ آئی لو یُو''

''ٹھیک ہے میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔''

منصور کو تسلی ہوئی۔ آخر شکیلہ نے فون تو کیا۔ بے چاری کی پتہ نہیں کیا مجبوری ہے لیکن اُس کے دل میں جو کھٹکا تھا، وہ بدستور تھا۔ کوئی نہ کوئی بات ہے جو وہ بتا نہیں رہی۔ اِس بار ملے گی تو پوچھ کر ہی چھوڑوں گا۔ اُسے بتانا ہی پڑے گا۔ مگر ابھی تو وہ دو دن کے بعد ملے گی۔ منصور کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا یہ دو دن کیسے گزریں گے۔ اِن دنوں کوئی شوٹنگ بھی تو نہیں۔ چلو کوئی فلم ہی دیکھ لیتے ہیں۔

آخر منصور نئی ریلیز ہونے والی فلم دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا۔ لیکن راستے میں پھر خیال بدل گیا۔ اُس نے سوچا سٹنٹ آرٹسٹ ایسوسی ایشن کا چکر لگانا چاہیئے۔ آفس پہنچ کر دیکھا جسونت اکیلا ہی بیٹھا ہوا ہے۔ ''کیسے ہو منصور؟'' جسونت نے پوچھا۔

''کیا بتاؤں؟'' ایک لمبی سانس لیتے ہوئے منصور نے کہا۔

''کیوں''

''عشق نے کہیں کا نہیں رکھا۔''

''زیادہ ہی چکر میں آگئے ہو۔''

''اب باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''اچھا کیا جو مجھے بتا دیا۔ میں نے بھی پھسلنا شروع کردیا ہے۔ لیکن بچنے کا موقع ابھی

ہے۔"

"میں تمہیں یہ تو نہیں کہہ رہا کہ عشق مت کرو۔"

"تمہارے تجربے سے کچھ سیکھنے میں کیا بُرائی ہے۔"

"نہیں جسونت اِس میں دوسروں کا تجربہ کام میں نہیں آتا۔ یہ ایک ایسا پھندا ہے جس میں پھنسنے کے بعد ہی پتہ لگتا ہے کہ پھنسنا کیسے اور کیسے نہیں پھنسنا۔"

جسونت ہنس پڑا۔ لیکن اُسے محسوس ہوا کہ منصور جو کہہ رہا ہے ویسی بات کوئی گہرے تجربہ کے بعد ہی کر سکتا ہے۔

چائے پی کر منصور جانے کے لئے اُٹھا۔ جسونت نے بتایا شکروار کی چاندی ولی سٹوڈیو میں شکیلہ کی شوٹنگ ہے آج اُسے میسیج بھیجنا ہے۔ منصور نے کہا "میں تمہیں اُس کا موبائل نمبر دے سکتا ہوں۔" جسونت نے اُس سے نمبر لے لیا۔

آفس سے باہر آکر منصور گھر جانے لگا تو اُس کا جی چاہا گھر جانے سے پہلے وہ شکیلہ کے گھر کا چکر لگائے۔ وہ ایک آٹو رکشا میں بیٹھا اور ڈرائیور کو باندرہ چلنے کے لئے کہا۔ جب آٹو شکیلہ کے گھر کے آگے سے گزرا تو اُس نے دیکھا کوئی بنیان پہنے کھڑکی میں کھڑا تھا۔ اُس کا ابّا ہوگا۔ منصور نے اندازہ لگایا۔ کاش اُس کی جگہ شکیلہ ہوتی اُس نے سوچا۔

وہ جب گھر پہنچا تو رفیعہ نے بتایا کہ اماں اپنی سہیلی کے گھر جا رہی ہے۔ اُس کی لڑکی کو دیکھنے کیلئے۔ منصور اماں کے پاس گیا اور کہنے لگا۔ "اماں، میرے لئے کوئی لڑکی دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ پہلے میں تمہیں وہ لڑکی دکھاؤں گا جو مجھے پسند ہے۔ ویسے تم نے اُسے دیکھا بھی ہے۔"

"وہ کوئی دیکھنا نہیں ہوتا۔" اماں برقع اوڑھتے ہوئے بولی۔

"ایک دو دن کے بعد اُسے گھر بلاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن پہلے بتا دینا۔"

"تم آج میری شادی کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا۔"

''نہیں کروں گی۔ لیکن آج جانا تو پڑے گا اُسے کہہ جو دیا ہے۔''

اماں کے جانے کے بعد رفیعہ نے بھائی سے کہا۔ ''اگر آج شکیلہ آجاتی تو شاید اماں نہ جاتی۔''

''ابھی ایک دو دن تک وہ گھر سے نہیں نکل سکتی۔'' منصور نے اُسے بتایا۔

شام ڈھلنے سے پہلے ماں لوٹ آئی۔ آتے ہی بولی۔ ''منصور اِتنی خوبصورت لڑکی بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ کیا گورا رنگ، لمبا قد، کالج میں بارہویں پاس کیا ہے۔ آج کل بچوں کے ایک سکول میں پڑھاتی ہے۔''

منصور گھبرا کر بولا۔ ''اماں اِسی لئے میں کہتا تھا پہلے وہ لڑکی دیکھو جو مجھے پسند ہے''

''میں نے شادی کے بارے میں کوئی بات تھوڑی کی۔ ویسے لڑکی دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔''

رفیعہ اور منصور دونوں ہنس پڑے۔

''اِس میں ہنسنے والی کیا بات ہے؟ ویسے ہو سکتا ہے ایک دو دن میں وہ ماں بیٹی ہمارے گھر چائے پینے آئیں تم گھر پر رہنا۔''

منصور اور رفیعہ سمجھ گئے ماں کے دل میں کیا ہے۔

وہ ماں بیٹی دوسرے روز ہی تشریف لے آئیں۔ اماں نے خاطر داری میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ رفیعہ نے ماں کا ہاتھ بٹایا۔ اُسے بھی لڑکی بُری نہیں لگی۔ لیکن منصور جان بوجھ کر اُسی وقت گھر سے غائب ہو گیا۔ وہ تو شکیلہ سے ملنے کے لئے بے قرار تھا۔ شکیلہ نے فون کر کے اُسے شوٹنگ کے بارے میں بھی بتایا تھا۔

......☆......

آج شکر وار تھا۔ لیکن صبح سویرے ہی اطلاع مل گئی کہ کسی وجہ سے شوٹنگ کینسل ہو گئی ہے۔ شکیلہ نے فوراً منصور کو فون کیا کہ وہ شوٹنگ پر نہ آئے۔ منصور نے کہا۔ ''چاہے شوٹنگ نہیں ہو گی مگر میں آج تم سے ضرور ملنا چاہتا ہوں۔'' فیصلہ ہوا کہ دوپہر تین بجے باندرہ کے بینڈ سٹینڈ پر

ملیں گے۔

دو بج چکے تھے۔ شکیلہ تقریباً تیار تھی نکلنے کے لئے۔ شمی کو ابھی سکول سے آنے میں دیر تھی۔ اماں کو صبح سے ہی سر میں درد ہو رہا تھا۔ کھانا کھا کر ماتھے پر بام مل کر سو گئی تھی۔ شکیلہ کمرے سے نکلنے ہی لگی تھی کہ افضل خاں تہمد اور بنیان پہنے اندر آ گیا۔ اندر آ کر اُس نے دروازہ بھڑا دیا۔ شکیلہ چونک گئی۔

''آج تو شوٹنگ کینسل ہو گئی ہے؟'' افضل خاں نے پوچھا۔

''ہاں'' شکیلہ نے جواب دیا۔

''پھر تم کہاں جا رہی ہو؟''

''منصور سے ملنے۔''

''کیا ضرورت ہے اُس سے ملنے کی؟''

''وہ میرا دوست ہے۔''

''تمہیں کیا ضرورت ہے کسی کو دوست بنانے کی؟''

''میری مرضی ہے میں کسی کو بناؤں یا نہیں بناؤں۔''

افضل خاں نے آواز کو بھاری بناتے ہوئے کہا۔ ''تم نہیں جانتیں تم سے لنڈن والے سیٹھ نیک کیا کہا ہے؟۔''

شکیلہ نے بھی کرخت آواز میں جواب دیا۔ ''اُس نے یہ تو نہیں لکھوالیا کہ میں کسی کو اپنا دوست نہیں بنا سکتی۔''

افضل خاں نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میرے سامنے بیٹھ جا۔ میں تمہیں کچھ باتیں سمجھانا چاہتا ہوں۔'' مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ''ہونے دے دیر۔ میری بات بہت ضروری ہے۔''

شکیلہ اُس کے اور اپنے درمیان کچھ فاصلہ رکھ کر بیٹھ گئی۔

''منصور کے ساتھ تمہارا دوستانہ مجھے پسند نہیں۔ اُس کے ساتھ ملنا جلنا بند کر دے۔''

''میں نے آپ کی سب باتیں مان لیں۔ پھر آپ کو میرا منصور سے ملنا پسند کیوں نہیں؟''

''منصور کے ساتھ دوستی رکھ کر تم گمراہ ہو جاؤ گی۔''

''کیا مطلب؟ میں گمراہ کیوں ہو جاؤں گی؟''

''تمہاری عمر میں گمراہ ہونا کوئی اَن ہونی بات نہیں۔ تمہیں منصور کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے؟''

میری بات کو ذرا غور سے سننا، سمجھنا۔ ہر جوان لڑکی کے دل میں اُمنگ ہوتی ہے ترنگ ہوتی ہے۔ یہ جوانی کے تقاضے ہیں جن کی وجہ سے تم منصور کو ملنے جاتی ہو۔ یہ جذبات خدا ہی پیدا کرتا ہے۔ یہ کوئی گناہ نہیں۔ مگر اِن جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی حد کے پار نہیں جانا چاہیئے۔ اگر تم منصور سے زیادہ ملو گی تو ممکن ہے تم اپنی اماں اور اپنی چھوٹی بہن کو بھول جاؤ اور یہ گھر ہی برباد ہو جائے۔

اور پھر منصور کا بھی کیا بھروسہ۔ اِسی لئے میں تمہیں یہ نیک صلاح دے رہا ہوں۔

......☆......

وہاں کھڑے کھڑے منصور کو غصہ آنے لگا تھا۔ اِتنے دنوں کے بعد ملنے آرہی تھی اور اِتنی تاخیر کئے جارہی تھی۔ ذرا بھی خیال نہیں کہ دوسرے پر کیا بیت رہی ہوگی۔ یہ لڑکیاں کیوں ایسا کرتی ہیں؟ دوسروں کو تڑپانا کیا ضروری ہوتا ہے؟ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے ہی آٹو رکشا آ کھڑا ہوا۔ شکیلہ اُس میں سے نکلنے لگی۔ منصور کا غصہ کافور ہو گیا۔ وہ آگے بڑھا مگر شکیلہ کا چہرہ دیکھ کر دھک سے رہ گیا۔ گہرا تناؤ تھا وہاں۔ آنکھوں میں درد و غم کی شدت تھی۔ کاجل چہرے پر میل بن کر جما ہوا تھا۔

''کیا ہوا تمہیں؟''، منصور نے گھبرا کر پوچھا۔ شکیلہ کچھ نہیں بولی۔ گردن نیچی کئے ہوئے تھی۔ وہ جانتی تھی اگر اُس نے منصور سے آنکھیں ملائیں تو اپنے آنسو نہیں روک سکے گی۔

''بتاؤ تو کیا ہوا شکیلہ؟''

وہ پھر بھی خاموش تھی۔

''تم بتاؤ گی نہیں تو مجھے کیسے پتہ چلے گا؟''

وہ پھر بھی کچھ بول نہیں سکی۔

''پلیز کچھ بولو''

شکیلہ بولنا چاہتی تھی۔ مگر کیا؟ کیا کہتی کہ وہ کیوں بول نہیں رہی؟ کیا بچا ہے بولنے کے لئے؟ وہ تو اِس وقت منصور کے پاس آنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اور جاتی بھی کہاں؟ اپنی بے بسی کا اِتنا گہرا احساس اور رنج وغم کی اتنی شدت لے کر وہ اور کہاں جاتی؟ اِس وقت منصور یہاں موجود نہ ہوتا تو شاید وہ اپنے آپ کو سمندر کی لہروں کے حوالے کر دیتی۔

اچانک منصور کو خیال آیا کہ شکیلہ کو ضرور کوئی صدمہ پہنچا ہے، کوئی بڑی چوٹ ہے۔ مجھے اس کے ساتھ ہمدردی جتانی چاہیئے۔ شکیلہ نے ہاتھ چھڑا لیا۔

''ہوٹل چلیں؟''

''نہیں''

''کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔''

اب شکیلہ کی خاموشی کا مطلب ''ہاں'' تھا۔

منصور کو ''گلستاں'' ریسٹورنٹ کا پتہ تھا۔ جس میں چھوٹے چھوٹے 'فیملی روم' بنے ہوئے تھے۔ جہاں باقی دنیا سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھا جا سکتا تھا۔

وہاں پہنچ کر دونوں کو پرائیویسی محسوس ہوئی۔

شکیلہ نے لمبی سانس لی۔

چائے آئی تو منصور نے اپنے ہاتھوں سے شکیلہ کو کپ تھمایا۔ شکیلہ نے کپ کو دوبارہ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''مجھے بتاؤ تمہیں کیا ہوا ہے۔''

شکیلہ دونوں ہاتھوں سے آنسو پونچھنے لگی۔

''گھر میں تو خیریت ہے نا۔''

''میرا کوئی گھر نہیں۔''

''ہُوا کیا ہے؟''

''میں بتا نہیں سکتی۔''

''چلو نہیں بتاؤ۔ تھوڑی چائے پی لو۔''

دونوں نے ایک ایک گھونٹ چائے پی۔

منصور نے کہا۔ ''چلو میرے گھر چلو۔''

''نہیں''

''کیوں؟''

شکیلہ نے جواب نہیں دیا۔

''میری اماں، میری شادی کرنا چاہتی ہے۔ لڑکیاں پسند کررہی ہے۔ میں نے اُسے کہا ہے پہلے وہ لڑکی دیکھو جو مجھے پسند ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔ کب چلوگی؟''

تھوڑی دیر تک شکیلہ گردن جھکا کر چپ رہی پھر منصور کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''منصور میں شادی نہیں کرسکتی۔''

منصور نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولا۔ ''میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتا اگر تم شادی نہیں کرسکتی تھیں تو میرے اِتنا قریب کیوں آئیں۔''

شکیلہ کیا جواب دیتی؟

منصور پھر بولا۔ ''اگر تم میری زندگی کا حصہ نہیں بن سکتیں تو تم نے مجھے وہ لمحے کیوں دیئے جن میں ہماری روحیں ایک دوسرے میں جذب ہوگئیں۔ کیا وہ سب ایک چھلاوہ تھا؟ دھوکا تھا؟''

شکیلہ منصور کے اِتنا قریب آگئی کہ دونوں کی سانسیں آپس میں ٹکرانے لگیں۔

اُس نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔ ''منصور میں نے تمہیں روح کی گہرائیوں سے چاہا ہے، اُس میں کوئی دھوکا، کوئی فریب نہیں۔ ہاں میری ایک خودغرضی تھی لیکن وہ بھی پیار کا ہی ایک روپ ہے۔ تم میری زندگی میں پہلے مرد ہو جسے میں نے اتنا چاہا۔ میرے پاس جو کچھ بھی تھا

، میں نے تمہیں دے دیا۔ کچھ بھی بچا کر نہیں رکھا۔ صرف یہ زندگی، یہ میرے آس پاس کی دنیا ہے جو تمہارے حوالے نہیں کر سکتی۔ اس پر میرا اختیار نہیں ہے۔ یہ میری مجبوری ہے۔ میں ایک ایسے گھر میں جی رہی ہوں جو صرف گندگی اور غلاظت سے بھرا ہوا ہے۔ وہاں پیار کا نہیں ظلم کا راج ہے۔ اُس ماحول میں سانس لیتے گھن آتی ہے مگر میری ماں وہاں، میری بہن وہاں۔ میں اُنہیں اُن بے رحم حالات میں چھوڑ کر باہر نہیں آسکتی۔ وہاں جینا بھی مشکل ہے اور وہاں سے نکلنا بھی مشکل۔''

''اگر میں تمہاری ہر طرح سے مدد کروں تب بھی تم وہاں سے چھٹکارا نہیں پاسکتیں؟''

''نہیں''

''تو پھر تم نے مجھے برباد کیوں کیا؟''

''میں قصوروار ہوں منصور لیکن میری محبت نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میری محبت سچی ہے، پاک ہے۔''

''اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہاری محبت تمہیں واپس کر دیتا۔''

''میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی۔ تم نے جو پیار مجھے دیا ہے وہ میری زندگی کی بہت قیمتی جائیداد ہے۔ مجھے وہ دوبارہ نہیں مل سکتی۔ میں جب بھی اُس کراہت بھرے ماحول میں سانس لوں گی تمہارے پیار کی یادیں مجھے جینے کا حوصلہ دیں گی۔''

منصور نے ایک ٹک اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اِس کا مطلب ہے تم یہ کہانی یہیں ختم کر رہی ہو؟''

شکیلہ تڑپ اُٹھی اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ منصور کو اُس پر رحم بھی آرہا تھا اور غصہ بھی۔ وہ کچھ بتانے کو بھی تیار نہیں تھی اور کہانی بھی ختم کر رہی تھی۔ منصور کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پاگل ہو جائے گا۔ اپنے آپ کو انتہائی ضبط میں رکھ کر اُس نے کہا۔ ''میں تمہیں آخری دفعہ کہنا چاہتا ہوں مجھے بتاؤ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اگر تم نہیں بتاؤ گی تو آئندہ میں تم سے نہیں ملوں گا۔''

شکیلہ پھر بھی کچھ نہیں بتا پائی۔

کافی دیر کے بعد دونوں ریسٹورنٹ سے باہر نکلے تو شکیلہ کے آنسو بہہ رہے تھے۔ منصور کا غصہ اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اُس کے بس میں ہوتا تو اُس کے چہرے پر تھپڑ بھی مار دیتا۔ اپنی بے بسی پر وہ چھٹپٹا رہا تھا۔

شکیلہ چلی گئی۔

منصور نے کبھی اِس انجام کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ گھر آ کر اُس نے ماں سے کہا۔ ''امّاں ابھی میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ نہ تمہاری پسند کی لڑکی کے ساتھ نہ اپنی پسند کی لڑکی کے ساتھ۔''

امّاں اُس کے وحشت زدہ چہرے کو دیکھ کر کانپ اُٹھی۔ رفیعہ بھی پریشان ہوگئی۔ دونوں نے بڑی کوشش کہ منصور بتائے آخر ہوا کیا ہے۔ منصور نے کچھ نہیں بتایا۔ وہ بتاتا بھی کیا؟ شکیلہ نے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔

......☆......

ریسٹورنٹ سے نکل کر جب شکیلہ آٹو رکشا میں بیٹھ گئی تو اُس نے منصور کی طرف دیکھا۔ اُس کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ اُس کا جی چاہا وہ رِکشا پر سے اُتر کر اُس کا ہاتھ تھام لے اور کہے۔'' چل منصور تو مجھے جہاں چاہے لے چل۔'' لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔

آٹو رِکشا چل پڑا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپالیا۔ اُس نے کب چاہا تھا کہ اِتنی جلدی کہانی ختم ہو جائے۔ ابھی تو انٹرول بھی نہیں ہوا اور کلائمیکس آ گیا۔ کیسی فلم تھی یہ؟ ایک دم فلاپ۔

اپنے ہی ہاتھوں وہ دل مسوس کر رہ گئی تھی۔ کیا وہ سچ مچ اب کبھی نہیں ملیں گے؟ منصور مجھے بھول جائے گا؟ میں اُسے فراموش کر دوں گی؟ یہ ممکن ہے؟

جیسے جیسے گھر نزدیک آ رہا تھا اُس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ افضل خاں کا چہرہ سامنے آتے ہی اُس پر کپکپی طاری ہوگئی۔ اب وہ اُس سے آنکھ ملائے گی؟ اُسے ابا کہہ کر پکار سکے گی؟ ایک ہی گھر

میں رہ سکے گی؟ اُس کی بُو برداشت کر سکے گی؟

کال بیل بجانے سے پہلے وہ دیر تک دروازے کے باہر کھڑی رہی۔ اُسے معلوم تھا وہ ایک ایسے غار میں داخل ہو رہی ہے جس کے اندر ہوا نہیں۔ وہاں اُس کی سانس گھُٹ جائے گی مگر اُس اندھیرے گٹر میں داخل ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

گھنٹی کی آواز سن کر شمی نے دروازہ کھولا۔ شکیلہ تیزی سے سیدھے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شمی بھی پیچھے پیچھے آ گئی۔ ''آپا طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں ٹھیک ہے۔''

''ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں۔''

شکیلہ نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

اُسی وقت حمیدہ بیگم اندر آ گئی۔ ''پتہ نہیں تیرے ابا کو کیا ہوا ہے۔ پیٹ کے نچلے حصے میں درد کی بات کہہ رہا تھا۔ کیا کریں ڈاکٹر کو بلائیں۔؟''

شمی بھی آپا کی طرف دیکھ رہی تھی۔

شکیلہ شش و پنج میں تھی۔ کیا کہے۔

''وہ کہہ رہا تھا ڈاکٹر کو بُلانے کی ضرورت نہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ شکیلہ تو ہی اُس کے پاس جا کر پوچھ اُسے کیا ہوا ہے۔''

''میری بھی طبیعت ٹھیک نہیں اماں۔ سَر میں درد ہو رہا ہے۔'' شکیلہ ڈر گئی تھی۔

''تو لیٹ جا۔ میں تیرے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

شمی نے کہا۔ نہیں اماں۔ آپ ابا کے پاس بیٹھو۔ میں آپا کے لئے چائے بنا کر لے آتی ہوں۔''

اماں بھی وہاں سے چلی گئی اور شمی بھی۔ اپنے آپ کو تنہا پا کر شکیلہ اور بھی گھُٹ گئی۔ یا خدا!! اِس گھر میں کیسے رہوں گی؟ یہاں تو سانس لینا بھی مشکل ہے۔ منصور کی یاد آئی۔ میں نے ٹھیک نہیں کیا۔ بے دلی سے اُسے ناراض کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر اُسے ساری حقیقت سے آشنا

کر دیتی تو شاید وہ کوئی راستہ سمجھاتا۔ اُسے اندھیرے میں رکھ کر کتنا دکھ دیا۔ میں کتنی خود غرض ہوں۔ وہ مجھ سے سچی محبت کرتا ہے۔ اس بھنور سے وہی مجھے نکال سکتا ہے۔ کہانی اِتنی جلدی انجام تک کیسے پہنچ سکتی ہے؟ اُس نے موبائل نکالا اور منصور کا نمبر لگایا۔

موبائل کی گھنٹی بجی تو منصور نے دیکھا شکیلہ کا نمبر تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ شکیلہ اُسے فون کرے۔ اب فون کرنے کا کیا مطلب؟ کہانی تو ختم ہوگئی، کہیں غلطی سے تو نمبر نہیں لگا دیا؟ نہیں غلطی ممکن نہیں۔ پھر؟ مجھے بات نہیں کرنی چاہیئے۔ اُس نے مجھے کیا سمجھ لیا ہے؟ میں اب اور ذلیل نہیں ہونا چاہتا۔ گھنٹی بدستور بج رہی تھی۔ اُس نے سرخ بٹن دبایا اور اُسے بند کر دیا۔

دوسرے دن منصور کی شوٹنگ تھی، فلم سٹی میں وہ گھر سے جلدی نکل آیا اور لوکیشن پر وقت سے پہلے پہنچ گیا۔ وہ چاہتا تھا کام میں دل لگائے اور باقی سب کچھ بھول جائے۔ فلم یونٹ کے دوسرے لوگ بعد میں دھیرے دھیرے آنا شروع ہوئے۔ پہلے پروڈکشن والے آئے سارا سامان لے کر۔ ایک سپاٹ بوائے نے آتے ہی سٹوو جلایا اور چائے کا پانی اُس پر رکھ دیا۔ پھر کیمرہ والوں کی وین آگئی۔ آج دو کیمروں کے ساتھ شوٹنگ ہونی تھی۔ اُس کے بعد سٹنٹ ماسٹر اور اُن کے اسسٹنٹ اپنے اپنے موٹر سائیکلوں پر آپہنچے۔ منصور کو اپنے سے پہلے آیا ہوا دیکھ کر اُنہیں حیرانی ہوئی۔

"کیا بات ہے منصور آج اِتنی جلدی؟" سٹنٹ ماسٹر نے پوچھا۔

"صبح جلدی نیند کھل گئی۔ اِس لئے جلدی آگیا۔" ویسے حقیقت اِس کے برعکس تھی۔ اُسے تو رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ یہاں چائے پی کر اُسے چُستی محسوس ہونے لگی تھی۔

فلم ڈائریکٹر نے آکر سٹنٹ ماسٹر کو بتایا کہ اُسے کس طرح کا شارٹ چاہیئے۔ سٹنٹ ماسٹر اپنے اسسٹنٹوں اور منصور کو لے کر ایک طرف چلے گئے اور شارٹ کی روپ ریکھا تیار کرنے لگے۔ آخر میں ماسٹر جی نے منصور کو سمجھایا۔ "منصور تمہیں جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے اِس سپاٹ

تک سیدھے آنا ہے۔ یہاں سے سڑک چھوڑ کر جیپ کو نیچے لے جانا ہے۔ یوں لگے کہ جیپ کا بیلنس تمہارے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ جیپ کو اُس بڑے درخت کی طرف موڑ کر تم خود جیپ سے باہر چھلانگ لگا دینا۔ آگے جیپ اُس درخت سے جا کر ٹکرانی چاہیئے۔ بس پہلا شارٹ اِتنا ہی......"

منصور نے اُس جگہ پر نشانی کے طور پر ایک بڑا پتھر رکھ دیا جہاں سے اُس کو جیپ کو سڑک سے نیچے اُتارنا تھا۔ پتھر کو اُس نے گھاس سے ڈھک دیا۔ پھر اُس نے کافی آگے جا کر اُس جگہ پر ایک پتھر رکھا جہاں پہنچ کر اُس کو جیپ میں کود جانا تھا۔ اپنے دماغ میں اُس نے پورا ایکشن کر کے دیکھ لیا۔ پھر اُس نے سڑک پر جیپ چلا کر دیکھا کہ جیپ میں کوئی نقص تو نہیں۔

دونوں کیمرے لگ گئے۔ ایک کو جیپ کو لانگ شارٹ میں فولو کرنا تھا دوسرے کو کلوز میں۔ اِس شارٹ کی مکمل ریہرسل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ ممکن تھا ریہرسل کرتے ہوئے جیپ سڑک سے نیچے اُترتے ہوئے خراب ہو جاتی۔ سب لوگ اپنے اپنے کام پر مستعد تھے۔ منصور جیپ میں بیٹھ گیا۔

سٹنٹ ماسٹر کو ڈائریکٹر کے اشارے کا انتظار تھا۔

اچانک منصور کی نظر کلوز شارٹ لینے والے کیمرے کے پیچھے کھڑے لوگوں پر پڑی۔ اُن میں شکیلہ کو دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ وہ یہاں کیوں آئی ہے؟ اب وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہے؟ کیا چاہتی ہے مجھ سے؟ نہیں، میں نہیں ملوں گا۔ پریشان ہو کر وہ جیپ سے نیچے اُتر آیا۔ سٹنٹ ماسٹر کی سمجھ میں نہیں آیا۔

اُس نے منصور کے پاس جا کر پوچھا۔ "کیا ہوا۔؟" منصور نے جواب دیا۔ "سوری ماسٹر جی۔ میں پانچ منٹ کے بعد شارٹ دوں گا۔ آپ کہیں تو میں ڈائریکٹر کے پاس جا کر معافی مانگ لوں۔"

"تم فکر مت کرو، میں بات کر لوں گا۔"

شکیلہ نے منصور کو اپنی طرف آتے دیکھا تو گھبرا گئی۔ کیا اُس نے اُسے دیکھ لیا ہے؟ پچھلے

دو دن میں اُس نے اُسے کوئی پچیس بار فون کیا ہے۔ لیکن ہر بار اُس نے فون کٹ کر دیا ہے۔اُس کا غصہ ابھی تک نہیں اُترا۔اُس کا کوئی قصور بھی نہیں۔ میری نادانی ہے۔ میں بھی کیا کروں؟

منصور شکیلہ کے پاس پہنچا تو اُسے ایک طرف لے گیا۔

''تم یہاں کیوں آئی ہو؟''

''تم سے بات کرنی ہے۔''

''میں تمہارے ساتھ کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔''

''میں تمہیں بہت کچھ بتانا چاہتی ہوں۔''

''مجھے کچھ نہیں سننا۔''

''پلیز منصور......''

''تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اگر میرا شارٹ خراب ہو گیا تو......''

''سوری منصور۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ میں جا رہی ہوں۔ مگر تمہارے ساتھ میرا ملنا بہت ضروری ہے۔''

''اب کوئی ضرورت نہیں ملنے کی۔ مجھے بھول جاؤ۔ بہت ہو گیا۔ اب اور نہیں۔''

شکیلہ وہاں سے چل پڑی۔

منصور نے ماسٹر جی کے پاس جا کر کہا۔ ''شارٹ لیجئے۔'' اور جیپ میں جا کر بیٹھ گیا۔ اُس نے پھر یاد کیا کہ اُسے کیا کیا کرنا ہے۔ جیپ ڈھلان سے نیچے اُتارنے والی جگہ پر رکھا ہوا پتھر دیکھا جسے گھاس ڈال کر چھپایا ہوا تھا۔ پھر وہ پتھر بھی دیکھا جس کے نزدیک پہنچ کر باہر کود جانا ہے اپنا دایاں ہاتھ اوپر اُٹھا کر اُس نے ''تھمز اپ'' کیا۔

دور جا کر شکیلہ ایک بڑے درخت کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔ منصور کی نظر وہاں نہیں پڑ سکتی تھی لیکن وہ منصور کو پورا ایکشن کرتے ہوئے دیکھ سکتی تھی۔ اُس کا دل دھک سے رہ گیا جب اُس نے دیکھا کہ منصور نے جیپ کو ڈھلان پر سے لُڑھکایا اور آگے جا کر جیپ سے باہر کود گیا۔

جیپ ایک درخت سے ٹکرائی۔

شارٹ ختم ہوا تو منصور کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

شکیلہ فلم سٹی کے بڑے گیٹ کی طرف چل پڑی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ منصور کو کیسے منائے۔ گیٹ کے پاس بس سٹینڈ پر کھڑی تھی۔ بس کے اندر جا کر دیکھا ایک سیٹ پر خاتون اکیلی ہی بیٹھی تھی۔ وہ جا کر اُس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ''کیا بات ہے آج لنچ سے پہلے ہی چل پڑی۔'' شکیلہ نے خاتون سے پوچھا۔

''ڈاکٹر سے ٹائم لیا ہوا ہے اِس لئے۔'' خاتون نے جواب دیا۔

''خیریت تو ہے۔؟''

''ہر مہینے اِن تین چار دنوں میں پتہ نہیں کیوں سخت درد ہونے لگتا ہے۔ دوا کھانے سے بھی فرق نہیں پڑ رہا۔''

''ہمیں شملہ سے آئے کتنے دن ہو گئے ہوں گے؟''

''ڈیڑھ دو مہینے تو ہو گئے ہوں گے۔''

''کیا؟'' شکیلہ چیخ مارتے مارتے رُک گئی۔ ''ڈیڑھ دو مہینے؟''

''اور نہیں تو کیا۔''

یا اللہ مجھے تو خیال ہی نہیں آیا۔ جب سے میں وہاں سے آئی ہوں۔۔۔ کتنی بے وقوف ہوں میں''

خاتون مسکرانے لگی۔ بولی۔ ''اُستاد منصور نے داؤ کھیلا لگتا ہے۔ میری مان فوراً نکاح کر لے۔''

''زندگی اِتنی آسان نہیں خاتون بیگم۔'' شکیلہ نے لمبی سانس لے کر کہا۔

''ہم خود ہی اُسے مشکل بنا لیتے ہیں۔''

''پہلے تو مجھے کسی ڈاکٹر کے پاس جا کر ٹیسٹ کروانا پڑے گا۔''

''ابھی چل میرے ساتھ۔ بہت اچھی ڈاکٹر ہے جس کے پاس میں جا رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔''

ڈاکٹر نے دوسرے روز دوبارہ شکیلہ کو بُلایا اور کنفرم کر دیا کہ وہ پریگنینٹ ۔شکیلہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اِس بات کو منصور تک پہنچانا لازمی تھا لیکن کیسے؟ وہ کیا کہے گا؟ میں کیا کہوں گی؟ گھر میں اِس بات کا پتہ چلے گا تو کیا ہوگا؟ اُسے محسوس ہوا کہ وہ ایک چکی میں پس رہی ہے۔اُس نے پھر منصور کو فون کرنا شروع کیا، لیکن ہر بار منصور نے فون کاٹ دیا۔ وہ اُس سے مایوس ہو چکا تھا۔

آخر شکیلہ نے ایسوسی ایشن کے آفس جا کر جسونت سنگھ سے بات کرنے کی سوچی۔ وہ جب وہاں پہنچی تو اُسے لگا جیسے منصور وہاں بیٹھا ہوا جسونت سنگھ سے باتیں کر رہا ہے۔اس کی پیٹھ اُس کی طرف تھی۔ لیکن جب اُس کی آواز سنی تو سمجھ گئی کوئی اور ہے وہ نوجوان جوش میں آیا ہوا جسونت سنگھ سے کہہ رہا تھا۔ ''مجھے دو برس ہو گئے اِس آفس کے چکّر لگاتے ہوئے، مجھے ایسوسی ایشن کا ممبر کیوں نہیں بنایا جاتا؟'' جسونت نے بتایا۔ ''ہمارے پاس پہلے ہی زیادہ ممبر ہیں۔ پھر بھی جلدی ایک میٹنگ ہونے والی ہے جس میں سوچا جائے گا کہ کتنے نئے ممبر بنائے جائیں۔ ہوسکتا ہے اُن میں آپ کا نام بھی آجائے۔'' وہ نوجوان بڑا پریشان تھا۔ بڑبڑاتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔ شکیلہ جسونت کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔ جسونت نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے شکیلہ تمہارا چہرہ اتنا اُترا ہوا کیوں ہے؟''

''جسونت بھائی، میں آپ کے پاس ایک ریکوسٹ لے کر آئی ہوں۔''

''کہو''

''منصور مجھ سے خفا ہے۔ غلطی میری ہے۔ وہ مجھ سے بات نہیں کرتا۔ لیکن میرا اُس سے ملنا بہت ضروری ہے۔ وہ فون کٹ کر دیتا ہے۔ میں چاہتی ہوں آپ اپنے طور سے اُسے یہاں بلائیں۔ اُسے شک نہیں ہوگا کہ آپ نے اُسے میرے لئے یہاں بلایا ہے۔''

اُس کی بات سن کر جسونت کچھ سوچنے لگا۔

شکیلہ پھر بولی۔ ''آپ کو خدا کا واسطہ ہے۔ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں۔ میں جانتی

ہوں آپ کے کہنے پر وہ آجائے گا۔ یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

جسونت نے فیصلہ کیا کہ وہ فون کرے گا۔ اُس نے منصور کا نمبر ملایا۔

"کیا بات ہے جسونت؟" منصور نے پوچھا۔

"تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" "یہاں کب آسکتے ہو۔۔۔ٹھیک ہے تمہارا انتظار کروں گا۔"

جسونت نے فون بند کیا اور شکیلہ ڈیڑھ بجے آفس پہنچ گئی۔ جسونت نے اُسے اندر والے کمرے میں بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد منصور بھی آگیا۔ جسونت اُسے اندر کمرے میں لے گیا۔ شکیلہ کو دیکھ کر منصور حیران و پریشان ہوگیا۔ جسونت نے کہا۔ "معاف کرنا منصور۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ شکیلہ تم سے ضروری بات کرنا چاہتی ہے۔ تم یہاں بیٹھ کر باتیں کرو۔ میں دھیان رکھوں گا کوئی اندر نہ آئے۔ کہہ کر جسونت چلا گیا۔

منصور جہاں کھڑا رہا۔ شکیلہ دھیرے دھیرے اُس کے قریب آئی اور اُس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "میرے حالات نے مجھے پاگل کر دیا ہے منصور۔ مجھے پتہ ہے۔۔۔ میں مانتی ہوں میں نے تمہیں بہت دکھ دیا ہے۔ میں نے تمہیں یہ بھی تو نہیں بتایا کہ میں نے تمہیں اتنا غم کیوں دیا۔ یہ بھی ایک مجبوری تھی۔"

منصور کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

شکیلہ کہتی جارہی تھی۔ "تمہیں اِتنا درد و غم دے کر میں تم سے زیادہ تکلیف محسوس کر رہی ہوں۔ تم میرے غم کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں نے جتنا پیار تم سے لیا ہے اُس سے زیادہ دیا ہے۔ تم سے جدا رہ کر جینا میرے لئے ناممکن ہے۔ اب تو مرنا بھی میرے ہاتھ میں نہیں۔ تمہیں یہ بتانا ضروری ہے کہ میں پریگنینٹ ہوں۔"

منصور بُت بنا ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھ رہا تھا۔ شکیلہ کے ہاتھ سے اُس کا ہاتھ بِنا کسی تردد کے چھوٹ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا شکیلہ نے ابھی ابھی کیا کہا ہے؟ اُس کا کیا مطلب ہے؟ کیا وہ سچ کہہ رہی ہے؟ وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے؟ وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "اگر تم مجھ سے شادی ہی

نہیں کرنا چاہتیں تو پھر یہ بات سنانے کی کیا ضرورت تھی، چپ چاپ جا کر اَبارشن کروا لیتیں۔"

کچھ دیر تک خاموش رہ کر شکیلہ گردن جھکائے ہوئے بولی۔" میں ابارشن نہیں کروانا چاہتی۔"

"کیوں؟" منصور نے پوچھا۔

"دل نہیں مان رہا۔"

"تم صرف مجھے ہی دھوکے میں نہیں رکھ رہی، خود کو بھی دھوکا دے رہی ہو"

"اب بتانا ہی پڑے گا۔ میں تم سے جدا ہو کر نہیں رہ سکتی۔"

"میں تو تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

"کب؟"

"کل"

"میں آؤں گا۔"

پھر اور کوئی بات نہیں ہوئی۔

دوسرے دن موبائل پر دونوں نے ٹائم فکس کر لیا۔

منصور ٹھیک وقت پر اُن کے گھر پہنچ گیا۔

اُس کے آنے سے پہلے شکیلہ اور اماں کے درمیان کافی بے نتیجہ باتیں ہو چکی تھیں۔ شکیلہ مایوس اور غمگین تھی۔ اُسے احساس تھا منصور اُن کے گھر سے دل برداشتہ ہو کر جائے گا۔ پھر بھی اُسے یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس ماحول میں، کن حالات میں جی رہی ہے اور وہ کیوں اپنے بارے میں اُسے کچھ نہیں بتاتی تھی۔

حمیدہ بیگم اور افضل خاں وقت سے پہلے ہی باہر والے کمرے میں بیٹھ گئے تھے۔ منصور نے گھنٹی بجائی تو شکیلہ نے ہی دروازہ کھولا۔ منصور اندر آیا۔ اسلام علیکم کہہ کر وہ ایک طرف بیٹھ گیا۔ شکیلہ بھی بیٹھ گئی۔ حمیدہ بیگم منصور کو دیکھ کر خوش ہوئی۔ افضل خاں دل ہی دل میں اُسے گالیاں دے رہا تھا۔ منصور نے افضل خاں کو دیکھا تو اُسے لگا کہ وہ کوئی گوشت بیچنے والا دوکاندار

ہے۔

اماں کافی موٹی تھی لیکن اُسے محسوس ہوا کہ جوانی میں کافی خوبصورت رہی ہوگی۔لپ اسٹک اور کاجل کی وجہ سے طبیعت کی شوقین دکھائی دیتی تھی۔ منصور دل کے اندر کچھ اَپ سیٹ سا ہوگیا۔گویا مغالطے سے کسی غلط پتے پر آ گیا ہو۔شکیلہ جانتی تھی منصور کچھ ایسا ہی سوچ رہا ہوگا۔

حمیدہ بیگم نے بولنے کی پہل کی۔ ''منصور بیٹا تمہارے بارے میں شکیلہ نے ہمیں بہت کچھ بتادیا ہے۔ہمیں خوشی ہے کہ تم ہم سے ملنے آئے۔تمہارا جی جب چاہے شکیلہ سے ملنے آجایا کرو۔''

اُفضل خاں نے بھی بات کرنی ضروری سمجھی۔ ''میں نے تمہاری بہت سی فلمیں دیکھی ہیں۔ تم سچ مچ بہت بہادر ہو۔ بے شک تمہاری شکل فلموں میں دکھائی نہیں دیتی لیکن لوگوں کو پتہ ہوتا ہے کہ اصلی ہیرو یہ کام نہیں کرسکتے جو ڈپلیکیٹ اُن کے لئے کرتے ہیں۔کرتے تو تم لوگ ہو مگر تالیاں اُن کے لئے بجتی ہیں۔'' افضل خاں تعریف کرتے کرتے طنز پر آ گیا تھا۔ پھر بھی منصور کو مسکرانا پڑ رہا تھا۔

اُسی وقت شمی ٹرے میں چائے لے کر آ گئی۔شکیلہ نے کہا۔ ''یہ میری چھوٹی بہن ہے۔'' شمی نے داہنا ہاتھ اُٹھا کر سلام کیا۔منصور نے سلام کا جواب دیا۔شمی بہت خوش تھی۔ منصور کو دیکھ کر وہ چائے دیتے ہوئے سوچ رہی تھی شکیلہ اور منصور کی جوڑی لاجواب ہے۔

چائے کا پہلا گھونٹ بھر کر منصور نے بات شروع کی۔ ''میں آپ سے شکیلہ کا ہاتھ مانگنے آیا ہوں۔''

اُفضل خاں اور حمیدہ بیگم نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر اُنہوں نے شکیلہ کی طرف دیکھا۔گردن جھکائے وہ اُنہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ منصور نے اُنہیں چپ دیکھ کر آگے بولنا شروع کیا۔ ''میرے گھر والوں نے سب کچھ مجھ پر چھوڑ رکھا ہے کہ میں اپنی پسند کی لڑکی سے..........''

حمیدہ بیگم اُس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''منصور بیٹا، تمہاری شرافت دیکھ کر ہم نے فیصلہ کیا

ہے کہ تم دونوں چوری چھپکے ملنے کی بجائے جب چاہو اِس گھر کے اندر مل سکتے ہو۔ ہمیں تم دونوں کے ملنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

منصور کی سمجھ میں نہیں آیا کہ شکیلہ کی اماں کے کہنے کا کیا مطلب ہے۔ یہ تو اُس کی بات کا جواب نہیں۔ تذبذب میں اُس نے شکیلہ کی طرف دیکھا۔ شکیلہ جانتی تھی اِسی لئے اُس نے اُسے یہاں بلایا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ وہ کس جہنم میں رہتی ہے۔

جب منصور نے دیکھا کہ شکیلہ بھی کچھ بولنے کو تیار نہیں تو اُس نے حمیدہ بیگم اور افضل خاں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ مجھے اتنی عزت دے رہے ہیں۔ ٹھیک بھی تو ہے کہ آخر ہم دونوں چھپ کر کیوں ملیں جب کہ ہم شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

حمیدہ بیگم اور افضل خاں دونوں سٹپٹائے۔ شکیلہ نے اُن کی گھبراہٹ کو نوٹ کیا۔ اُس نے اندر والے دروازے کے پیچھے کھڑی شمی کی طرف دیکھا وہ وہاں سب کی نظروں سے بچ کر کھڑی باتیں سن رہی تھی۔ اُسے باتوں کا مطلب سمجھ میں آ رہا تھا۔

افضل خاں نے راست مُدعا بیان کرنے کی غرض سے کہا۔ "یہ شادی وادی کی بات بھول جاؤ برخوردار۔ تمہیں آم کھانے سے غرض ہے کھاؤ، پیڑ مت گنو۔"

منصور نے کہا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

حمیدہ بیگم کہنے لگی۔ "منصور بیٹا، ہمارے حالات ایسے ہیں کہ ہم نہیں چاہتے کہ شکیلہ تم سے شادی کر کے گھر بسائے۔ ہاں تم دونوں جب چاہو یہاں مل سکتے ہو۔"

منصور کو شاک لگا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں تو شادی کی بات کرنے یہاں آیا ہوں۔"

"وہ نہیں ہو سکتا۔" افضل خاں نے کہا۔ جیسے فیصلہ سنا رہا ہو۔ "ہماری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ تمہارا منشا تو اس کے ساتھ ملنے جلنے سے ہے نا۔ تو ملو۔ سو بار ملو۔ ہم کباب میں ہڈی نہیں بنیں گے۔"

منصور اندر ہی اندر اپنا غصہ روکتے ہوئے بولا۔ "ملنے سے کیا مطلب ہے آپ کا؟ میں

اتنا بے غیرت نہیں ہوں۔ میں شکیلہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں، شادی! وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

افضل خاں اور حمیدہ کو جیسے بچھو نے ڈنک ماردیا ہے۔ یہاں تک تو اُنہوں نے نہیں سوچا تھا۔ شکیلہ نے گھبرا کر اُن کی طرف دیکھا۔ دروازے کے پیچھے کھڑی شمی بھی کانپ اُٹھی۔ افضل خاں نے اُونچی آواز میں پوچھا۔ "تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے؟"

"میں جانتا ہوں۔ اِس نے خود مجھے بتایا ہے۔" منصور کی آواز بھی اُتنی ہی اونچی تھی۔

"کیا یہ سچ کہہ رہا ہے؟" حمیدہ بیگم نے خشم آلود آواز میں پوچھا۔

شکیلہ نے جھکی ہوئی گردن ہلا کر ہاں کہا۔

"پھر بھی تم دونوں کی شادی نہیں ہو سکتی" حمیدہ بیگم نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"تو پھر اُس بچے کا کیا ہوگا؟" منصور نے پریشان ہو کر پوچھا۔

افضل خاں نے جواب دیا۔ "سنو منصور میاں! اگر تم دونوں کا نکاح ہو چکا ہوتا تو یہ بچہ تمہارا ہی تھا۔ اِس وقت تو یہ ہمارا ہے۔ ہماری مرضی ہوگی تو اِسے اِس دنیا میں آنے دیں گے۔ نہیں مرضی ہوگی تو نہیں آنے دیں گے۔"

منصور طیش میں آ کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ بے دریغ تلخ لہجے میں بولا۔ "یہ بچہ میرا ہے۔ اس پر میرا حق ہے۔ اگر اُسے کچھ ہو گیا تو......" وہ کبھی افضل خاں کو دیکھتا کبھی حمیدہ بیگم کو۔ آخر وہ شکیلہ کے نزدیک جا کر کھڑا ہو گیا اور کانپتی آواز میں کہنے لگا۔ "شکیلہ میں صاف صاف کہے دیتا ہوں اگر اُس بچے کو کچھ ہوا تو......تو پتہ نہیں میں کیا کر بیٹھوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

افضل خاں اور حمیدہ بیگم نے ایسا فتنہ فساد پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دونوں حواس باختہ ہو گئے تھے۔ شکیلہ اُٹھی اور اندر چلی گئی۔ شمی گھبرائی ہوئی تھی کہ اب کیا ہوگا۔ وہ اندر گئی تو دیکھا شکیلہ بیڈ پر بیٹھ کر رو رہی تھی۔ شمی نے اُسے اپنی بانہوں میں لے کر کہا۔ "آپا، میری بات مان، منصور کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤ۔ تمہیں دوبارہ منصور جیسا کبھی نہیں ملے گا۔" شکیلہ نے

جواب دیا۔ ''میں تمہیں اِس جہنم میں اکیلی چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔''

......☆......

بازار میں آ کر بھی منصور کا جسم کانپ رہا تھا۔لہو میں اتنی گرمی تھی کہ برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ سُوجھ نہیں رہا تھا۔فٹ پاتھ پر ایک طرف وہ دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔آس پاس لوگ آ جا رہے تھے لیکن وہ کسی کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ایک گلی کے سرے پر کھڑے ہو کر اُس نے آنکھوں میں آیا ہوا پانی پونچھ ڈالا۔ یہ غصّے اور غم کی شدت کے آنسو تھے۔اپنی لاچاری پر وہ تلملا رہا تھا۔اُسے محسوس ہو رہا تھا وہ ایک مضبوط پھندے میں پھنس گیا ہے۔اُس کے ماتھے پر پانی کی ایک بوند پڑی تو اُس نے اوپر دیکھا۔اُسے اب معلوم ہوا کہ دھوپ غائب ہو چکی ہے اور آسمان پر کالے بادل اُمڈ رہے ہیں۔وہ پھر آگے چل پڑا۔

اُس کے آگے ایک بزرگ شخص دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔وہ لگاتار کچھ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔جب منصور بالکل اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تو اُسے اُس بزرگ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ سنائی دینے لگے۔وہ کہہ رہا تھا ''گلتی ہی نہیں، گلتی ہی نہیں'' منصور کو اُن لفظوں کو مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر بھی وہ سنتا جا رہا تھا۔ ''گلتی ہی نہیں، گلتی ہی نہیں'' اُس وقت سامنے سے دو نوجوان لڑکے بھاگتے بھاگتے آئے اور اُنہیں کراس کر کے نکل گئے۔اُن میں سے ایک لڑکا کراس کرتے ہوئے بزرگ کے ساتھ ٹکرایا اور آگے نکل گیا۔بزرگ شخص نیچے گر گیا۔منصور نے اُٹھنے میں اُن کی مدد کی۔ اُٹھتے اٹھتے بھی بزرگ کے مُنہ سے نکل رہا تھا۔ ''گلتی ہی نہیں، گلتی ہی نہیں'' جب وہ ٹھیک ٹھاک ہو کر چل پڑا تو منصور سے رہا نہیں گیا۔اُس نے پوچھا۔ ''انکل یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں گلتی ہی نہیں، گلتی ہی نہیں۔''

بزرگ نے جواب دیا۔ ''مونگ کی دال سو روپے کلو ہو گئی وہ تو ہم خرید نہیں سکتے۔سرکار نے اعلان کیا کہ راشن کی دکانوں سے ۶۰ روپے کلو کے حساب سے ملے گی۔کل میں نے وہاں جا کر دو تین گھنٹے لائن میں کھڑے ہو کر آدھا کلو دال خریدی۔ آج صبح اُسے بہت اُبالا مگر وہ گلتی ہی نہیں۔تیس روپے بھی گئے اور مٹی کا تیل بھی پھونک دیا۔گلتی ہی نہیں'' اُس کی آواز میں گہرا دکھ

تھا۔شکوہ تھا، لاچاری تھی۔ بڑبڑاتا ہوا وہ آگے نکل گیا۔اُس کے درد کی شدت دیکھ کر منصور دم بخود ہوکر وہیں کھڑا رہ گیا۔ لمحے بھر کے لئے اُسے اپنا دکھ بھول گیا۔وہ سوچنے لگا غم کی شدت کسی کو بھی پاگل بنا سکتی ہے۔چاہے وہ عشق میں ناکام رہنے کا کرب ہو یا دال نہ گلنے کا دُکھ۔اُس کے ماتھے پر دوچار بوندیں پڑیں تو وہ چونکا۔اوپر دیکھا تو بھرے ہوئے بادل برسنے پر آمادہ تھے۔بارش شروع ہوگئی۔بارش تیز ہوتی جارہی تھی۔پھر وہ اتنی موسلادھار ہوئی کہ ہر طرف پانی ہی پانی ہوگیا۔وہ جس جگہ کھڑا تھا، وہ سیڑھیاں بھی پانی میں ڈوبنے لگیں،اُس نے سوچا وہاں کھڑے رہ کر بھیگنے سے اچھا ہے بھیگتے ہوئی وہاں سے نکل جانا۔وہ ٹخنوں سے اوپر چڑھے ہوئے پانی میں چلنے لگا۔چند لمحوں میں وہ تربتر ہوگیا۔وہ رکا نہیں چلتا رہا۔

......☆......

دوتین دنوں کے بعد

فلم سٹی سٹوڈیو میں شکیلہ سیڑھاں چڑھ کر اوپر آئی اور میک اَپ روم کی طرف چل پڑی۔ اُس نے دیکھا دائیں طرف تھوڑی دوری پر ریلنگ سے ٹیک لگائے منصور کھڑا ہے۔وہ اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔کچھ پل دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔دونوں اُداس تھے۔آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شکیلہ اُس کے قریب جاکھڑی ہوئی۔کچھ دیر تک دونوں کچھ نہیں بولے۔پھر شکیلہ نے بات شروع کی۔

"مجھے پتہ تھا آج تم یہاں ملوگے۔"

مجھے بھی معلوم تھا۔"

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو منصور؟"

"میں کیا کہوں۔میں تو حیران ہوں تم اُس گھر میں کیسے رہتی ہو۔تیرا ابا تو بالکل جانور لگا مجھے۔"

"وہ میرا ابا نہیں ہے۔"

تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔وہ تمہارا ابا ہو ہی نہیں سکتا۔تمہاری ماں کے بارے میں میرا خیال

ہے......" کہتے کہتے منصور رُک گیا دونوں چُپ تھے۔ پھر شکیلہ نے پتھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میری ماں جوانی میں کوٹھے پر بیٹھتی تھی، طوائف تھی۔"

منصور چپ رہا۔

"میں تم سے اب کوئی بات چھپانا نہیں چاہتی۔" شکیلہ کی آواز میں مضبوط ارادے کی جھلک تھی۔"

"میں تمہیں اُس جہنم سے نکالنا چاہتا ہوں۔ نکاح کر کے اپنے گھر لانا چاہتا ہوں۔"

"اگر میں اپنے گھر میں رہ کر اپنی زندگی خراب نہیں کروں گی تو میری چھوٹی بہن کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ ساتھ ہی میری ماں ہے۔ آخر میری ماں ہے۔ اُس کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہے۔ اگر میں وہاں نہیں رہوں گی تو وہ جانور اُسے کھا جائے گا۔"

"پھر میری زندگی کیوں برباد کی تم نے؟" منصور کے لہجے میں درد و کرب تھا۔

"تمہارے ساتھ میری زندگی بھی برباد ہوئی ہے۔ دل کے ہاتھوں مجبور تھی میں۔ میں مان لیتی ہوں تمہارے غم کی وجہ میں ہوں لیکن میں خود بھی جس دکھ میں ڈوبی ہوں اُس کو کوئی آر پار نہیں۔ اِتنی تکلیف برداشت کرنے کے بعد بھی پیار کے جو لمحے تم نے مجھے دیئے ہیں اُن کی وجہ سے مجھے زندگی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں سب کچھ سہہ لوں گی۔"

"تم خودغرض ہو، فریبی ہو۔"

"یہ غلط ہے، میں نے اپنا سب کچھ دے کر تم سے کچھ لیا ہے۔"

"تمہارا پیار ایک سودا تھا۔"

اُسی وقت میک اَپ روم کا دروازہ کھلا اور میک اَپ مین نے آواز دی۔ "جلدی آیئے بھائی۔ دیر ہو رہی ہے۔"

دونوں میک اپ رُوم کی طرف چل پڑے۔ دونوں تناؤ میں جکڑے ہوئے تھے۔

......☆......

شوٹنگ کے لئے لایا گیا کالا گھوڑا کچھ زیادہ ہی منہ زور ہو گیا تھا۔ پچھلے پاؤں پر کھڑے ہو کر

وہ اگلے پاؤں کو ہوا میں یوں چھٹک رہا تھا جیسے جنگ پر آمادہ ہو۔ اُس کے آگے پیچھے جانے کی کوئی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ ڈائریکٹر نے ایکشن ڈائریکٹر کھنہ سے کہا۔ ''یہ گھوڑا قابو میں آئے گا۔؟''

''آئے گا کیوں نہیں۔ وہ دیکھئے اُسے قابو میں کرنے والا آ گیا۔'' منصور نے اُن کے پاس آکر ''گڈ مارننگ'' کہا۔ وہ میک اَپ کر کے اور کاسٹیوم پہن کر ہی آیا تھا۔ ڈائریکٹر نے اُس سے کہا۔ ''پہلے اِس گھوڑے سے پہچان کر لو تو ٹھیک رہے گا۔ منصور بولا۔ ''سر آپ بے فکر رہیئے۔ یہ گھوڑا مجھے پہچانتا ہے۔ میں کئی بار اِس کی سواری کر چکا ہوں۔''

کھنہ نے منصور سے کہا۔ ''چلو آؤ تمہیں شارٹ سمجھا دیتا ہوں۔'' اُسی وقت شکیلہ بھی آ گئی۔ کھنہ نے کہا ''تم بھی آ جاؤ۔''

شکیلہ نے براؤن کلر کی جین اور سفید ٹاپ پہنا ہوا تھا۔ بوائے کٹ والی بالوں کی وِگ بھی پہنی تھی۔ یہ سب کچھ اُس پر خوب جچ رہا تھا۔ وہ بہت سمارٹ لگ رہی تھی۔ منصور دیکھتا ہی رہ گیا۔ شکیلہ اُس سے نظر نہیں ملا رہی تھی لیکن اپنے چہرے پر اُس کی نظریں محسوس کر رہی تھی۔

ایکشن ڈائریکٹر کھنہ دونوں کو گھوڑے کے قریب لے گیا اور سمجھانے لگا۔ ''منصور، تمہیں دور سے بھاگتے ہوئے آنا ہے اور چھلانگ لگا کر گھوڑے پر بیٹھ جانا ہے۔ شکیلہ تھوڑی دور آگے کھڑی رہے گی۔ تم نے اُسے جھٹکے سے اُٹھا لینا ہے اور اپنے آگے بٹھا لینا ہے۔ کیمرے تم دونوں کے پیچھے ہیں اس لئے اِس بات کی پرواہ نہیں کرنا کہ تمہارے چہرے کیمروں میں نظر آ جائیں گے۔ بس شکیلہ کو اُٹھا کر تیزی سے گھوڑا دوڑاتے ہوئے اُن درختوں کے پیچھے لے جانا ہے، سمجھ گئے۔''

''جی ہاں'' منصور نے کہا۔ لیکن دل ہی دل میں وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اُس نے شکیلہ کی طرف دیکھا اُس کے چہرے پر ذرا بھی ڈر نہیں تھا۔

اُدھر کالا گھوڑا اگلے پاؤں اُٹھائے پُھر پُھر کرتا ہوا للکار رہا تھا۔

کھنہ نے کہا۔ ''مجھے ایک ریہرسل کر کے بتاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ ڈائریکٹر کی جانب جانے لگا۔ کھنہ نے کہا۔ ''ماسٹر جی شکیلہ کے ساتھ ریہرسل کرنے کی ضرورت نہیں شارٹ او۔کے ہوگا۔

آپ بے فکر رہیں۔ میں گھوڑے پر بیٹھ کر کیمرہ مین کو پوری موومنٹ دکھا دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔"

جب کھنہ وہاں سے چلا گیا منصور نے ناراض ہو کر شکیلہ سے کہا۔ "تمہیں کیا ضرورت تھی اِس شوٹنگ میں آنے کی؟"

"کیوں؟" شکیلہ نے حیران ہو کر پوچھا

"تمہارے لئے یہ شارٹ خطرناک ہو سکتا ہے۔"

پہلے تو شکیلہ نہیں سمجھی۔ پھر جلدی ہی جب بات سمجھ میں آئی تو ہلکے سے مسکرائی۔

"تمہیں کوئی ضرورت نہیں میری فکر کرنے کی۔ تم تو کہتے ہو میں نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔ پیار نہیں سودے بازی کی ہے۔"

منصور کو غصہ آنے لگا تھا۔

شکیلہ نے پھر کہا۔ "مجھ سے زیادہ تمہیں اُس کی فکر ہے جو ابھی اِس دنیا میں آیا ہی نہیں۔ وہ تمہارا اپنا ہے، سگا ہے۔"

منصور نے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔ "تمہارے گھر والوں نے تمہیں میرے خلاف بہکا دیا ہے۔ تم مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہو۔ تم چاہتی ہو......"

اُدھر سے کھنہ کی آواز آئی۔ "منصور گھوڑے پر بیٹھ جاؤ اور ایک پوری موومنٹ دکھا دو۔"

منصور اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گھوڑے کے پاس جا کر اُس نے گھوڑے والے سے لگام اپنے ہاتھ میں لے لی۔ گھوڑا بھڑک کر اپنے اگلے پاؤں اُٹھانے لگا۔ منصور نے لگام کھینچی اور اُس کی گردن پر تھپتھپایا۔ گھوڑے کو ہاتھ پہچانے ہوئے لگے۔ اب وہ پچھلے پاؤں اُٹھا کر چھٹپٹانے لگا تو منصور نے اُس کے پیٹ پر دُلارا اور تھپتھپایا۔ گھوڑا ڈھیلا پڑنے لگا۔ منصور کوئی بیس پچیس قدم پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے دیکھا کھنہ، ڈائریکٹر، کیمرہ مین سب اُسی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وہ ایک دَم بھاگ کر گیا اور چھلانگ لگا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ گھوڑا چھٹپٹانے کو ہوا مگر منصور نے موقع نہیں دیا۔ اُس کے پیٹ پر اس نے ایڑیوں

سے دُلارا، لگام ڈھیلی چھوڑی اور دونوں گھٹنے کس دیئے گھوڑا ایک دم بھاگا۔ لگام سے دم دیتے ہوئے منصور نے پھرایڑیوں سے اشارہ کیا۔ گھوڑا اور بھی ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ دور درختوں کے پیچھے جا کر منصور نے لگام کھینچ کر گھوڑے کو روک لیا۔

کھنہ نے ڈائریکٹر سے پوچھا۔ ''وہ ٹھیک راستے سے گیا؟''

''میرے لئے ٹھیک ہے۔''

کیمرہ مین نے تھم اَپ'' کیا۔

منصور گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے واپس آ گیا۔ کھنہ نے اُسے کہا۔ ''موومنٹ ٹھیک تھی۔ تم اب شکیلہ کو بھی سمجھادو۔ پہلا ٹیک ہی پرفیکٹ ہونا چاہیئے۔

منصور نے گھوڑے کو اُس جگہ پر کھڑا کر دیا۔ گھوڑے والے نے لگام تھام لی۔ منصور نیچے اُتر آیا۔ اُس نے شکیلہ کو بیس، پچیس قدم آگے کھڑا کر دیا اور بولا'' جب میں تمہیں اُٹھانے لگوں تو تم ذرا اُچک کر......''

مجھے پتہ ہے منصور میں کئی بار ایسا شارٹ کر چکی ہوں۔''

''میں تمہیں یاد کرار ہا ہوں۔ تمہارے لئے ہوشیار رہنا ضروری ہے۔''

''میں جانتی ہوں تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔''

منصور نے خشمگیں نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

اُسی وقت کھنہ اُن کے قریب آ کر بولا۔ ''شکیلہ شارٹ دیتے ہوئے تمہیں تھوڑی ایکٹنگ بھی کرنی ہے۔ ہیرو نہیں ویلن ہے۔ یہ زبردستی تمہیں اُٹھا کر لے جا رہا ہے۔ تم تھوڑا چھٹپٹانے کی کوشش کرنا۔ ایسا نظر آنا چاہیئے جیسے تم اس کے ہاتھوں سے چھوٹنے اور نیچے گرنے کی کوشش کر رہی ہو۔''

''او۔کے'' شکیلہ نے کہا۔

''منصور شارٹ لیں؟'' کھنہ نے پوچھا۔

''ہم تیار ہیں۔'' منصور نے کہا۔ وہ دل ہی دل میں خائف تھا۔ اُسے شکیلہ کی فکر تھی اور

شکیلہ کو بے فکر دیکھ کر اُسے غصہ آرہا تھا۔ مگر کیا کرتا؟ وہ وہاں جا کر کھڑا ہو گیا جہاں سے بھاگنا شروع کرنا تھا۔ اُس نے گھوڑے والے کو وہاں سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔

یونٹ کے سبھی لوگ اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔

کھنہ نے ڈائریکٹر کی طرف دیکھا۔

ڈائریکٹر نے اشارے سے کیمرہ مین سے پوچھا۔

کیمرہ مین نے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اُٹھایا۔

منصور تیار تھا۔ شکیلہ بھی۔

تجربہ کار گھوڑا اِن لمحوں کی خاموشی کو پہچانتا تھا۔

کھنہ نے پورا زور لگا کر کہا ''رول!''

''رولنگ''

''کیمرہ!''

''ایکشن''

منصور سرعت سے بھاگا اور اُچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

گھوڑا بھاگا۔

شکیلہ تیار تھی۔ وہ تھوڑی آگے بڑھی۔ گھوڑا اُس کے نزدیک پہنچا۔ منصور نے پھرتی سے شکیلہ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بغل سے اُسے اُٹھانے لگا۔ شکیلہ اُچکی۔ منصور نے اُٹھا لیا۔ شکیلہ کا جسم یوں تڑپ رہا تھا جیسے اُسے زبردستی اُٹھایا گیا ہے۔ منصور نے اُسے زانوؤں پر بٹھایا اور گھوڑے کو اور بھی دم دیا۔

کیمرہ مین روم ایڈجسٹ کر رہا تھا۔

ڈائریکٹر اور کھنہ بُت بنے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

گھوڑا بھاگ رہا تھا۔

اچانک منصور کو محسوس ہوا کہ شکیلہ نیچے گر رہی ہے۔ وہ چیخا۔ ''مجھے پکڑو ورنہ گر جاؤ گی۔''

''میں پکڑوں گی تو شارٹ خراب ہو جائے گا۔'' شکیلہ نے گرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

منصور پھر چیخا۔ ''مجھے پکڑ''۔

''نہیں، میں نہیں پکڑوں گی۔''

''پکڑ''

''نہیں''

گھوڑا درختوں کے قریب پہنچ رہا تھا۔

سب دیکھ رہے تھے۔

منصور نے شکیلہ کو گالی دی۔ ''حرامزادی مجھے پکڑ''

''نہیں پکڑنا مجھے۔''

''پکڑ''

''نہیں''

گھوڑا درختوں کے پاس پہنچ گیا۔ منصور نے لگام کھینچی۔

دفعتاً شکیلہ گھوڑے سے نیچے گر گئی۔

دونوں کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

منصور نے فوراً لگام کو دوسری طرف موڑا اور گھوڑے کا رخ بدل دیا۔

شکیلہ گھوڑے کے پاؤں کے نیچے آتی آتی بچ گئی۔

شارٹ بہت نیچرل تھا۔

گھوڑا کھڑا ہو گیا تھا۔

کیمرہ مین نے تھمز اپ کیا۔

کھنہ نے چیخ کر کہا۔ ''او۔کے''

ڈائریکٹر بولا۔ ''ویری گڈ۔''

منصور کود کر گھوڑے سے اُترا۔ پھرتی سے شکیلہ کو اُٹھنے میں مدد دی۔ شکیلہ اُٹھتے اُٹھتے کہہ رہی تھی۔ ''کچھ نہیں ہوا۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔''

''حرامزادی میں تجھے جان گیا ہوں۔ تو جان بوجھ کر دم دے رہی ہے۔'' آپے سے باہر ہوا منصور کہے جا رہا تھا۔ ''تاکہ تیرا ابارشن ہو جائے۔ چھٹی ہو جائے تیری۔''

شکیلہ ایک ٹک اُسے دیکھنے لگی۔ اُس کا غصہ دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ ''تمہارے منہ سے گالی کھا کر مجھے اچھا لگا ہے۔ یہ تو مجھے پتہ ہے کہ تم مجھے پیار کرتے ہو لیکن اتنا زیادہ کرتے ہو یہ معلوم نہیں تھا۔ تم یہ سوچو بھی نہیں کہ تم نے مجھے جو تحفہ دیا ہے میں اُس سے چھٹکارا پانا چاہتی ہوں مجھے تو وہ جان سے پیارا ہے۔ میں نے گھر والوں سے کہہ دیا ہے میں ابارشن نہیں کرواؤں گی۔''

کھنہ نے اسٹنٹ سے کہا۔ ''جاؤ تم بھاگ کر درختوں کے پیچھے اور اُن سے کہو واپس آجائیں۔''

منصور کہہ رہا تھا۔ ''افسوس کہ میں تمہارے فریب میں آ گیا۔''

شکیلہ نے عاجزی سے کہا۔ ''میری مجبوری کو سمجھ منصور۔''

''میں سب سمجھ گیا ہوں۔ میرے ساتھ آ کر تمہیں کیا ملے گا۔ آخر میں ہوں تو ایک غریب سٹنٹ مین۔''

''منصور'' شکیلہ نے رنجیدہ ہو کر کہا۔

''تمہیں تو بڑے بڑے امیر لوگوں کے ساتھ عیاشی کرنی ہے، بڑے بڑے ہوٹلوں میں بڑی بڑی کاروں میں بیٹھنا ہے۔ آخر ہو تو ایک طوائف کی بیٹی۔'' یہ کہہ کر منصور گھوڑے کی لگام تھام کر یونٹ والوں کی طرف چل دیا۔

''منصور میری بات سنو۔'' شکیلہ نے پکارا۔

منصور رُکا نہیں۔ چلتا رہا۔

شکیلہ رونے لگی۔

......☆......

آسمان پر گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ لیکن بڑی، ہلکی ہلکی بوندیں گر رہی تھیں۔
حاجی علی درگاہ کی باہر والی سیڑھیوں پر منصور کو بیٹھے ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی۔ اُٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ ایک ٹک سمندر کی لہروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دور دور سے لہریں آتیں اور کنارے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتیں۔ شڑال...... شڑال...... شڑال۔ کون اِن لہروں کو بھیج رہا ہے؟ کیوں بار بار سر پھوڑتی ہیں۔؟ وہ آتی ہی کیوں ہیں؟ منصور سوچ رہا تھا۔ کیا ہم بھی اِسی لئے اِس دنیا میں آتے ہیں کہ حالات سے ٹکرا کر پارہ پارہ ہو جائیں؟ کیا زندگی کا یہی مقصد ہے؟ آج تک تو اُسے اِس مقصد کے تعلق میں کبھی کچھ سوچنا نہیں پڑا تھا مگر پچھلے کچھ دنوں سے اُسے سوائے یاس کے اور کوئی خیال ہی نہیں آ رہا۔
شڑال........... شڑال........... شڑال
اُس نے اُس طرف دیکھا جہاں لہروں کے ہیولے بن بن کر کناروں کی طرف لپک رہے تھے۔ اُس کی نظر اور آگے گئی۔ آگے کچھ نہیں تھا سوائے پانی کے۔ پتہ نہیں چلتا تھا کہ پانی اور آسمان کہاں ایک صورت ہو گئے ہیں۔ وہیں کہیں دور اُسے ایک کالا نقطہ دکھائی دینے لگا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ نقطہ اُس کی جانب آتا جا رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ پاس آتا جا رہا تھا وہ بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ ایک کالے گھوڑے میں بدلتا جا رہا ہے۔ کالا گھوڑا بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ دو دو پاؤں پر اُچھلتا وہ تیزی سے اُس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ پھنکار بھی رہا تھا۔ اُس کی تیز رفتاری منصور کو للکار رہی تھی۔ منصور کے چہرے کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ اُس سے بچنا ناممکن تھا۔ اب گھوڑے کی سپیڈ اور بڑی ہوئی تھی۔ اب وہ منصور کے قریب آچکا تھا۔ دہشت زدہ ہو کر منصور پیٹھ کے بل گر گیا۔ گھوڑے نے اگلے دونوں پاؤں اُٹھا کر اُس کی چھاتی پر دے مارے اور وہیں پیوست کر دیئے۔ منصور نے چیخ ماری لیکن اُس کی آواز حلق میں ہی دَب گئی۔
بہت دنوں سے ہر وقت محسوس کرتا تھا کہ اُس کی چھاتی پر بھاری چٹانیں بیٹھ گئی ہیں، جن کا بوجھ اُس سے اُٹھائے نہیں بنتا۔ سارا دباؤ اُس کے چہرے، اُس کی آنکھوں سے عیاں تھا۔
اُس کی ماں اُسے دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ اُس نے پوچھا۔ "تم اپنی پسند کی لڑکی سے مجھے ملوانا

چاہتے تھے، کیا ہوا؟''

''اُسے بھول جاؤ، اماں۔''

''تمہارے لئے لڑکیوں کی کمی ہے کیا۔''

''ابھی میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

''کیوں؟''

''بس نہیں کرنا چاہتا۔''

''تمہاری بجھی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر میں فکر مند ہوگئی ہوں۔''

''بے کار کی باتیں مت سوچو۔''

''میری بات مان۔ حاجی علی جا کر دعا مانگ۔ اللہ تیرے دل کی مراد پوری کرے گا۔ تیرے ابّو بھی وہاں جایا کرتے تھے۔ تجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ یاد ہے؟''

اُسے یاد آیا وہ ابّو کے ساتھ کئی بار یہاں آیا ہے۔ ابو کئی بار یہاں آ کر روتے تھے۔ اُنہیں روتے دیکھ کر وہ پریشان ہو جاتا تھا۔ اُنہیں کیا غم تھا؟ اُن کے پاس تو سب کچھ تھا۔ نہیں، انسان کے درد و غم کا کوئی آر پار نہیں، کوئی کنارہ نہیں۔

ماں کی بات اُس نے مان لی تھی۔ دو تین سو روپیوں کی ریزگاری وہ ساتھ لے آیا تھا اور سڑک سے درگاہ تک جتنے غریب بیٹھے تھے سب کو کچھ نہ کچھ دیا تھا۔ پھر بھی دل کا سکون ندارد تھا۔ چھاتی پر چٹانیں تھیں۔ گھوڑے کے پاؤں وہاں جمے ہوئے تھے۔

وہ سیڑھیوں پر سے اُٹھا اور اندر چلا گیا۔ لوگ پھول چڑھا رہے تھے۔ دُعائیں مانگ رہے تھے۔ وہ دور عقب میں اُس جگہ بیٹھ گیا جہاں اُس کے ابو بیٹھتے تھے اور روتے تھے۔ حاجی بابا کی قبر کی طرف دیکھتے دیکھتے اُس کی ٹکٹکی بندھ گئی۔ اُس کی آنکھیں از خود بند ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد اُس کی بند آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

......☆......

اب اُسے کسی بات میں دلچسپی نہیں رہی۔ شوٹنگ کا خیال بھی چھوڑ دیا۔ ایسوسی ایشن کے

آفس میں جانا بھی ترک کر دیا۔ موبائل بھی اکثر بند ہی رکھتا۔ کھانا کھا کر گھر سے نکلتا تو بے مقصد اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا رہتا۔ کبھی گیٹ وے آف انڈیا، کبھی چوپاٹی۔ کبھی ممبئی سنٹرل۔ بہت بار وہ چور بازار کی سیر کرتا۔ وہاں قدیم اور نایاب چیزوں کو دیکھ دیکھ کر ٹائم پاس کرتا۔

آج بھی وہ ایسے ہی گھوم پھیر کر تھکا ماندہ گھر لوٹ رہا تھا کہ عظیم بھائی کو گلی کے سرے پر بند موٹر سائیکل پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اُن کے پاس جا کر سلام کیا اور پوچھا۔ ''اُستاد جی، آپ؟''

''ارے منصور تم ہو کہاں؟'' عظیم بھائی نے پوچھا۔ کتنے دن ہو گئے تم ملنے کے لئے بھی نہیں آئے۔

تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ میں نے اشرف کو تمہیں بلانے کے لئے تمہارے گھر بھیجا ہے۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں اُستاد جی۔ فرمایئے، کیا حکم ہے۔''

''کل صبح دس بجے مجھے فلم سٹی کے باہر والے گیٹ کے پاس آ کر مل۔ آ جاؤ گے نا؟''

''کیوں نہیں، ضرور آؤں گا۔''

اُسی وقت اشرف بھی منصور کے گھر سے لوٹ آیا۔

''چائے تو پی کر جاؤ، اُستاد جی۔''

''پھر کبھی سہی۔ کل دس بجے پہنچ جانا۔''

اشرف موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھا اور عظیم بھائی وہاں سے چل دیئے۔

کوئی اور ہوتا تو منصور اسے منع کر دیتا تھا۔ وہ عظیم بھائی کو نہ نہیں کر سکتا۔ وہ اُستاد ہے۔ اُس نے بہت کچھ سکھایا ہے۔

دوسرے دن ٹھیک دس بجے وہ فلم سٹی کے باہر والے گیٹ پر پہنچ گیا۔ دو منٹوں کے بعد عظیم بھائی بھی آ پہنچے۔ منصور نے سلام کیا اور اُن کی بائیک کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ فلم سٹی کے واچ مین نے ڈنڈے والا بیریئر اُٹھا کر اُنہیں راستہ دیا۔ عظیم بھائی نے جھیل کی طرف جانے والی سڑک پر بائیک دوڑا دی۔ دو منٹ میں ہی وہ اُس ٹیلے پر پہنچ گئے جہاں سے پوری جھیل کا معائینہ کیا جا سکتا

تھا۔اس جھیل کو ایک بڑا تالاب بھی کہا جا سکتا تھا۔

بائیک پر سے اُترتے ہوئے عظیم بھائی کہہ رہے تھے۔''بارش ہونے سے جھیل بھر گئی یہ اچھا ہوا۔اُنہوں نے ٹیلے کے اُس کنارے کی طرف چلنا شروع کیا جہاں کھڑے ہو کر پوری جھیل پر نظر دوڑائی جا سکتی تھی۔عظیم بھائی منصور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔''میں نے جب پروڈیوسر کو شارٹ کی روپ ریکھا بتائی تو وہ خوشی سے اُچھل پڑا اور کہنے لگا عظیم بھائی اگر یہ شارٹ لینے میں آپ کامیاب ہوتے ہیں تو میری پکچر کے کلائمکس کو چار چاند لگ جائیں گے، فلم ہٹ ہو جائے گی۔آپ اِس شارٹ کی تیاری شروع کر دیں۔جو سٹنٹ مین اِس شارٹ کو کرے گا میں اُسے منہ مانگا معاوضہ دوں گا۔میرا خیال ہے منصور وہ پچاس ہزار تو دے گا ہی۔''

''پہلے مجھے شارٹ بتایئے اُستاد جی۔''منصور نے ٹیلے کے کنارے پہنچ کر کہا۔

عظیم بھائی نے سمجھانا شروع کیا۔''وہ جہاں ہم موٹر سائیکل چھوڑ کر آئے ہیں،وہاں سے بھی اور تھوڑا پیچھے سے لکڑی کا ایک پلیٹ فارم بنائیں گے جو سڑک کی طرح یہاں تک آئے گا بالکل سیدھا تا کہ اُس پر چلنے والی کار یہاں آکر پوری سپیڈ پکڑ لے۔ اُس کار میں تمہیں بیٹھنا ہے۔کار زمین سے نہیں ٹکرائے گی۔ذرا اِدھر آکر دیکھو وہاں گرے گی کار۔جیسے ہی وہ پانی کے اندر جائے گی تم کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل آنا۔'' اتنا کہہ کر عظیم بھائی منصور کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔

منصور وہاں دیکھنے لگا جہاں کار کو ڈوبنا تھا۔دو قدم آگے بڑھ کر وہ ایک ٹک اُدھر دیکھنے لگ۔اُسے محسوس ہوا کہ کار گر رہی ہے اور وہ اُس کے اندر بیٹھا ہوا ہے۔پھر آہستہ آہستہ کار ڈوبنے لگی اور وہ ابھی بھی اُس میں بیٹھا ہوا ہے۔کار پانی میں ڈوب گئی ہے اور وہ انتظار کر رہا ہے اپنے باہر آنے کا۔

عظیم بھائی کی آواز سن کر وہ چونکا۔پیچھے مڑ کر دیکھا۔عظیم بھائی کہہ رہے تھے۔''شارٹ مشکل ہے۔تھوڑا رِسک بھی ہے اِس میں لیکن میں جانتا ہوں تمہارے لئے ناممکن نہیں۔ بیٹا، میں نے پروڈیوسر سے کہہ دیا ہے کسی بات میں کمپرومائز نہیں کیا جائے گا۔کار اچھی کنڈیشن میں

ہوگی۔لکڑی کا پورا پلیٹ فارم سڑک کی مانند پکا بنے گا،ایک دم ٹھوس۔میں اپنی نگرانی میں بنواؤں گا،حفاظت کے پورے انتظامات ہوں گے۔تمہیں کوئی آنچ نہیں آئے گی۔پھر بھی تم سوچ سمجھ کر ہاں کرو۔اپنے حساب سے اندازہ لگاؤ۔دل میں کوئی شک وشبہ یا بے یقینی نہیں ہونی چاہیئے۔"

منصور نے پھر اُدھر دیکھا جہاں کار کوڈوبنا تھا۔پتہ نہیں کیوں کار پھر اُسے دھیرے دھیرے ڈوبتی دکھائی دے رہی تھی۔حالانکہ وہ جانتا تھا کار دھیرے دھیرے نہیں بلکہ بہت جلدی پانی میں ڈوب جائے گی۔اِدھر آ،تمہیں بتاؤں۔" عظیم بھائی نے کہا"سڑک کے ساتھ ساتھ کیمرے کی ٹرالی کا ٹریک بھی بنے گا۔دوسرا کیمرہ وہاں ہوگا فرنٹ میں۔وہ زُوم بیک کرتا جائے گا اور گاڑی کے ڈوبنے تک بلکہ تمہارے باہر نکل آنے تک کلوز میں چلتا رہے گا۔بعد میں دیکھیں گے کون سے کیمرے کا کون سا شاٹ کہاں لگانا ہے۔پورا شارٹ کیسا لگا تمہیں؟"

منصور نے عظیم بھائی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں ابھی آتا ہوں" کہہ کر وہ وہاں چلا گیا جہاں سے کار کو سٹارٹ ہونا تھا۔اُس جگہ سے اُس نے چلنا شروع کیا۔عظیم بھائی متواتر اُسے دیکھ رہے تھے۔چلتے چلتے وہ عظیم بھائی کے پاس پہنچا۔لیکن اُن کے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ٹیلے کی حد کی داہنی طرف وہ پگڈنڈی اُترنا شروع کی جو نیچے پانی تک جاتی تھی۔وہ جھیل کے کنارے وہاں تک پہنچ گیا جہاں سامنے ہی تھوڑے فاصلے پر کار کوڈوبنا تھا۔اُس نے کئی بار نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے دیکھا۔وہ اپنے دل کی آواز سُننے کی کوشش کر رہا تھا۔ایک بار پھر اُس نے تصور میں کار کے ڈوبنے کا منظر دیکھا۔اُسی لمحے اُس نے گویا اِرادہ باندھ لیا۔اُس نے ٹیلے کے اوپر کنارے پر کھڑے عظیم بھائی کی طرف دیکھا۔وہ تو اُس کی طرف ہی نگاہ کئے ہوئے تھے۔منصور نے بلند آواز میں کہا۔"اُستاد جی،میں یہ شارٹ دوں گا۔"

......☆......
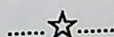
اماں رسوئی میں پالک کا ساگ صاف کر رہی تھیں۔رفیعہ گیس پر چائے کا پانی رکھ رہی تھی

آج کل دونوں میں کم بات ہوتی ہے۔ دونوں کو منصور کی تشویش رہتی ہے۔ اُس کے بارے میں باتیں کر کر کے تھک چکی ہیں۔ منصور کی خاموشی سے اُن کو بھی چُپی لگ گئی ہے۔

باہر کی گھنٹی بجی تو رفیعہ نے جا کر دروازہ کھولا۔ شکیلہ کو دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔

"آیئے، اندر آیئے۔"

"منصور گھر پہ ہیں؟"

"نہیں وہ تو گھر پہ نہیں۔ لیکن آپ اندر کیوں نہیں آتیں۔"

"میں جلدی میں ہوں۔ منصور کو ملنا ضروری ہے۔ آج تو وہ کہیں شوٹنگ بھی نہیں کر رہے۔" —

"مجھ سے کہہ کر گئے تھے کہ فلم سٹی جا رہے ہیں۔ آپ فون کیوں نہیں کر لیتیں؟"

"وہ میرا فون ریسیو نہیں کرتے، بند کر دیتے ہیں۔ میں............"

"میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ رفیعہ نے کہا

"پھر کبھی آؤں گی۔ اِس وقت جلدی میں ہوں۔"

"بھائی جان بہت چُپ چُپ رہتے ہیں۔ آپ کے ساتھ کوئی بات ہوئی ہے؟"

شکیلہ کیا جواب دیتی؟

"آپ بھی اُداس لگ رہی ہیں۔" رفیعہ چاہتی تھی کچھ تو معلوم ہو۔

"میں جاتی ہوں۔ اِس وقت میرا اُن سے ملنا ضروری ہے۔"

شکیلہ مڑی اور بازار کی طرف چل دی۔ رفیعہ، دہلیز پر کھڑی اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی دونوں کسی شدید مخمصے میں ہیں۔

......☆......

ٹیلے پر زور شور سے شوٹنگ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہر طرف بڑی چہل پہل تھی۔ کار کی پوری سپیڈ پر لانے کے لئے لکڑی کی جو خاص سڑک بنائی جا رہی تھی اُس پر دس بارہ کارپینٹر تندہی سے کام کر رہے تھے دھوپ میں پسینے میں شرابور تھے سب۔ ساتھ ہی کیمرے کی ٹرالی کے لئے

بھی ٹریک بنایا جا رہا تھا۔ ہر طرف کیلیں ٹھونکنے کی آوازیں کان کے پردے پھاڑ رہی تھیں۔ عجیب شور و غوغا تھا۔

ٹیلے کے قریب ایک ٹیکسی آ کر رُکی۔ شکیلہ اُس میں سے باہر نکلی۔ ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر وہ ٹیلے پر آگے بڑھنے لگی۔ اِتنی گہما گہمی میں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر شخص کسی نہ کسی کام میں جٹا ہوا تھا۔ کیلیں ٹھونکنے کی آوازوں سے اُس کا سر پھٹنے لگا۔ پھر بھی وہ چاروں طرف نظر دوڑا رہی تھی لیکن منصور کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک شخص کو دیکھ کر اُس نے اندازہ لگایا کہ یہ آرٹ ڈائریکٹر ہو سکتا ہے کیونکہ وہ دوسروں کے کام کا معائینہ کر رہا تھا۔ قریب جا کر اُس نے پوچھا۔ ''سر، سٹنٹ مین منصور یہاں آیا ہے؟''

''ہاں، میں نے دیکھا تو تھا اُسے'' اُس نے جواب دیا۔ ''آپ اُس طرف جائیے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔''

شکیلہ وہ ڈھلوان پگڈنڈی اُترنا اِتنا آسان نہیں۔ وہ بیچ میں ہی پھنس گئی۔

''منصور!'' اُس نے بلند آواز میں پکارا

منصور نے اُسے دیکھا تو چونک اُٹھا۔ فوراً اوپر جا کر اُس کا ہاتھ پکڑا اور نیچے لے آیا۔ اُس کے ہاتھ کے لمس نے منصور کے جسم میں ایک جُھرجُھری سی پیدا کی۔

''تم یہاں کیسے آ گئیں؟''

''کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تمہیں؟ تمہارے گھر بھی ہو کر آئی ہوں۔ ایسوسی ایشن کے آفس میں گئی تو وہاں عظیم بھائی ملے۔ اُنہوں نے بتایا کہ تم یہاں ہو سکتے ہو۔ ہر جگہ اِسی بات کا چرچا ہے کہ تم جو شارٹ دے رہے ہو وہ آج تک کسی نے نہیں دیا۔ میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں تم یہ خطرناک شارٹ کیوں دے رہے ہو؟''

''تمہیں کیا حق ہے یہ بات پوچھنے کا؟'' اُس کی آواز میں اُداسی سے بھری ایک بے تعلقی تھی۔

شکیلہ چپ ہو گئی۔

منصور پھر بولا۔ ''تم خود بھی تو کوئی خطرناک کام کرنے سے نہیں ڈرتیں۔ میں نے اُس

دن تمہیں گھوڑے والا شارٹ کرنے سے منع کیا تھا۔ ''کیا تم نے میری بات مانی تھی؟''

شکیلہ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ دل پھٹ رہا تھا۔ اُسے سمجھائے تو کیسے؟

منصور بولا'' میں سٹنٹ مین ہوں۔ یہ میرا پروفیشن ہے۔ میں کیسے کسی کام سے نا کر سکتا ہوں۔؟'' یہ کہہ کر منصور شکیلہ کی طرف سے منہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

دھیرے دھیرے شکیلہ اور بھی اُس کے نزدیک آ گئی۔ اُس کے چہرے کے سامنے آ کر اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ منصور کی آنکھوں میں اُسے ایسی ویرانیاں نظر آئیں کہ وہ تڑپ اُٹھی۔ زیادہ دیر تک وہ اُنہیں دیکھ نہیں سکی۔ منصور سے تھوڑے فاصلے پر جا کر وہ رونے لگی۔

منصور پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ویسے ہی بے حس وحرکت کھڑا رہا۔ شکیلہ دوبارہ منصور کے قریب آئی اور روتے ہوئے بولی۔ ''میں سمجھ گئی ہوں۔ تم جینا نہیں چاہتے۔ تم اُس درد وغم سے چھٹکارا پانا چاہتے ہو جو میں نے تمہیں دیا ہے۔ قصور میرا ہی ہے۔ میں نے کیوں تم سے پیار کیا؟ کیوں تمہاری جان کی دشمن بنی؟ مجھے معاف کردو، منصور۔ میں تم سے نکاح کرنے کے لئے تیار ہوں، جو ہوگا میں دیکھ لوں گی۔ تم اپنی زندگی کو داؤ پر مت لگاؤ۔''

منصور کے ہونٹوں پر ایک اُداس مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ پتھر جیسی سخت آواز میں بولا۔ ''تم احمقوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔ کون کہتا ہے میں اپنی زندگی سے کھیل رہا ہوں۔ میں تو اپنا کام کر رہا ہوں۔''

''یہ کام مت کرو۔''

''یہ نہیں ہو سکتا۔ ایک بار ہاں کر کے میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔

یہ کوئی مذاق تھوڑی ہے۔ پروڈیوسر کے لاکھوں روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ میرا نام خراب نہیں ہو جائے گا؟ پھر مجھے کوئی کام بھی نہیں ملے گا۔ یہ سٹنٹ میں ضرور کروں گا۔''

شکیلہ آنسو پونچھتے پونچھتے ایک ٹک اُسے دیکھنے لگی۔ منصور بھی اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ مُسکرا کر بولا۔ ''اگر میں بچ گیا تو میرے ساتھ نکاح کرو گی؟'' شکیلہ نے بے تاخیر جواب

دیا۔ ”میں کہہ چکی ہوں اگر تم یہ سٹنٹ کرنے کا اِرادہ چھوڑ دو تو میں آج ہی نکاح کرنے کو تیار ہوں۔“

”بہت دیر کر دی تم نے شکیلہ“ منصور نے کہا۔

”تم اگر اپنی ضد نہیں چھوڑو گے تو میں ۔۔۔۔۔ میں ابھی تمہاری اماں اور بہن کو لے کر یہاں آجاؤں گی۔ اُنہیں بتا دوں گی تم کیا کر رہے ہو۔“ یہ کہہ کر شکیلہ وہاں سے چل دی منصور پریشان ہو گیا۔

”ٹھہرو شکیلہ، ٹھہر جاؤ۔ میری بات سنو۔“ شکیلہ رُک گئی۔ منصور اُس کے پاس آ گیا اور منت سماجت کرنے لگا۔ ”پلیز شکیلہ میری اماں اور بہن کو اتنا دکھ مت دو۔“

”تمہارا دل پتھر کا ہو چکا ہے، منصور۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں پتھر ہو چکا ہوں لیکن اماں اور رفیعہ کو دکھ پہنچے گا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا۔“

”میرا نہیں تو اُن کا ہی سوچو۔ یہ شوٹنگ مت کرو۔“

”تم ناحق اُن کو یہاں لاؤ گی۔ میں اُن کے کہنے پر بھی اب پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ تمہیں وہم ہو گیا ہے کہ میں جان بوجھ کر اپنی جان سے کھیل رہا ہوں۔ میں اِسی لئے یہاں بیٹھا ہوں کہ سارے انتظامات اپنی نگرانی میں کرواؤں۔ کسی بات میں کوئی کمی نہ رہے تاکہ مجھے کچھ نہ ہو۔ تم یقین کرو کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔“

شکیلہ کا رونا رُک نہیں رہا تھا۔

اُس روز وہ رات بھر سوئی نہیں۔ دُعا مانگتی رہی کہ منصور کو کچھ نہ ہو۔

......☆......

آج اُسی سٹنٹ شارٹ کی شوٹنگ ہے۔ تیاری مکمل ہو چکی ہے۔

لکڑی کے ٹریک پر کار کھڑی ہے جسے جھیل میں ڈبونا ہے۔

تھوڑی دوری پر کیمرے کو ٹرالی پر رکھا گیا ہے اور اُس کے اردگرد بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔ عظیم بھائی کے علاوہ پروڈیوسر، ڈائریکٹر، کیمرہ مین، اسسٹنس، کچھ گیسٹس بھی ہیں اور کچھ

ایسے لوگ بھی ہیں جو فلم سٹی میں چل رہی اپنی شوٹنگ چھوڑ کر یہ شاٹ دیکھنے کے لئے آگئے ہیں۔

سب سے پیچھے شکیلہ کھڑی ہے۔ خاموش، سنجیدہ اور فکر مند۔ وہ سوچ کر آئی ہے کہ وہ منصور کے رُوبرو نہیں جائے گی۔ وہ اُسے ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔ ابھی تک منصور میک اَپ کر کے اور کاسٹیوم پہن کر وہاں نہیں پہنچا۔ سب کو اُسی کا انتظار ہے۔ عظیم بھائی نے بائیں کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ اُسی وقت پروڈکشن کی وین پہنچی اور اُس میں سے منصور باہر نکالا میک اَپ کئے اور ہیرو کے کپڑے پہنے ہوئے۔ کالا سُوٹ، ٹائی اور سر پر ہیٹ، بالکل ہیرو لگ رہا تھا۔ شکیلہ اُسے دیکھ کر ہلکے سے مسکرائی۔ منصور سیدھا عظیم بھائی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے سب کو 'گُڈ مارننگ' کہا۔ ڈائریکٹر کے منہ سے نکلا۔

''اچھے لگ رہے ہو۔''

عظیم بھائی نے مسکراتے ہوئے منصور کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''تیار''؟

''میں تیار ہوں، اُستاد جی۔''

''چلو پھر کار میں بیٹھ جاؤ۔''

منصور نے سب کے پیچھے خود کو چھپاتی ہوئی شکیلہ کو آتے ہی دیکھ لیا تھا۔ وہ اُس کے پاس جا کر کہنے لگا۔ ''لگتا ہے تم ابھی بھی گھبرا رہی ہو۔''

''بالکل نہیں'' شکیلہ بولی۔ ''میں سوچ رہی ہوں کاش عظیم بھائی نے مجھے بھی کار میں تمہارے ساتھ بیٹھنے کے لئے کہا ہوتا۔''

''شکر ہے کہ تم میرے ساتھ نہیں ہو۔''

''کیوں؟''

''تب میرا دھیان تمہاری طرف ہی رہتا۔ پہلے تمہیں باہر نکالتا پھر خود کو۔ اب میں اکیلا ہوں جلدی باہر آجاؤں گا۔''

''پھر تو اچھا ہے میں تمہارے ساتھ نہیں۔''

''تم ایک کام کرنا۔''

''کیا؟''

منصور نے اُس کے اور بھی قریب جا کر کہا۔''جب میں پانی سے باہر نکلوں تو سب سے پہلی تالی تم ہی بجانا۔'' یہ کہہ کر وہ مسکراتے ہوئے کار کی طرف چل پڑا۔شکیلہ بھی مسکرانے لگی۔ اُس کے دل کو کچھ ڈھارس بندھی۔ منصور کی باتوں میں خوداعتمادی کی جھلک تھی۔ اُسے جاتے ہوئے دیکھنے کے لئے وہ آگے کیمرے کے پاس سرک گئی۔ٹرالی کو دھکا دینے والے ٹیکنیشین نے اُسے ٹریک سے تھوڑا پیچھے کھڑا رہنے کے لئے کہا۔وہ پیچھے ہٹ گئی۔

عظیم بھائی اپنے اسسٹنٹوں کو سمجھا رہے تھے کہ کار کو کہاں کہاں اور کیسے کیسے آگ لگانی ہے۔منصور بیٹھ گیا۔عظیم بھائی کو لگا کہ دروازہ کھلنے میں رواں نہیں ہے۔اُنہوں نے موٹر میکینک کو بلا کر ہدایت کی کہ دروازے کے ہینڈل کی اندر باہر سے اچھی طرح سے گریس لگا دو۔'' میکینک نے فوراً گریس لائی اور لگا دی۔ عظیم بھائی نے دروازے کو دو تین بار کھولا اور بند کیا۔ جب دیکھا کہ دروازہ رواں ہو گیا ہے تو منصور سے بولے۔''کار کو ٹریک پر آگے پیچھے چلا کر دیکھ لے''

منصور نے کار سٹارٹ کی اور وہاں تک لے گیا جہاں جمپ لینا تھا۔ پھر بیک گیئر لگا کر واپس آیا۔اِسی طرح ایک دو بار آگے پیچھے کر کے اُس نے دیکھ لیا۔اُس نے عظیم بھائی سے کہا۔

''میں تیار ہوں، آپ شارٹ لے سکتے ہیں۔''

شکیلہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔

عظیم بھائی نے ڈائریکٹر کو پوچھا۔''شاٹ لیں؟''

ڈائریکٹر نے انگوٹھا اُٹھا کر کہا۔''گو''

دونوں کیمرہ مینوں نے بھی ''سب ٹھیک ہے'' کا سگنل دیا۔

''منصور!'' عظیم بھائی نے پکارا

منصور نے بھی، ''میں تیار ہوں'' کا اشارہ کیا۔

شکیلہ کی نظریں لگاتار منصور پر جمی ہوئیں تھیں۔جیسے وہ کسی مراقبے میں ہو۔

ہر طرف خاموشی چھا گئی تھی۔
عظیم بھائی نے پورے زور سے چیخ کر پکارا۔ ''رول! سٹارٹ کیمرہ''
کیمرے چلنے لگے۔
منصور نے کار سٹارٹ کی۔
عظیم بھائی نے آگ لگانے کیا اشارہ کیا۔
اُن کے اسسٹنٹوں نے پیٹرول ڈال کر کار کو آگ لگا دی۔
شکیلہ کا دل دہل گیا۔
''ایکشن''، عظیم بھائی چیخے۔
کار چل پڑی۔ منصور نے ایکسی لیٹر پر پیر دبایا۔ کار پوری سپیڈ پر بھاگی۔
کیمرہ بھی ٹرالی پر بھاگ رہا تھا۔
عظیم بھائی اور ڈائریکٹر کے پیچھے پیچھے حواس باختہ شکیلہ بھی بھاگ رہی تھی۔
پوری رفتار سے کار ٹریک کے سرے پر پہنچی اور اُچھل کر وہاں گری جہاں گرنا مقصود تھا۔
کار ڈوب رہی تھی۔
سبھی دیکھنے والوں کی سانسیں رُکی ہوئیں تھیں۔
کار پانی میں ڈوب رہی تھی اور آگ بجھ رہی تھی۔
کار ڈوب گئی۔
شکیلہ کو گویا غش آ رہا تھا۔
سبھی لوگ بت بنے ہوئے منصور کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔
تقریباً بیس سیکنڈ ہو گئے۔
منصور باہر نہیں آیا۔
پورا ایک منٹ ہو گیا۔
منصور باہر نہیں آیا۔

عظیم بھائی بھاگے اور اُنہوں نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔

شکیلہ جہاں کھڑی تھی وہیں بے ہوش ہو کر گر گئی۔

پانی کے اندر سانس روکے ہوئے عظیم بھائی کار کے پاس پہنچے، اُنہوں نے کار کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی، وہ نہیں کھلا۔ اُنہوں نے پھر زور لگایا۔ دروازہ کھل گیا۔ اُنہوں نے منصور کو کھینچ کر باہر نکالا مگر اُن کا اپنا سانس گھٹنے لگا۔ منصور کو چھوڑ کر وہ فوراً پانی کی سطح پر آئے، سانس لیا اور پھر ڈبکی لگائی۔ اُن کے اسسٹنٹ بھی پانی میں کود گئے۔ عظیم بھائی جب منصور کو لے کر سطح پر آئے تو اُن کے اسسٹنٹوں نے اُن دونوں کو سنبھالا اور فوراً پانی سے باہر لے آئے۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ منصور سانس لے رہا ہے یا نہیں۔ پہلے اُس کے پیٹ میں سے پانی نکالنے کی کوشش کی گئی۔ پھر اُسے ایک بڑی کار میں ڈال کر ہسپتال کی طرف بھاگے۔

بے ہوش پڑی ہوئی شکیلہ کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔

ہسپتال میں معائینہ کرنے کے بعد ڈاکٹر کو یہ کہتے دیر نہیں لگی کہ منصور اب اِس دنیا میں نہیں ہے۔

تجھے پیار کرنے کے بعد

میرے پاس

کچھ نہیں بچا

اوس پھولوں میں جذب ہوگئی

پھول جھیل میں ڈوب گئے

جھیل بادلوں میں گم ہوگئی

بادل گھاٹیوں پر برس گئے

......☆......

شکیلہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے جو بالکل منصور پر گیا ہے۔ جب اُس نے اُسے منصور کی

اماں کی گود میں ڈالا تو اماں نے اُسے چھاتی سے لگالیا۔

شکیلہ نے ایک کمرہ اُن کے قریب ہی کرائے پر لے لیا ہے۔ وہ شمی کے ساتھ بیٹے کو لے کر وہاں آ گئی ہے۔ شمی نے اپنی پڑھائی جاری رکھی ہے۔ شکیلہ جب شوٹنگ کے لئے گھر سے نکلتی ہے تو ننھے بیٹے کو منصور کی اماں اور رفیعہ سنبھالتی ہیں۔

وہ اُسے پیار کرتے نہیں تھکتیں۔ کبھی کبھی پیار کرتے ہوئے روتی بھی ہیں۔

رفیعہ کی شادی کی تیاریاں بھی ہو رہی ہیں۔

حمیدہ بیگم اور افضل خاں فلیٹ بیچ کر اورنگ آباد چلے گئے ہیں۔

............●●●............

میر غلام رسول نازکی نمبر

میر غلام رسول نازکی اُردو، کشمیری، عربی، فارسی اور انگریزی ادب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اپنے تبحرِ علمی اور بلند خیالی کی وجہ سے ادبی حلقوں میں خاصے مقبول تھے۔ اُردو، کشمیری، فارسی اور عربی میں انہوں نے کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ میر غلام رسول نازکی پر ''شیرازہ'' کی خصوصی اشاعت، شیرازہ اُردو کا ایک کارنامہ ہے جس کو علمی اور ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔

............●●●............

● ...... نور شاہ

قفس اُداس ہے

پھول پیاسا تھا!

پھول نے اپنی شاخ کو دیکھا اور ہوا کے جھونکے میں جھوم کر سوچا کہ کتنے سرسبز پتے پھوٹ آئے ہیں آرزوؤں کے، جنہیں اس نے پہلے محسوس نہیں کیا تھا۔ دل کی اس کروٹ کے کتنے عنوان تھے جو سلونی نے پہلے محسوس نہیں کئے تھے۔ اس کی ماں میریا اسے اسکول اور گھر کے کاموں میں اس طرح مصروف رکھتی کہ اپنے دل کے نہاں خانوں میں جھانکنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ کبھی یہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا تھا کہ اس میں کتنی تصویریں مبہم جذبات کے رنگ بھرے جانے کی منتظر ہیں۔ لیکن آج کی تنہائی کیسی تنہائی تھی کہ وہ چاہتی تھی کہ دل سے وہ تہیں اُتار دے جو ماہ سال کے گزرے ہوئے کارواں نے گرد کی صورت جمادی تھیں۔ آج وہ خود اپنے آپ کو پہچاننا چاہتی تھی۔ اپنے گھر کے در و دیوار کو جاننا چاہتی تھی اور اس بند کمرے کو کھولنا چاہتی تھی جو اس نے سن رکھا تھا اس کی آنٹی کا ہے۔ شاید اپنے دل کی بے نام آرزوؤں کا کوئی سراغ یہاں مل جائے۔ شاید یہ اس کا وہم تھا، شاید یہ اس کے دل کی آواز تھی کیونکہ اس بند کمرے کو کھولنے کی خواہش کو وہ محض تجسس کا نام دے سکتی تھی!

اس کی ممی باہر تھی، اسکول میں چھٹی تھی اور سلونی تنہا۔ بند کمرے کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے اسے ڈر سا لگا جیسے وہ کوئی چوری کرنے جارہی ہو، جیسے ایک اَن دیکھا سایہ اُس کا تعاقب

کر رہا ہو صحن میں ممی نے بند کمرے کو کھولنے کیلئے منع کر رکھا تھا جیسے وہ بند کمرہ الف لیلوی داستان کا ایک ورق ہو جسے الٹنے کیلئے مجنون کا جگر چاہیئے۔

دل نے کہا...... کسی طرح، جیسے بھی ہو، اس کی جھلک دیکھ لینی چاہیئے۔

کمرے کے دروازے پر تالا لگا تھا، اس لئے اس نے سب سے پہلے ممی کے کمرے میں جا کر چابیاں تلاش کیں اور ان میں سے اس نے اندازہ کر لیا کہ کون سی چابی ٹھیک لگ سکتی ہے۔ یہ اندازہ اس کی ایک نگاہ کر گئی کیونکہ اس کی آنکھیں ہمیشہ کمرے کے تالے کو دیکھنے اور سوچتے رہنے کی عادی بن چکی تھیں۔ پھر چابیاں اپنی ہتھیلی میں چھپائے بے آواز قدموں سے آہستہ آہستہ وہ کمرے کے دروازے تک آئی اور جلدی سے اسے کھول لیا۔ تالے کو آہستہ سے فرش پر رکھ کر اس نے دروازہ کھولا اور کمرے کی ایک ایک چیز اس کے سامنے تھی۔ فرش کا قالین، سنگار میز اور وارڈ روب۔ اس قالین پر کتنے عرصے کے بعد کسی کے پاؤں پڑے ہیں۔ یہاں آنٹی سوتی ہوں گی۔ یہاں بیٹھ کر آئینے میں سنگار کرتی ہوں گی۔ وہ سنگار میز کی طرف بڑھی لیکن آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے سے رُک گئی اس نے وارڈ روب کھولا۔ آنٹی کتنے قیمتی کپڑے پہنا کرتی تھی؟ اس نے اپنی انگلیاں آہستہ سے ان پر رکھ دیں اور اس ریشمی لباس کی ملائمت میں ایک اَن جانی لذت کا احساس ہوا اور اسے محسوس ہوا جیسے دل کے نہاں خانے میں کوئی آرزو مچل اٹھی ہو اور شاید اسی آرزو کی تکمیل کیلئے کسی اندرونی طاقت کے سہارے، اس نے لباس ہینگر سے اُتار کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا......!

''میں بھی......!'' خیال آیا اسے پہن کر دیکھ لوں۔ میں اس خوبصورت لباس میں کیسی لگوں گی۔ کس طرح یہ میرے جسم پر سجے گا۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور اپنے کپڑے اُتار دیئے۔ پھر آنٹی کے چمکتے ہوئے لباس کو پہن کر اور سنگار میز کے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے سراپا پر نظر ڈالی!

کیا آئینے میں وہ خود تھی!

کیا وہ اتنی خوبصورت بھی لگ سکتی ہے!!

کیسے اس لباس میں اس کے جسم کا ایک ایک عضو، ایک ایک انگ نمایاں ہو سکتا ہے!!!

اسے یاد آیا آنٹی ان ہی کپڑوں کو پہن کر اپنے کمرے کو اسی طرح بند کر کے یہیں اسی قالین پر رقص کیا کرتی تھیں اور اس کی ماں کتنی بری طرح ڈانٹا کرتی تھی...... تب وہ بالکل چھوٹی تھی، اس کے سوچنے سمجھنے کا شعور نا پختہ تھا، اتنی چھوٹی، اس قدر نا پختہ کہ اسے اپنی آنٹی کی صورت بھی یاد نہ تھی اور گھر میں آنٹی کی کوئی تصویر بھی نہیں لٹک رہی تھی اور جو آنٹی کی تصویریں تھیں......

وہ آہستہ سے غالیچے پر آئی اور نہ جانے کس طرح بے قراری کے عالم میں دوسرے ہی لمحے اس کے پاؤں تھرک اُٹھے۔

اس کے من میں کون فنکار چھپا بیٹھا تھا جو اس کے پاؤں کو، اس کے جسم کو تھرکنے کیلئے تحریک بخش رہا تھا ورنہ وہ تو رقص کی الف بے سے ناواقف تھی۔

اس کے ہونٹوں پر یکایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"ہائے میں رقص کر سکتی ہوں۔ میں بھی ناچ سکتی ہوں۔ میرے پاؤں کی جنبش پازیب کو جھنکار دے سکتی ہے۔ میرے بازوؤں کی محرابیں زندگی کے ان تصورات پر جھک سکتی ہیں۔ لیکن ماں آجائے گی، ماں آجائے گی۔ کوئی دیکھ لے گا اور پھر......؟

سلونی نے جلدی سے کپڑے اُتار دیئے اور کمرے کو بند کر کے باہر آ گئی۔ چابیاں جہاں سے اُٹھائیں وہیں رکھ دیں۔ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا جیسے سچ مچ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو۔

اور جب ماں آئی تو سلونی نے پوچھا

"ممی، آنٹی کہاں ہے؟"

"آنٹی......" میریا کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ آ گیا، ایک ایسا رنگ جو بیک وقت پیار اور نفرت کا اظہار تھا۔

"ہاں ممی، آنٹی"، سلونی نے پھر کہا۔

ایک لمحے کیلئے خاموشی چھا گئی۔

سلونی کو محسوس ہوا جیسے یہ خاموشی ممی کو دور، بہت دور ماضی کی طرف دھکیل کر لے گئی ہو جہاں اس کے دل کی ہر دھڑکن ایک کہانی ہے اور اس کہانی کا عنوان ہے......آنٹی کہاں ہے۔

آنٹی!

صنوبر!!

میری بہن!!!

دوسرے لمحے اس کہانی میں جیسے جان آگئی اور ممی کی نظروں کے سامنے ایک عورت کا سراپا گھوم گیا...... مستی میں ڈوبی ہوئی دو بڑی بڑی بادامی آنکھیں، بادام کے شگوفوں سے بھی زیادہ خوبصورت۔ چہرے پر بکھرا ہوا زردزرد رنگ اور اس کے ساتھ جیسے کچھ سرخ رنگ گھل مل گیا ہو ایسے ہی جیسے خزاں کے شروع شروع میں چنار کے پتوں کا رنگ ہو جاتا ہے۔ موٹی موٹی سی اُبھری اُبھری سی مسکراہٹ جیسے پتھروں کے درمیان میں سے کوئی پیاسا پہاڑی چشمہ چھپتا چھپاتا چلا آرہا ہو۔ آواز میں نگین جھیل کا سا سکون اور قد......قد جیسے شالیمار باغ کے سرو بھی شرما جائیں۔

صنوبر......میری بہن!

پیار نفرت پر غالب آچکا تھا۔ سلونی نے دیکھا کہ اس کی ممی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

''ممی تم رو کیوں رہی ہو'' سلونی نے پوچھا۔

اچانک پیار نفرت کی تاریکیوں میں گم ہو گیا۔

''میں کہاں رو رہی ہوں، کیوں روؤں، کس کیلئے روؤں......'' ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ممی نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ خود بخود اس کے چہرے کی جانب بڑھ گیا۔ جہاں اب بھی نہ جانے کتنے قطرے کانپ رہے تھے۔

وہ ماضی سے نکل کر حال میں آگئی۔

''آؤ سلونی......دیر ہو رہی ہے۔ تمہارے ڈیڈی آتے ہی ہوں گے۔''

لیکن ممی

''کیا ہے؟'' اس نے سختی سے کہا۔

''سلونی کی زبان بند ہوگئی۔ اس کا ذہن بھٹک گیا۔ وہ ممی سے بہت ڈرتی تھی۔ کیونکہ اس کی ممی کی طبیعت میں نہ جانے کہاں سے چڑچڑاپن آگیا تھا۔ لیکن اس وقت اس نے بالکل ہمت نہ ہاری، شاید اسے اپنی دل کی کروٹ کا عنوان مل چکا تھا۔

''ممی آنٹی کہاں ہے۔''

ممی کے قدم اندر جاتے جاتے خود بخود رُک گئے۔ اس نے مڑ کر سلونی کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں جھانکا، اس کے دل میں اُترنے کی کوشش کی۔ اسے ڈر سا لگا۔ اس نے جھرجھری سی محسوس کی۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے سلونی کے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی۔

ممی کا سر چکرا گیا۔

آج تک وہ بے خبر کیوں تھی بے حس تھی۔ اب تک اس نے اس بارے میں سوچا کیوں نہ تھا۔ آخر کیوں نہیں...... وہی مستی میں ڈوبی دو بڑی بڑی آنکھیں، وہی روپ، وہی آواز، وہی تمکنت...... سلونی...... صنوبر؟

میریا کو سلونی کی آنکھوں میں وہی تمنائیں، وہی آرزوئیں انگڑائیاں لیتی نظر آئیں جو ...... جو آج سے بہت پہلے صنوبر کی آنکھوں میں نظر آئی تھیں۔

اگر صنوبر کی طرح سلونی بھی ...... اس نے من ہی من میں سوچا...... ''نہیں نہیں، ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ کبھی ہونے نہیں دوں گی۔''

''کیا نہیں ہونے دو گی ممی''

''کچھ بھی نہیں میری بیٹی، کچھ نہیں......''

''اس نے سلونی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

''آؤ اندر چلیں۔ تمہارے ڈیڈی آتے ہی ہوں گے۔''

''لیکن ممی تم نے کہا نہیں کہ آنٹی صنوبر کہاں ہے۔''

''وہ مرگئی۔'' میریا نے چلا کر کہا۔

''ممی''

''ہاں سلونی وہ مرگئی میرے لئے، تیرے لئے ......سب کیلئے۔ دیکھ اب صنوبر کا نام میرے سامنے کبھی نہ لینا......''

میریا اندر چلی گئی۔

سلونی خاموش ہوگئی۔ وہ چاہتی تھی کہ دوبارہ آنٹی کے کمرے میں جا کر روئے ..... خوب روئے ......!!

دل کی کیسی بے قراری ہے یہ!

سلونی نے سوچا...... ''یہ کیا ہے جو آہستہ آہستہ میرے من میں جاگ رہا ہے۔ کچھ تلخ بھی اور کچھ شیریں بھی ......نہ جانے یہ تلخ تلخ شیریں شیریں سا درد مجھے کن اَن دیکھے میدانوں اور پہاڑوں میں سے لئے جا رہا ہے جو میں نے کبھی نہ دیکھے جن کے بارے میں، میں نے کبھی بھی نہ سوچا۔ ہوا کا یہ کیسا جھونکا میرے دل کے تاروں کو چھو گیا کہ کمرے میں لٹکے ہوئے ان رنگدار پردوں کی ہر سرسراہٹ پر میرے پاؤں تھرکنے لگتے ہیں۔ باورچی خانے سے کسی برتن کے ٹکرانے کی آواز کانوں میں سنائی دیتی ہے تو جسم کا ہر حصہ اس آواز کی موسیقی پر جھومنے لگتا ہے۔ میں کیوں چاہتی ہوں کہ ہر لمحہ ہر گھڑی اور ہر وقت آنٹی کا خوبصورت لباس پہن کر رقص کروں ناچوں ......اتنا ناچوں کہ سفیدے کے اونچے اونچے پیڑ، چنار کے یہ سرسبز پتے میرے ساتھ رقص کریں......سامنے ٹیبل پر پڑی میری یہ کتابیں ......اُف یہ کتابیں ان میں اب دلچسپی نہیں رہی ہے اور...... ''سلونی'' ماں کی آواز تھی جو اپنے کمرے سے بلا رہی تھی۔ سلونی جیسے سپنے سے جاگی...... کس قدر پُر کیف سپنا تھا۔ اس نے پھر سوچا...... کاش وہ اسی سپنے میں کھوئی رہتی ......کاش!

''سلونی کھڑکی میں کھڑی ہو کر ان برف آلود پہاڑوں میں کیا تلاش کر رہی ہو'' اس کی ممی نے کمرے میں آکر کہا

''ممی......سپنا۔''

''سپنا......کیا سپنا۔''

''ممی میں ابھی ابھی ایک سپنا دیکھ رہی تھی کہ میں......

ممی نے بات کاٹ دی...... ''ارے لڑکی تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ چل اسکول جانے کا وقت ہو گیا۔ تمہارے ڈیڈی تو کب کے چلے گئے۔''

اسکول میں بھی سلونی کا دل نہ لگا۔ اس نے کتابیں کھولیں تو اسے محسوس ہوا جیسے الفاظ ایک دوسرے میں خلط ملط ہو کر ایک ہی بات دہرا رہے ہوں۔

زندگی رقص ہے!

زندگی محبت ہے۔

اس نے اپنی آنکھیں مل لیں اور سامنے کی طرف دیکھا جہاں اس کے ٹیچر ''موسمِ بہار کے رقص کے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا......

''رقص گانے کی تکمیل سے شروع ہوتا ہے اور اس کے ارتقاء کا اظہار اس قوت سے ہوتا ہے جو ہاتھوں کو ایک دوسرے سے بجانے سے شروع ہو کر جسم کی حرکتوں تک جا پہنچتا ہے۔ کبھی آگے کو جھکتے ہوئے اور کبھی پیچھے کی طرف جاتے ہوئے۔ رقاص کے اعضا اتنی تیزی سے حرکت کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ بجلی کوندرہی ہے اور جیسے اس میں زندگی کی آگ دہک رہی ہے۔''

سلونی کی نگاہوں میں بے ساختہ وہ منظر گھوم گیا جب اس نے آنٹی کا لباس پہن کر آئینے کے سامنے بیٹھ کر ایسی حرکتیں کی تھیں۔

اسکول سے واپسی پر اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر خدا سے دعا مانگی کہ اس کی ممی گھر پر نہ ہوتا کہ وہ آنٹی کے کمرے میں جا کر دوبارہ اس کا وہ قیمتی لباس پہن لے اور آئینے کے سامنے رقص کرے مگر گھر میں داخل ہوتے ہی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ممی اور ڈیڈی چائے کی میز پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔

”اے خدایا، تو نے میری اتنی سی بات مان لی ہوتی تو تیرا کیا بگڑتا......“

کئی دن اور کئی راتیں بیت گئیں مگر پھول پیاسا ہی رہا۔ من کی آرزوئیں تشنہ ہی رہ گئیں۔ نہ جانے کتنی بار اس کے قدم آنٹی کے کمرے کی طرف اُٹھے ہر بار اسے پلٹ کر آنا پڑا۔ کمرہ بند تھا اور اس پر لٹکا تالا اس کی تشنگی کا مذاق اُڑا رہا تھا۔

دونوں کے درمیان دروازہ حائل تھا۔

ایک طرف آنٹی کا خوبصورت لباس اور دوسری جانب اس لباس کو پہننے کی تمنا۔ ایک طرف قالین کے نقش و نگار اور دوسری طرف پاؤں ان پر تھرکنے کی آواز۔ ایک طرف وہ قد آدم آئینہ اور دوسری طرف اس میں ظاہر ہونے کے لئے بے تاب عکس......دروازے کے اُدھر وہ دنیا تھی جو سلونی اپنانا چاہتی تھی اور اِدھر وہ دنیا جس میں اس کے لئے کوئی حسن نہ تھا!!

یہ کیسا دروازہ ہے؟ کس قدر مضبوط......!

دروازہ بند ہی رہا سلونی نے کئی بار کھولنے کی کوشش کی مگر ہر بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لئے کہ اس کی ممی سارا دن گھر میں ہی رہنا پسند کرتی تھی۔ وہ ممی سے اکثر کہتی رہتی۔

”ممی تم آج کل آنٹی مونیکا کے یہاں کیوں نہیں جاتی۔“

”کیوں کیا ہوا۔“ وہ جواب دیتی۔

”کچھ بھی نہیں۔ تم بہت دنوں سے نہیں گئی نا اس لئے کہہ رہی ہوں“

لیکن ایک دن اس کی آرزو پوری ہوگئی، کسی رشتہ دار کے ہاں سالگرہ کی پارٹی تھی۔ ڈیڈی اور ممی چلے گئے سلونی نے سر درد کا بہانہ کر کے جانے سے انکار کیا۔

یہ لمحہ کتنا خوبصورت تھا!

ایک بار دروازہ پھر کھل گیا۔ ایک بار پھر وارڈ روب کھل گیا اور آئینے نے اس لباس کو سلونی کے جسم پر دیکھا۔ وہ دیر تک رقص کرتی رہی ناچتی رہی، مسکراتی رہی......!

لباس اُتار کر اسے دوبارہ وارڈ روب میں رکھا۔ وہ مایوس ہوگئی اس کے ذہن میں ایک نیا خیال اُبھرا......”کیا وہ یہ لباس پہن کر اپنی ممی ڈیڈی کے سامنے رقص کر سکے گی۔“

''نہیں نہیں ایسا ناممکن ہے۔'' اس کے دل سے آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ چند ماہ پہلے اسکول میں ناٹک پیش کیا جانے والا تھا۔ اسکول کا سالانہ فنکشن تھا۔ سلونی کو بھی اس ناٹک میں کام کرنے کے لئے کہا گیا تھا...... سلونی کو ایک رقص میں حصہ لینا تھا یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئی تھی مگر جب یہی بات ممی نے سنی تو اس نے خود پرنسپل کے پاس جا کر سلونی کی جانب سے انکار کیا تھا۔ اسکول میں ڈانس ٹیچر نے کہا تھا...... میڈم سلونی بہت اچھا رقص کر سکتی ہے۔''

''مجھے رقص سے نفرت ہے'' ممی نے جواب دیا تھا۔

ٹیچر حیران رہ گیا تھا...... اس روز سلونی مایوس ہو گئی تھی۔

اس نے کمرے کا بھرپور جائزہ لیا۔ ایک ایک چیز کو دیکھا۔ ایک ایک چیز کو چوما۔ اچانک ایک بریف کیس میں کاغذ کا ایک پلندہ دیکھا۔ جلدی جلدی دیکھنے لگی۔ اس کی حیرت میں اضافہ ہوا جب اسے ایک ڈائری اور کچھ تصویریں مل گئیں۔ اس نے ڈائری کو چھپا لیا اور تصویریں دیکھنے لگی۔ اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے سے ایک مدہم سی صورت اُبھری اور دوسرے ہی لمحے وہ اپنی آنٹی کو پہچان گئی...... یہ سب صنوبر کی تصویریں تھیں...... وہ سوچتی رہی من ہی من میں جانے کیا کرتی رہی۔ اس نے تصویریں دوبارہ بریف کیس میں ڈال دیں۔ کمرہ بند کیا اور اپنے کمرے میں آکر بستر میں گھس گئی شاید اپنی ممی کو یہ بتانے کیلئے کہ وہ دردِ سر میں مبتلا ہے......

وقت گزرتا رہا لیکن وہ آنٹی کی ڈائری سکون سے پڑھ نہ سکی۔ یہاں تک کہ اسے چھپانا بھی مشکل ہو رہا تھا......!

اب اسکول کا امتحاں پاس کر کے اس نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔!

کالج کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔ اپنا رنگ روپ اپنا حسن۔ یہاں سلونی کے نئے دوست بنے۔ نئے ماحول میں وہ گھل مل گئی۔ ممی کی نگرانی بھی کسی حد تک کم ہو گئی تھی...... وہ اب صنوبر کی ڈائری پڑھ سکتی تھی۔

۱۱ر مارچ

موسمِ بہار کے شگوفوں کو میرا سلام!

چناروں کی آگ بجھ چکی ہے۔ چاروں جانب رونق نظر آ رہی ہے۔ لگتا ہے زندگی جیسے تمام نگاہوں کے ساتھ گہری نیند سے بیدار ہو چکی ہے۔ جشنِ بہار منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میں بھی ایک محفلِ رقص میں حصہ لے رہی ہوں۔ حالانکہ ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ اپنے کمرے میں کتنی بار رقص کیا ہے۔ اسکول اور کالج کے سٹیج پر بھی کئی بار رقص و موسیقی کے پروگراموں میں حصہ لیا لیکن وہ اور ہی بات تھی۔ محفل میں سب کے سامنے آؤں گی تو کیا پاؤں بھی اسی انداز سے متحرک ہو سکیں گے۔ سنا ہے سٹیج پر آنے کے بعد فنکار کو ہر دیکھنے والے کے وجود کو بھلا دینا چاہیئے۔ میں بھی یہی سوچ لوں گی کہ یہاں میرے علاوہ کوئی بھی نہیں ہے۔ جانے کیا ہوگا؟ کیا لوگ میرے رقص کو پسند کریں گے۔ تالیوں کی گونج مجھے کتنا سرشار کرے گی۔ میں اپنے لباس کو آراستہ کرلوں۔ ہر شکن مٹادوں کہ زندگی کی راہ میرے تصورات کی طرح ملائم اور ریشمی دکھائی دے۔

۲۰ / مارچ

آج میں بہت خوش۔ ہوں میرے سینے کے اندر جو آواز نہ جانے کب سے تکمیل کیلئے انگڑائی لے رہی تھی، وہ پوری ہو گئی۔ میں نے محفلِ رقص میں حصہ لیا۔ میری ہر ادا، ہر حرکت پر حاضرین نے داد دی۔ جھوم جھوم اُٹھے اور تو اور مجھے دوسری بار رقص کرنا پڑا۔ کتنی بڑی بات ہے۔ میرا مہمانوں سے تعارف کرایا گیا۔ حاضرین نے جی کھول کر تالیاں بجائیں۔ مجھے تو اپنی خوش نصیبی پر رشک آ گیا۔ دوسرے فنکار ساتھیوں کے ساتھ کافی پی رہی تھی کہ کوئی صاحب ملنے آئے۔ میرے دوسرے ساتھی انہیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ مجبوراً مجھے بھی اُٹھنا پڑا۔ انہوں نے آتے ہی میرے رقص کی تعریف کی۔ نرملا نے کہا یہ کمل کپور صاحب ہیں۔ ان کے کئی ہوٹل ہیں۔ کہنے لگے۔

"دیوی جی آپ سراپا فنکار ہیں۔ آپ کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔"

"لیکن کہاں اور کیسے" بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

انہوں نے کہا...... "میرے ہوٹل حاضر ہیں۔ ہر شام آپ ایک گھنٹے کا پروگرام دے

کر اپنے اندر پوشیدہ فنکارانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرسکتی ہیں۔" میری زبان جیسے بند ہوگئی۔

"آپ گھبرایئے مت۔آپ کو معقول معاوضہ دینے کے لئے تیار ہوں...... سوچئے اور مجھے جواب دیجئے"

یہ کہتے ہوئے وہ چلے گئے...... کیا یہ آفر مجھے قبول کرلینی چاہیئے؟ کہیں ماریا دیدی اور پاپا......؟؟

ابھی جلدی کیا ہے۔میں سوچ لوں گی، ان کو منالوں گی۔اگر میں نے یہ آفر قبول کرلی تو......؟!!!

۲۵/مارچ

کئی دِنوں سے سوچ رہی ہوں کہ مجھے کمل پور صاحب کی آفر قبول کرلینی چاہیئے یا نہیں ......اُدھر انہوں نے تین چار بار پیغام بجھوائے۔میریا دیدی اور پاپا کا خوف ہے۔ان سے بات کرنے کو من تو کرتا ہے لیکن ڈر محسوس ہورہا ہے! وہ میری بات سن کر شاید ناراض ہوں گے...... ہاں ناراض تو ہوں گے ہی؟ لیکن میں کیا کروں، میرے سینے میں ایک ہوک سی اُٹھ رہی ہے اور مجھے محسوس ہورہا ہے جیسے کوئی آواز میرے دل کی گہرائیوں سے اُبھر رہی ہو...... صنوبر ایسے موقعے بار بار نہیں آتے ......تم سراپا فنکار ہو۔اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرو...... یہ کیسی آواز ہے جو مجھے مجبور کررہی ہے۔کیا میرے من میں کوئی فنکار چھپا بیٹھا ہے......!

۲۷/مارچ

میں نے کمل کپور صاحب کے ہوٹل مرنیا میں ہر شام رقص وموسیقی کے پروگرام میں حصہ لینے کا فیصلہ کرلیا ہے اور کپور صاحب کو بھی اس کی اطلاع دے چکی ہوں۔ میں کل سے باقاعدہ وہاں جارہی ہوں۔ پاپا اور میریا دیدی کو ابھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود ہی جان جائیں گے۔میں انہیں سب بتادوں گی۔

۲۸/مارچ

آج پھر ایک بار مجھے یقین ہوگیا کہ میں رقص کرسکتی ہوں، ناچ سکتی ہوں۔آج ہوٹل

مرنیا بھرا پڑا تھا۔ اس سے پہلے بھی میں کئی بار اپنی سہیلیوں کے ساتھ یہاں چائے یا کافی پینے کے لئے آتی رہی ہوں لیکن آج میں یہاں ایک نئے روپ میں آئی، اچھی خاصی تعداد تھی۔ مرد ......عورتیں اور بچے ......آرکسٹرا کی دھنوں پر جب میں نے رقص کرنا شروع کیا تو مجھے کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ میں ناچتی رہی۔ ہوش تو مجھے اس وقت آ گیا جب ہال میں بیٹھا ہر فرد تالیاں بجا بجا کر مجھے آفریں کہہ رہا تھا۔ ہر نظر ہر نگاہ مجھ پر تھی۔ جانے لگی تو کپور صاحب نے کہا۔

''صنوبر جی ......آپ نے تو کمال کر دیا......''

۳۰/ مارچ

میریا دیدی اور پاپا کو پتہ چل گیا ہے کہ میں ہوٹل جاتی ہوں۔ پاپا نے شاید کسی اخبار میں اشتہار دیکھا تھا۔ انہوں نے کل رات مجھے خوب ڈانٹا۔ میں خاموش رہی ......وہ میرے درد کو نہیں پہچان سکتے!

۱۷/ اپریل

ایک طرف ہوٹل کا ماحول، یہ لوگ اور دوسری طرف گھر اور اس گھر میں دیدی ......نہ ہوٹل چھوڑ سکتی ہوں اور نہ ہی گھر۔ اس ماحول سے مجھے پیار ہے کہ اس نے مجھے وہ دیا جس کی میں متلاشی تھی۔ اس ماحول کو میں اب چھوڑ نہیں سکتی ......اور گھر کا ماحول......آج میں جو کچھ بھی ہوں میریا دیدی اور پاپا کی بدولت ہوں۔ وہ مجھے سہارا نہ دیتے تو آج صنوبر کا نام کوئی نہ جانتا۔ صنوبر کی ہر حرکت، ہر ادا پر سینکڑوں ہاتھوں میں جنبش نہ ہوتی۔ میریا نے ماں بن کر اور پاپا نے باپ بن کر میری پرورش کی۔ پڑھایا لکھایا رقص کی تعلیم دلائی۔ پاپا کہتے ہیں کہ انہوں نے مجھے رقص کی تعلیم و تربیت اس لئے نہیں دلائی کہ میں ہوٹلوں میں اجنبی نظروں کے سامنے ناچوں ......اور میں سوچ رہی ہوں کہ یہ تو ایک آرٹ ہے فن ہے جسے بند کمرے میں قید نہیں کیا جا سکتا......!!

۲۸/ اپریل

مجھے یہاں کام کرتے ہوئے ایک ماہ ہو چکا ہے۔ آج ایک اچھی خاصی رقم بھی مل گئی۔ میں نے یہ رقم میریا دیدی کو دینے کی کوشش کی، پاپا بھی تھے۔ انہوں نے لینے سے انکار

کیا۔اب میں انہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں اب اپنے پاؤں پر کھڑی ہونا چاہتی ہوں۔ان کا بھی سہارا بننا چاہتی ہوں۔

میریا دیدی سلونی کو بھی اب مجھ سے دور رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔نہ جانے کیوں؟!

ار مئی

پریتم کو میں پندرہ دنوں سے یہاں دیکھ رہی ہوں۔ہر شام آتا ہے اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر کافی پیتا ہے۔ایک بات میں نے نوٹ کی ہے میرا رقص ختم ہونے پر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آجاتی ہے۔وہ میری طرف کچھ ایسے دیکھتا رہتا ہے کہ میری پلکیں خود بخود جھک جاتی ہیں اور نہ جانے کس جذبے کے تحت شرمانے کو جی کرتا ہے۔

۵ر مئی

میں نے پریتم کے ساتھ بیٹھ کر کافی پی۔وہ کس قدر دلچسپ شخص ہے اور کیسی مدھر مدھر باتیں کرتا ہے......فوج میں کیپٹن ہے۔

۹ر مئی

کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ محبت شبنم کے موتیوں سے زیادہ نازک ہوتی ہے اور جب یہ دل کے پھول پر گرتی ہے تو سارے وجود میں ایک اَن دیکھی سی کیفیت چھا جاتی ہے...... میرے لئے پریتم نے کوئی ایسا ہی روپ تو نہیں اپنا لیا ہے؟ میں اسے چاہنے تو نہیں لگی ہوں...... نہیں تو؟! لیکن...... پھر اس کیفیت کو کیا نام دوں؟!

۱۵ر مئی

پریتم...... پریتم۔ہر لمحہ، ہر گھڑی اور ہر پل اس کی صورت نظروں کے سامنے رہتی ہے۔اس کی میٹھی میٹھی باتیں دل کو لبھاتی ہیں۔وہ جب بھی میری تعریفیں کرنے لگتا ہے تو میں شرما جاتی ہوں......!

اس کے بعد ڈائری کے کچھ اوراق ضائع ہوئے ہیں یا ضائع کئے گئے ہیں......!!

۱۲ر اگست

پریتم اور میں نے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میریا دیدی اور پاپا اس شادی سے ناخوش ہیں......

لیکن میں پریتم کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ میں اپنے اندر کے فنکار کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سلا سکتی ہوں۔ اپنے فن کا گلا گھونٹ سکتی ہوں مگر پریتم کے بغیر رہ نہیں سکتی...... پریتم کی چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں اور ہم دونوں یہاں سے جا رہے...... پاپا...... میریا دیدی...... سلونی...... سب کو چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ میرے خدا مجھے یہ کیا ہو گیا ہے......!

۳۰/اگست

یہ رات اس کمرے میں میری آخری رات ہے۔ کیسی عجیب رات ہے۔ یہ رات اپنے ساتھ خوشی لائی ہے اور غم بھی...... دکھ سکھ ایک دوسرے میں تحلیل ہو رہے ہیں۔ پریتم کو ہمیشہ کے لئے پانے کا خیال اور میریا دیدی اپنی بہن کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ جانے کا ڈر...... اس شفقت کو چھوڑ دوں جو مجھے میری بہن سے۔ پریتم کو چھوڑ دوں جو مجھ سے والہانہ پیار کرتا ہے......؟

(آگے کی تحریر صاف پڑھی نہیں جاتی...... سلونی مشکل سے کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی ہے)

میرا قلم کانپ رہا ہے۔ انڈین ائیر لائنز سے سیٹ بک...... نیلا آسمان...... اوپر ہی اوپر...... خاندانی عزت...... سلونی کا خیال رکھنا دیدی...... آخری سلام میری پیاری بہن......؟!!

کالج کی فضاؤں نے سلونی کے خیالات میں ایک نیا رنگ بھر دیا۔ اس نے موسیقی اور رقص کو ایک مضمون کی حیثیت سے لے لیا اور اپنی تمام تر توجہ اسی طرف دینے لگی۔ اپنی فرصت کا ہر لمحہ اس نے رقص اور موسیقی کے کمرے میں گزارنا شروع کیا۔ میوزک ٹیچر نے جب سلونی میں ان چیزوں کیلئے اتنی دلچسپی دیکھ لی تو وہ سلونی پر زیادہ توجہ دینے لگا۔ نئی نئی باتیں بتاتا رہا، سکھاتا رہا۔ سلونی بڑی خاموشی سے اس کی باتیں سنتی اور ان پر عمل کرتی۔ اکثر میوزک پیریڈ میں میوزک ٹیچر ہارمونیم بجاتا اور سلونی اس کی تان پر تھرک اُٹھتی۔ سوز و ساز میں جب اس کے جسم کی لرزش اور تھرتھراہٹ شامل ہو جاتی تو ان کا ملاپ بے حد خوبصورت ہو جاتا۔ کبھی کبھار کوئی گیت بھی اس

کے نرم نرم ہونٹوں پر تھرکنے لگتا......اب اسے آنٹی کے کمرے میں جانے کی ضرورت کم ہی محسوس ہوتی ۔ جب کبھی دل یا ذہن کے کسی گوشے سے آنٹی صنوبر کی تصویر ابھرتی محسوس ہوتی تو فوراً اس کی ڈائری نکال کر پڑھنا شروع کرتی اور خوب روتی ، صنوبر کیلئے صنوبر کے اَن دیکھے پیار کیلئے......!!

وہ من ہی من سوچتی ۔ "ممی، آنٹی صنوبر کے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کرتی ہے۔ڈیڈی نے بھی خاموشی اختیار کی ہے......کیاان کے دل میں صنوبر کیلئے ذرا بھی شفقت نہیں ......" یہ سوچتے سوچتے اس کے من میں نفرت کا ایک جذبہ اُمڈ آتا۔ اپنے ڈیڈی کے لئے ۔ اپنی ممی کے لئے ، اپنے ماحول کے لئے جہاں فن کی کوئی قدر نہیں ۔ جہاں فن کو پرکھنے والی نگاہ نہیں ۔اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے ......" کاش کوئی ان آنسوؤں کی قدر کرتا ۔ کوئی ان آنسوؤں کی کہانی سنتا......"!!

اور کبھی کبھار اسے آنٹی صنوبر کے لئے بھی نفرت کا ایک ہلکا سا احساس ہوتا۔ وہ سوچتی اس نے کیوں پریتم کو اپنا لیا۔ کیوں اپنے اندر کے فنکار کو ہمیشہ کے لئے سلا دیا۔ عجب شئے ہے یہ محبت ۔ آنٹی کو رقص سے محبت تھی ۔ موسیقی سے لگاؤ تھا تو...... کسی اور سے محبت کیوں کی ...... پریتم سے پیار کیوں کیا......!

وقت کا پہیہ گھومتا رہا!

کالج کے ہر لڑکے اور لڑکی کی زبان پر اب سلونی کا نام تھا۔ کالج میں جب بھی رقص یا موسیقی کا کوئی پروگرام ہوتا ، کوئی فنکشن ہوتا سلونی کا نام اس میں پیش پیش ہوتا ۔ کچھ شرارتی لڑکوں نے اسے کالج کی رقاصہ کا نام دے رکھا تھا۔

ادھر ماریا ان سب باتوں سے بے خبر تھی ۔ وہ سمجھتی تھی کہ لڑکی کالج میں پڑھتی ہے اس لئے اس کے سوچنے اور سمجھنے کے انداز میں زیادہ پختگی آئی ہے۔ وہ خود اپنا برا بھلا سوچ اور سمجھ سکتی ہے۔ اس لئے سلونی کی زندگی میں اب اس کا زیادہ دخل نہ تھا۔ خاص طور پر کالج کی زندگی کا۔ اسے اس بات کا بھی اندازہ نہ تھا کہ سلونی اپنی آنٹی کے نقشِ قدم کو اپنا رہی ہے۔!

سلونی کے ڈیڈی اور ممی چند دنوں کے لئے باہر گئے تھے لیکن یہ چند دِن سلونی کی زندگی میں ایک نیا پیغام، ایک نیا ولولہ اور ایک نیا حسن لے کر آ گئے۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ دونوں وقت کا کھانا آنٹی مونیکا کے گھر سے آتا تھا۔ کالج سے آنے کے بعد وہ آنٹی کے کمرے میں جاتی۔ ہر شام آنٹی کے کمرے کا دروازہ کھلتا۔ وارڈ روب میں لٹکا آنٹی کا خوبصورت لباس سلونی کے تن پر سجنے سنورنے لگتا...... وہ معمول کی ایک شام تھی، سلونی آنٹی صنوبر کے کمرے میں اس کا قیمتی لباس زیبِ تن کئے باہر کی دنیا سے بے خبر اپنی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ آنٹی مونیکا چلی آئی او رسلونی کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے پاؤں ساکت ہو گئے۔ جیسے اس کے جسم میں جان نہ ہو بلکہ وہ پتھر کی ایک مورتی ہو۔ خاموش بے حس مورتی......!

سلونی نے اسے دیکھا ایک لمحے کے لئے وہ گھبرا گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ بگڑ گیا لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

''آؤ......آؤ آنٹی مونیکا''

مونیکا جیسے کسی گہرے سپنے سے جاگ اُٹھی!

وہ اندر آئی...... سلونی کے قریب اور قریب۔ اس نے سلونی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

آنٹی مونیکا'' سلونی نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا''

''میری طرف دیکھ...... میری طرف''

''کیا ہے آنٹی''

وہی آنکھیں، وہی چہرہ، وہی بال، وہی رنگ و روپ، وہی لباس۔ سب کچھ وہی...... سب کچھ صنوبر جیسا''

''آنٹی...... آنٹی میں سلونی ہوں...... صنوبر نہیں''

''ہاں جانتی ہوں کہ تم صنوبر نہیں، سلونی ہو لیکن نام میں کیا رکھا ہے، بیٹی سلونی''

آنٹی مونیکا روتی ہوئی واپس چلی گئی۔ یہ لمحہ کیسا تھا جس نے سلونی کو صنوبر کا روپ دیا

تھا۔سلونی کی آنکھوں میں یہ کیسا پیغام تھا جس نے آنٹی مونیکا کو رونے پر مجبور کیا۔یہ کیسی دھڑکن تھی جو رفتہ رفتہ اس کے دل اور ذہن پر ایک نقش بنا رہی تھی۔

رات کے کھانے پر سلونی نے آنٹی مونیکا کے ساتھ صنوبر کا ذکر چھیڑا۔سلونی نے کتنی ہی باتیں کہیں لیکن مونیکا نے کوئی جواب نہ دیا۔وہ خاموشی سے مونیکا کو دیکھے جا رہی تھی۔

اچانک جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ گیا۔سلونی نے کہا

"کاش آنٹی صنوبر زندہ ہوتی"

"کون کہتا ہے کہ صنوبر مر چکی ہے وہ زندہ ہے اور......"

"ہاں"

"لیکن ممی"

"تمہاری ممی جھوٹ کہتی ہے۔تمہاری آنٹی ممبئی میں ہے اور اپنے خاوند کے ساتھ رہتی ہے۔ان کے دو بچے بھی ہیں۔"

"لیکن آنٹی مونیکا تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہے،"

"میں سب جانتی ہوں،سب کچھ......تمہاری ممی بھی جانتی ہے تمہارا ڈیڈی بھی واقف ہے......"

سلونی ایک ہی سانس میں صنوبر کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتی تھی۔

"اب بھی اس کے خط تمہاری ممی کے نام آتے ہیں۔میں نے خود خط پڑھے ہیں۔تمہاری ممی اپنی بہن سے شدید نفرت کرتی ہے۔وہ اس کا منہ تک دیکھنا نہیں چاہتی۔"

"میرا بس چلے تو میں......"اس کے آگے سلونی کچھ بھی نہ بول سکی اور اس کا گلا بھر آیا اور روتے روتے کہا۔

"آنٹی مونیکا،مجھے صنوبر کا ایڈرس بتادو۔میں اسے خط لکھوں گی،اسے اپنے پاس بلاؤں گی۔وہ نہیں آئے گی تو خود چلی جاؤں گی......آنٹی......پلیز آنٹی"

مونیکا خاموش ہوگئی۔

''تم جانتی ہو کہ میں آنٹی سے کس قدر پیار کرتی ہوں''

مونیکا چونک پڑی...... ''سلونی، میری بات سنو''

''تم اس کا ایڈرس نہیں بتاؤ گی تو میں خود اس کی تلاش میں ممبئی جاؤں گی۔''

''میری بات سنو''

''میں اب کچھ بھی سننا نہیں چاہتی...... میری آنٹی زندہ ہے۔''

''میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا کہ تمہاری آنٹی زندہ ہے۔ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ تم اسے کس قدر محبت کرتی ہو...... تمہاری آنکھیں، تمہارے بال، تمہارا چہرہ اور رنگ ولباس دیکھ کر اچانک صنوبر کی صورت نظروں کے سامنے پھر گئی اور میں نے اس کا ذکر چھیڑ دیا۔

''تم نے بھی میری ماں کی طرح جھوٹ بولنا شروع کر دیا ہے...... میری آنٹی صنوبر زندہ ہے میں اس کے پاس جاؤں گی۔ اس کے سامنے رقص کروں گی اور بتاؤں گی کہ اس نے میرے روپ میں ایک بار پھر جنم لیا ہے۔''

مونیکا سٹپٹا گئی، لیکن وہ مجبور تھی۔ بات اس کے منہ سے نکل چکی تھی۔

''میرے پاس تمہاری آنٹی کا ایڈرس نہیں البتہ تمہاری ممی یا ڈیڈی کے پاس ضرور اس کا کوئی نہ کوئی خط ہوگا...... میں نے کہا کہ کبھی کبھار اس کے لیٹر آتے رہتے ہیں۔ وہ خط تلاش کرو...... شاید صنوبر کا ایڈرس مل جائے۔''

اس رات سلونی نے اپنے گھر کی ایک ایک چیز دیکھ ڈالی مگر اسے صنوبر کا کوئی خط نہ ملا۔ اس رات وہ سو نہ سکی......!!

اس روز کالج کی سالانہ تقریب تھی۔ شہر کے ذی عزت اور صاحب اقتدار لوگوں کے علاوہ طلباء اور طالبات کے والدین کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ سالانہ تقریب کی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ باہر کے گیٹ سے لے کر کالج کی بلڈنگ تک سب خوب سجایا گیا تھا۔ ہر طرف پھولوں کے رنگ برنگی گیٹ بنے تھے۔ رات کے اندھیرے میں بجلی کے رنگ برنگے قمقمے جھلملا رہے تھے۔ پھول ہنس رہے تھے اور زندگی مسکرا رہی تھی۔ دوسرے والدین کے ساتھ ساتھ سلونی کی ممی اور

ڈیڈی بھی ہال میں موجود تھے۔

پروگرام کا آغاز پرنسپل کے ایڈرس سے ہوا۔ انہوں نے کالج کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد ایک ڈرامہ کھیلا گیا۔ ایک محفل رقص و موسیقی کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ جب سٹیج سیکرٹری نے مس سلونی کا نام لیا تو ایک لمحے کے لئے جیسے سلونی کی ممی کی دل کی دھڑکنیں بند ہوگئیں۔ اس کا بس چلتا تو سارے ہال کو آگ لگا دیتی۔ ہاں آگ جو اس کے من میں لگ چکی تھی اور جس نے اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ سٹیج سیکرٹری نے ابھی ابھی اعلان کیا تھا......

"حاضرین اب کالج کی سکنڈ ائیر کی طالبہ مس سلونی آپ کے سامنے رقص پیش کر رہی ہیں۔ مس سلونی

اس کے بعد سٹیج سیکرٹری نے کیا کہا۔ ممی نے کچھ بھی نہ سنا۔ اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس دیں۔ اسی دوران ہال کی روشنی گل ہوگئی، پردہ اُٹھ گیا، رنگ برنگی روشنی کے درمیان سلونی نے اپنا رقص شروع کیا......

لگ رہا تھا جیسے سٹیج پر کنول کا پھول کھل اُٹھا ہو اور مسکرا رہا ہو......اور ممی اس سوچ میں پڑ گئی کہ یہ سلونی ہے یا صنوبر۔ سلونی نے جو لباس پہن رکھا تھا وہ صنوبر کے لباس سے مختلف نہ تھا۔ ساز بجتے رہے۔ شاخ جھکتی رہی۔ پاؤں تھرکتے رہے، بازو لہراتے رہے اور رقص ہوتا رہا......!

سلونی کی ہر ادا، ہر حرکت پر حاضرین کی تالیوں سے ہال گونجتا رہا۔

اس کے بعد انعامات کی تقسیم تھی۔ ممی سے یہ منظر نہ دیکھا گیا۔ وہ اس آگ پر قابو نہ پا سکی جو اس کے من اور تن کو لپیٹ میں لے چکی تھی۔

گھر آتے ہی وہ سب سے پہلے صنوبر کے کمرے میں گئی۔ اندر قدم رکھتے ہی اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ آج وہ اتنی مدت کے بعد اس کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کمرے کی ایک ایک چیز اسے بھولی بسری کہانی یاد دلا رہی تھی۔ جس کا ہر نقش ہر خیال وہ اپنے

ذہن سے مٹا چکی تھی لیکن اب اس کمرے میں آکر وہ کہانی ایک بار پھر زندہ ہوگئی تھی۔ اس کہانی کا ہر نقش قالین کے نقش و نگار کے روپ میں مسکرا رہا تھا۔ ہر خیال قد آدم آئینے میں جگمگا رہا تھا۔ میریا نے اپنے آپ کو سنبھالا اور لرزتے ہاتھوں سے وارڈ روب کا دروازہ کھولا۔ سب چیزیں ایسی ہی تھیں جیسے صنوبر چھوڑ کر چلی گئی تھی مگر صنوبر کا وہ لباس غائب تھا جو وہ اکثر رقص کرتے وقت استعمال میں لاتی تھی۔

وہ باہر آکر سلونی کا انتظار کرنے لگی۔

سلونی کافی دیر سے گھر لوٹ آئی!

''سلونی'' میریا نے چلاتے ہوئے کہا

''کیا ہے ممی!

''تم نے کس کی اجازت سے رقص کی محفل میں حصہ لیا''۔

سلونی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک ہاتھ ہوا میں لہرایا اور سلونی کے نرم و نازک گال پر ایک نشان پڑ گیا۔

سلونی پھر بھی خاموش رہی۔

''تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتی''

''ممی''، سلونی نے کہا...... ''تم اس سوال کا جواب اپنے من سے بھی پوچھ سکتی ہو''۔

اور پھر نہ جانے کیا ہوا۔ ہاتھ ہوا میں ایک بار پھر لہرایا اور لہراتا ہی رہا۔ ''ممی''، سلونی نے کہا ''تم اپنے من سے، اپنے آپ سے اس سوال کا جواب نہیں پوچھ سکتی۔ کیونکہ تمہارے دل میں نفرت ہے اپنی بہن کیلئے اور جس کا انتقام اب تم مجھ سے لینا چاہتی ہو۔ رقص کرنا کوئی گناہ نہیں۔ یہ تو آرٹ ہے اور اسے دیکھنے کے لئے آنکھ چاہیئے۔ سمجھنے کے لئے شعور چاہیئے جو تم میں نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو تم اپنی زندگی میں اس بہن کو گھر سے بے گھر نہ کرتی جس کی تم نے ماں بن کر پرورش کی...... تم کہتی تھی کہ آنٹی صنوبر مر چکی ہے لیکن آج ممی تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ میری آنٹی اور آپ کی بہن زندہ ہے۔ ممبئی میں رہتی ہے اور اس کے دو بچے ہیں۔''

''تمہیں یہ سب کچھ کس نے بتایا۔''

''ممی تم میری آنکھوں میں جھانکو، اپنے دل میں ڈوب کر بتاؤ، کیا آنٹی صنوبر زندہ نہیں ہے۔''

''وہ میرے لئے مرچکی ہے۔''

''لیکن میرے لئے نہیں۔ میں نے آنٹی صنوبر کے کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھا ہے۔ اُس کمرے کے در و دیواروں نے کئی بار میرے گھنگروؤں کی آواز کو اپنے اندر چھپالیا ہے اور ...... میں نے خود آنٹی کی ڈائری کو پڑھا ہے۔ ایک بار نہیں کئی بار، سینکڑوں بار۔ اس ڈائری کا ایک ایک لفظ میرے دل کی کتاب پر لکھا ہوا ہے۔ میں سب جانتی ہوں۔''

کمرے میں سلونی کے ڈیڈی بھی آ گئے اور وہ اپنی بیوی کو کمرے سے باہر لے گئے۔

ممی کے جانے کے بعد سلونی کو محسوس ہوا کہ اس کے دل کے جہلم میں جو سیلاب آ گیا تھا وہ اب اُتر چکا ہے، شانت ہو گیا ہے۔

اندر کمرے میں ڈیڈی اپنی بیوی میریا سے کہہ رہا تھا۔

''لڑکی بالغ ہو چکی ہے اور بالغ لڑکی پر ہاتھ اُٹھانا زیب نہیں دیتا۔''

چند دنوں کے بعد سلونی کا کالج جانا بند کر دیا گیا۔ صنوبر کے کمرے کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ اسی دوران سلونی کو صنوبر کا ایک خط ملا گو کہ یہ خط بہت پرانا تھا لیکن خط کے ایک حصے میں صنوبر کا ایڈرس صاف صاف لکھا تھا......!

سلونی نے یہ خط چھپالیا......!!

سلونی کئی راتیں سو نہ سکی۔ وہ ایک عجیب سی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو چکی تھی۔ دل پر بوجھ تھا اور نگاہوں کے سامنے مختلف تصویریں ابھر رہی تھیں۔ ایک طرف پاپا اور ممی دوسری طرف آنٹی صنوبر اور اندر چھپا فنکار...... کئی دن اور کئی راتیں وہ زندگی کے ایک ترازو سے دوسرے ترازو میں لٹکتی رہی اور پھر ایک دن اس نے ایک فیصلہ کر لیا...... اس فیصلے پر وہ اداس ہوئی اور خوش بھی۔ اس کی آنکھوں نے آنسو بھی بہائے اور لبوں نے مسکراہٹ کے پھول بھی بکھیر دیئے......!

سلونی نے اپنی ممی کو ایک خط لکھا۔

ممی!

یہ میری زندگی کا پہلا اور آخری ہے جو میں تمہیں لکھ رہی ہوں۔ آج یہ خط لکھتے ہوئے میں اُداس بھی ہوں اور خوش بھی۔ اداس اس لئے کہ میں تم کو چھوڑ کر جا رہی ہوں اور خوش اس لئے کہ میں اپنی آنٹی کو پانے کے لئے جا رہی ہوں میں۔ جانتی ہوں کہ تمہارے دل میں میرے لئے کتنے ارمان ہوں گے۔ تم نے کتنی بار سپنوں میں مجھے دلہن بنتے دیکھا ہوگا۔ تم نے کتنی بار ڈھولک اور بابل کے گیت سنے ہوں گے، کتنی بار تمہارے گھر کے دروازے پر شہنائیاں بجی ہوں گی۔ نہ جانے کتنی بار تم نے نیند میرے ہاتھوں کو چوما ہوگا۔ جانتی ہوں کہ تم نے صنوبر کیلئے بھی ایسے ہی سپنے دیکھے ہوں گے۔ ایسے ہی سوچا ہوگا۔ تمہارا کوئی قصور نہیں ممی لیکن صنوبر کی دنیا وہ تھی جو تم نے سپنے میں دیکھی تھی یا جس کا تصور تم نے جاگتے میں کیا تھا۔ صنوبر کی دنیا میں فن اپنی بلندیوں کو چھو رہا تھا، وہی میری دنیا بھی ہے۔ ہماری اس دنیا سے تمہیں نفرت ہے۔ مجھے جس روشنی کی تلاش ہے وہ تمہاری دنیا میں میسر نہیں!

میں صنوبر آنٹی کے پاس جا رہی ہوں۔ میں جان گئی ہوں کہ وہ کہاں رہتی ہے، اس لئے میرے لئے فکر مند نہ ہونا۔ ہو سکے تو میری غلطیوں کو معاف کرنا۔ ڈیڈی کا خیال رکھنا اور اپنا بھی!

اچھا ممی میں جا رہی ہوں اپنی منزل پانے کے لئے، اپنی آرزوؤں کی تکمیل کیلئے یسوع مسیح سے میرے لئے دعا مانگنا، میری اپنی ممی......!!

سلونی

میریا کو جب سلونی کا یہ خط ملا تو وہ کب کی جا چکی تھی۔

میریا کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی......ایک بھیانک اور طویل تاریکی......!!

نیا شہر، نئے لوگ، نیا ماحول......سلونی کے خوابوں کی دنیا ممبئی!

ٹرین سے اُترتے ہی سلونی کو احساس ہوا کہ وہ اکیلی ہے، تنہا ہے اور زندگی کا طویل

سفر اب شروع ہو رہا ہے۔ اسے دور بہت دور جانا ہے۔ اُسے آنٹی صنوبر یاد آئی اور بے ساختہ اس کا ہاتھ اس جیب کی طرف بڑھ گیا جہاں صنوبر کا ایڈرس موجود تھا۔

''میم صاحب'' آپ کا سامان''

وہ چونک پڑی۔

''یہ اٹیچی''

سٹیشن سے باہر آئی۔ باہر آ کر اس کی نظروں کے سامنے واقعی ایک نیا شہر تھا۔ ایک ہی لمحے میں کتنے لوگ، کتنے چہرے سب کے سب اجنبی۔

''میم صاحب، ہوٹل''

''میم صاحب، کدھر جانا مانگتا''

''میم صاحب، ہمارا ہوٹل اچھا ہے اور سستا بھی''

''میم صاحب، تاج لے چلوں آپ کو''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے پاس جواب دینے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ اپنی آنٹی سے ملنے آئی تھی۔ ایک نئی دنیا بسانے کیلئے، ایک نئے خواب کی تعبیر کی تلاش میں!

''ٹیکسی''

ٹیکسی آئی اور قلی نے سامان رکھا، وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

اچانک ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی ...... لگتا ہے سالی ممبئی ایکٹرس بننے کیلئے آئی ہے۔''

''پر بل تو دیکھو۔ چار دنوں میں پتہ چل جائے گا۔'' کسی نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک موٹی سی گالی دی جو سلونی نے پہلی بار زندگی میں سنی تھی۔ اس کا جی کر رہا ہے کہ اس لفنگے کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مار دے اور ......!

''کہاں چلنا ہے میم صاحب: اس کے خیالات کا رخ بدل گیا۔

''کھار''

''کون سی سڑک''

''بارہویں''

ٹیکسی خراٹے بھرتی رہی۔ سلونی اُدھر ادھر دیکھتی رہی۔ بڑے بڑے مکان اونچے اونچے مکان، بڑی بڑی دکانیں۔ مشینوں کی طرح چلتے پھرتے لوگ۔ ایک دوسرے سے بے خبر اپنی دینا میں گم......!

ٹیکسی رک گئی۔

سلونی کا ہاتھ ایک بار پھر جیب کی طرف بڑھ گیا، اس نے کاغذ کا پرزہ نکالا اور اسے پڑھنے لگی......!

کیپٹن پرتیم پال

شانتی نِواس ۱۲/رویں سڑک، کھار ممبئی ۵۲۔

''ذرا دیکھو تو شانتی نِواس کہاں ہے۔''

ڈرائیور دیکھنے چلا گیا تو سلونی کے من میں خیال آیا......'' مجھے آنٹی کو پہلے لیٹر لکھ لینا چاہیئے تھا تا کہ وہ میرا انتظار کرتی۔ کیا وہ مجھے پہچان سکے گی۔ ارے کیوں نہیں۔ سب ہی تو کہتے ہیں کہ ہم دونوں کی صورت ملتی ہے۔ وہ مجھے دیکھے گی تو کس قدر خوش ہوگی۔ اس کے بچے اور کیپٹن صاحب بھی......!

''میم صاحب، شانتی نواس سامنے ہے''

ٹیکسی سے سامان اُترا اور قلی نے اسے شانتی نِواس تک پہنچا دیا۔ سلونی نے اپنے مختصر سے سامان کو لان میں رکھا اور اوپر جا کر اپنی آنٹی کا پتہ کرنے گئی۔

ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک۔ ایک سیٹ سے دوسرے سیٹ تک۔ ایک چہرے سے دوسرے چہرے تک۔ کوئی بھی کیپٹن پرتیم پال کو جانتا نہ تھا۔ سلونی گھبرا گئی۔

''کیا یہ شانتی نواس نہیں ہے۔''

جواب ملتا ہے شانتی نِواس تو یہی ہے۔

"کیپٹن پرتیم پال، اس کی بیوی صنوبر اور دو بچے"

گردن نفی میں ہل جاتی۔

شانتی کہیں نہ تھی، صرف نواس رہا گیا تھا۔

"یہ کیسے لوگ ہیں جو ایک ہی بلڈنگ میں رہتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو نہیں جانتے ۔ایک بلڈنگ، ایک مکان، ایک گھر لیکن ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں کوئی سمبندھ نہیں ......"

سلونی جس سہارے یہاں آئی تھی وہ سہارا چھوٹ گیا تھا۔ جو سفر اس نے امنگوں اور حوصلوں سے شروع کیا تھا وہ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی محرومیوں اور مایوسیوں میں بدل گیا تھا۔ زندگی کو روشن دیکھنے کی جو تمنا اس کے دل میں ابھر آئی تھی وہ دھیرے دھیرے تاریکی میں گم ہو گئی تھی اس نے اپنی آنٹی کے سہارے، اپنے فن کے سہارے کائنات کو حسین بنانے کا جو خواب دیکھا تھا وہ خواب وہ سپنا آنکھ کھلنے سے پہلے ہی ٹوٹ گیا تھا..........!

وہ مایوس ہو کر پھر لان میں لوٹ آئی۔ اس کا ہاتھ ایک بار پھر جیب کی طرف بڑھ گیا۔ چھوٹے سے کاغذ پر لکھا ہوا ایڈریس اب بھی موجود تھا اور مسکرا مسکرا کر اس کا مذاق اُڑا رہا تھا...... اس نے ایڈریس کو جیب میں رکھا اور اس کا ہاتھ ان چکنے چکنے نوٹوں سے ٹکرا گیا جو اس نے بچپن سے لے کر اب تک سنبھال کر جمع کئے تھے۔

اب یہی چند نوٹ اس کا سہارا تھے۔ کاغذ کے یہی رنگدار پُرزے اس کی کائنات تھے۔

سامان پھر ٹیکسی میں رکھا گیا

"کہاں لے چلوں، میم صاحب"

"کوئی اچھا اور سستا ہوٹل"

ٹیکسی پھر ان ہی سڑکوں پر دوڑنے لگی جن پر ابھی چند لمحے پہلے سلونی نے ایک اُمنگ، ایک خواہش لے کر سفر شروع کیا تھا۔ اس لمحے وہ سڑک کتنی خوبصورت تھی کہ وہ سلونی کو اپنی آنٹی سے ملانے جا رہی تھی سڑک وہی تھی لیکن کس قدر بدصورت کہ آنٹی ملنے سے پہلے ہی بچھڑ گئی تھی۔

ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا، چھوٹے سے کمرے تھے اور شاید چھوٹے سے لوگ بھی تھے۔
ایک چھوٹے سے کمرے میں سلونی نے اپنا اٹیچی رکھا، اسے کھولا، منہ ہاتھ دھویا اور چائے پی۔

شام کے طویل سائے رات کی تاریکیوں میں بدل گئے۔

سلونی سو نہ سکی۔ نیند جیسے آنٹی صنوبر کی طرح کہیں دور چلی گئی تھی۔

دل سے آواز آئی ...... "واپس جاؤ...... واپس جاؤ...... یہ ممبئی ہے۔

یہاں کے لوگ ایک دوسرے کو نہیں جانتے، نہیں پہنچانتے...... تمہیں کیا پہنچانیں گے۔

ذہن نے سرگوشی کی۔

"تم آنٹی سے ملنے آئی تھی، اپنے فن کو جلا بخشنے کے لئے آنٹی نہ ملی تو کیا ہوا؟ فن تمہارے پاس ہے۔ آرٹ تمہارے پاؤں کی تھرک میں پوشیدہ ہے۔ اگر تم میں ہمت ہے تو یہ لوگ خود ایک دن تمہیں پہنچاننے کیلئے مجبور ہوں گے۔"

دل سے پھر آواز آئی۔

"تنہا ہو، خوبصورت ہو، جوان ہو۔ مردوں کی نگاہیں فوراً تمہاری خوبصورتی اور جوانی کو پہچان سکتی ہیں۔ اب بھی وقت ہے، لوٹ جاؤ۔"

"کہاں"

"اپنے گھر"

"گھر...... کون سا گھر، کس کا گھر۔ جو میرا گھر تھا وہ اب میرے لئے اجنبی بن چکا ہے اس گھر کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے ہیں۔ ایسے ہی جیسے صنوبر کیلئے ہوئے تھے......"

"تو میں کیا کروں"، سلونی جیسے گہری نیند سے بیدار ہوئی اور ایک بار پھر اسے احساس ہوا کہ وہ تنہا ہے لیکن تب بھی تو وہ تنہا تھی جب ہوا کے ایک جھونکے سے آرزوؤں کے کتنے سرسبز پتے پھوٹ آئے تھے۔ دل کی کہانی کو عنوان مل گیا تھا۔ تب اور اب میں فرق ہے...... پھول پیاسا ہے۔

دوسری صبح وہ پھر شانتی نواس گئی۔ ایک بار اور اس سڑک نے اس کے قدموں کی آہٹ کو چوما۔

شانتی نواس ایسے ہی کھڑا تھا...... وہی کمرے...... وہی لوگ...... وہی چہرے لیکن کیپٹن پریتم پال کا کوئی کمرہ نہ تھا، کوئی گھر نہ تھا۔ ایک بڑھیا جس کے چہرے کے کھنڈر اس کے بنگالی ہونے کی نمائندگی کررہے تھے، سلونی کی پریشانی اور گھبراہٹ کو سمجھ گئی۔

"بیٹا، تم کس کیپٹن پریتم پال کو ملنا مانگتا۔"

اب وہ کیا جواب دیتی کہ وہ کس کیپٹن پریتم پال کو ملنا چاہتی ہے۔ اس نے پریتم کو دیکھا ہی کہاں تھا۔ اس کی صورت تک نہ دیکھی تھی اور آنٹی......؟!

بڑھیا نے اپنی بات جاری رکھی

"ایک فوجی آفیسر ادھر ضرور رہتا تھا، اس کا وائف...... کیا نام تھا اس کا...... یاد نہیں آرہا ہے...... ہاں...... ہاں......"

"صنوبر"، سلونی نے اس کی بات پوری کی۔

"صنوبر...... ہاں صنوبر اس کا دو بچہ"

"ہاں میں اسی کیپٹن پریتم پال کو تلاشی کررہی ہوں جس کی بیوی صنوبر ہے اور جن کے دو بچے ہیں۔ وہ لوگ اب کہاں ہیں"

"تم ان لوگوں کو تلاش کرتا ہے وہ تو کب کا آسام چلا گیا۔"

"آسام"

"ہاں ان کا پرموشن ہوا تھا اور ٹرانسفر بھی...... تم اس کا کیا لگتا"

اس سوال کا سلونی کے پاس کوئی جواب نہ تھا...... وہ نامراد واپس آئی......!!!

کئی دن بیت گئے، وہ واپس جانے کی کشمکش میں ڈوب گئی۔ یہاں تک کہ اس کے پاس جو پیسہ تھا ختم ہوگیا اور اب ہوٹل میں ٹھہرنا ناممکن بنتا جارہا تھا...... وہ اب کہاں جائے کیا کرے......؟!

ہوٹل کے مالک رحمان دادا کو یہ جانکاری مل چکی تھی کہ سلونی کے پاس اب کوئی پیسہ نہیں، اس نے کمرے سے باہر نکلنا بھی بند کر دیا ہے۔

وہ اس کے کمرے میں آیا......

"تم نے کئی دنوں سے ہوٹل کا بل نہیں چکایا۔"

سلونی گھبرا گئی، خدا جانے اب کیا ہوگا اس کا ہاتھ سینے کی طرف اٹھ گیا۔

"ہاں سلونی نے گھبراتے ہوئے کہا

"کیوں نہیں چکایا"

"اس لئے کہ اب میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے۔"

"میم صاحب، میں نے یہ ہوٹل اُدھار دینے کے لئے نہیں کھولا ہے۔"

"میں جانتی ہوں"

"پھر ہمارا پیسہ......؟

"خاموشی......طویل خاموشی!

"تم ادھر کیسے آیا"

"اپنی آنٹی سے ملنے"

"تمہارا آنٹی کدھر ہے"

"وہ وہاں چلی گئی ہے جہاں میں نہیں جاسکتی" سلونی رونے لگی"

رحمان دادا کی صورت بڑی ڈراؤنی تھی اس نے اپنی زندگی میں کتنی پستیاں اور بلندیاں دیکھی تھیں۔ سلونی کو روتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوگئی۔ اس کے ہاتھ کئی بار سلونی کی جانب بڑھے لیکن نہ جانے کیا سوچ کر پلٹ آئے۔ آخر ایک بار بڑھ ہی گئے......

"بیٹی تم کیا چاہتی ہو" رحمان داد کا اندر کے انسان جاگ اُٹھا،

سلونی نے اپنی پلکیں اُٹھا کر دیکھا۔ رحمان دادا کی آنکھوں کی وہ تیز چمک نہ جانے

کہاں غائب ہو چکی تھی!

سلونی نے اپنی ساری کہانی سنا دی!

رحمان دادا نے کہا...... ''یہ ممبئی ہے۔یہاں کوئی کسی کا نہیں۔کوئی کسی کو نہیں جانتا۔کوئی کسی کو نہیں پہچانتا...... تم خوبصورت ہو جوان ہو، زمانہ خراب ہے۔لوگ بُرے ہیں۔گھر واپس لوٹ جاؤ''

''لیکن میں گھر واپس نہیں جاسکتی''

''گھر نہیں جاسکتی تو نوکری کرو''

''کہاں''

''وہ میرے ذمہ ہے تم فنکار ہو رقص کرسکتی ہو۔میں تمہیں نوکری دلوادوں گا......''

سلونی سوچنے لگی کہ رحمان دادا کی صورت میں یہ فرشتہ کہاں سے آ گیا۔رحمان دادا کئی دن نہ ملا۔اس نے اپنے کمرے کے ویٹر سے پوچھا۔اس نے کوئی جواب نہ دیا۔سلونی کو وقت پر چائے ملتی کھانا ملتا۔ضرورت کی ہر چیز مل جاتی اور پھر ایک دن رحمان دادا اس کے کمرے میں آ گیا اور دوسرے دن سلونی کو ہوٹل انورادھا لے گیا۔

ہوٹل انورادھا......!

اس ہوٹل میں ہر شام رقص کا پروگرام...... دو گھنٹے کی نوکری معقول معاوضہ......

اس رات سلونی بہت جلد سو گئی۔ایک فرشتہ اس کے سرہانے کھڑا اس کی خوبصورتی اور جوانی کی نگرانی کر رہا تھا......!

سلونی نے جس آرزو کی تکمیل کے لئے یہ اجنبی گھر اپنا لیا تھا وہ آرزو شاید اپنے گھر میں آنٹی صنوبر کے کمرے میں کہیں رہ گئی تھی۔جس قالین کے نقش و نگار پر اس کے پاؤں تھرک اٹھتے تھے ان میں اور ہوٹل انورادھا کے چکنے سپید فرش میں ایک طویل فاصلہ تھا......ایسا فاصلہ جو ایک گھر سے بے گھر ہونے تک ہوتا ہے!

وہی سلونی تھی۔

وہی رقص تھا...... لیکن فاصلہ کس قدر طویل تھا۔

ہر شام جب آرکسٹر کی دھنیں ہوٹل انورادھا کی فضا میں بکھر جاتیں اور سپید چکنے چکنے فرش پر سلونی کا رقص شروع ہو جاتا تو کتنی ہی نگاہیں سلونی کو گھورتیں۔ اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتیں۔ ان نگاہوں میں کتنے اشارے ہوتے۔ جب اس کا رقص ختم ہو جاتا، آرکسٹرا کی دھنیں خاموش ہو جاتیں اور سارا ہال تالیوں کی گونج سے کانپ اُٹھتا۔ لوگ مسکرا مسکر کر سلونی کا سواگت کرتے۔ ان مسکراہٹوں میں کتنے پیغام ہوتے، کتنے اشارے ہوتے، سلونی اب بخوبی جان گئی تھی۔

کلی اب بھی تنہا تھی

پھول اب بھی پیاسا تھا

سلونی نے رحمان دادا کا ہوٹل چھوڑ کر دو کمروں کا یک فلیٹ لے لیا۔ اب اسے لینے کے لئے ہر شام انورادھا ہوٹل کے مالک کھنہ کی کار آجاتی اور پروگرام دینے کے بعد وہی کار چھوڑنے جاتی۔ سلونی اب اس قدر مقبول ہو چکی تھی کہ شام ہوتے ہی انورادھا ہوٹل میں تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی۔ سلونی کے رقص (رقص ایک بہانہ تھا) جسم میں دلچسپی رکھنے والے وقت سے پہلے ہی چلے آتے یا ریزرویشن کراتے......! سلونی کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ ہوٹل انورادھا کا مالک بھی یہ بات جانتا تھا، اسی لئے وہ سلونی کی کوئی بھی بات ٹالنا نہیں چاہتا تھا۔

جب سلونی تھکن سے چور اپنے فلیٹ میں آتی تو اسے یکدم اپنی تنہائی کا احساس ہوتا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں اور اس کی نظروں کے سامنے کبھی آنٹی صنوبر کی صورت پھر جاتی اور کبھی اپنے پاپا اپنی ممی کی......!!

"یہاں آکر مجھے کیا ملا۔ گھورتی ہوئی نگاہیں جن میں اشارے پوشیدہ ہیں۔ مسکراتے ہوئے لب جن میں پیغام بکھرتے ہیں۔ ان اشاروں اور ان پیغاموں میں میرے فن کی کوئی قدر نہیں۔ یہ اشارے اور یہ پیغام میرے جسم کے لئے ہیں۔ میری جوانی کے لئے ہیں...... کاش کوئی میری روح میں اترنے کی کوشش کرتا......"

اور وہ رونے لگتی!

اُسے لگتا جیسے اس کے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی چھا گئی ہو اور اس تاریکی میں رحمان دادا کی صورت میں ایک فرشتہ کھڑا ہے۔

''کاش میں نے رحمان دادا کی بات مان لی ہوتی۔ اس وقت کچھ بھی نہ بگڑا تھا۔''

کبھی کبھی وہ سوچتی ''کیا ہوٹل انورادھا میں رقص کرنا ہی وہ فن ہے جس کی میں متلاشی تھی۔ کیا یہی وہ فن ہے جس کی شمع بچپن سے میرے دل کے مندر میں جل رہی ہے......''

جب اُسے کوئی جواب نہ ملتا تو وہ تاریکی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتی......!!

وقت گزرتا رہا!!

سلونی اب بہ خوبی ماحول سے واقف ہو چکی تھی۔ وہ تو ہوٹل انورادھا کے کھنہ کو بھی پہچان گئی تھی جو بظاہر انسان صورت تھا لیکن اس کے اندر ایک شیطان چھپا بیٹھا تھا۔ دراصل انورادھا میں آنے والے سب لوگوں کے اندر کوئی نہ کوئی شیطان پوشیدہ تھا۔ یہ سب چہرے نقلی تھے۔ یہ سب لباس نقلی تھے۔ یہ خوبصورت چہرے والے، خوبصورت لباس والے، کاروں اور موٹروں میں گھومنے والے دراصل انسان نہ تھے، انسان کے خریدار تھے۔ انسانیت کو فروخت کر کے انسانی عظمت کو نیلام کر کے یہ کاریں اور یہ عورتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ انورادھا میں آنے والے اکثر لوگ کالے بازار کے جنم داتا تھے۔ بلیک مارکیٹ کے پیرو کار تھے۔ سلونی ایک ایک کو پہچانتی تھی، ایک ایک سے واقف تھی۔

وہ جانتی تھی کہ سیٹھ ٹنڈن جو ہر شام ایک نئی لڑکی کو لے کر انورادھا آجاتا ہے، دن میں نقلی دوائیاں بنواتا ہے اور یہ دوائیاں بازار میں فروخت کرتا ہے۔ وہ سینکڑوں انسانوں کی موت کا ذمہ دار ہے۔ احمد الدین فقیر والا شراب کا دھندہ کرتا ہے۔ اس کے پاس شراب کی درجنوں بھٹیاں ہیں جہاں ہر روز دیسی شراب کی سینکڑوں بوتلیں تیار ہوتی ہیں اور خود شام کو انورادھا آ کر کافی پیتا ہے۔ امن گھوش کو بھی وہ اچھی طرح سے جانتی تھی۔ درجنوں لڑکیاں فلموں میں کام کرنے کا خواب لے کر اپنے گھروں سے بھاگ آتی ہیں۔ اس کے ایجنٹ ہیں جو ممبئی میں

ہر جگہ موجود ہیں۔ پھر فلم زدہ لڑکیاں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک پہنچ جاتی ہیں اور فلموں میں کام کرنے کا خواب بس خواب ہی رہ جاتا ہے۔ وہ اس لیڈر سے بھی واقف تھی جو دن میں بیواؤں کے لئے کام کرتا ہے اور رات کو کسی نہ کسی بیوہ کے ساتھ انورادھا کے ایک کمرے میں گم ہو جاتا ہے۔

سلونی کو اب اس ماحول، اس سوسائٹی اور اس زندگی سے نفرت ہو چکی تھی۔ وہ یہ سب کچھ چھوڑنا چاہتی تھی لیکن ایک منوہر کے لئے مجبور تھی کیونکہ ابھی اس کے پاس کائی کام نہ تھا۔ منوہر اس کی زندگی میں ایک بھونرے کی طرح آیا جس کی آمد سے پھول کی تنہائی مٹ گئی تھی۔

پھول اب تنہا نہ تھا۔

منوہر ایک گیت کار تھا اور ممبئی ایک فلم میں گیت لکھنے کے لئے آیا تھا۔ وہ فلم اس کا کوئی دوست بنا رہا تھا۔ دوست نے دوستی کا حق ادا کرنا چاہا اور منوہر کو ممبئی بلایا۔ منوہر نے گیت لکھے، فلم بنی ریلیز ہوئی مگر بُری طرح پٹ گئی۔ منوہر بیکار ہو گیا۔ دوست کے پاس جو سرمایہ تھا وہ فلم کی نذر ہو گیا۔ وہ اپنے دیس لوٹ آیا۔ منوہر چالاک تھا۔ اس نے کم ہی عرصہ میں فلمی دنیا کی نبض پہچان لی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایک دن وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ اس شام انورادھا میں ایک پارٹی تھی۔

منوہر بھی تھا۔

آرکسٹر کی دھنیں فضا میں بکھر گئیں۔ سپید چکنے فرش پر سلونی کے پاؤ تھر کنے لگے۔ اس کے بازوؤں کی محرابیں مچلنے لگیں اور آخر میں کسی نے منوہر سے گیت سنانے کی فرمائش کی۔ اس نے ایک درد بھرا گیت چھیڑا......

میں تنہا تنہا جیتا تھا

میں تنہا تنہا مرتا تھا

گیت کا ایک ایک بول سلونی کے دل کی گہرائیوں میں اُتر گیا۔ گیت ختم ہوا۔ سلونی نے بھی کسی گیت کی فرمائش کی۔ منوہر نے فرمائش پوری کی اور اس کے بعد فرمائش پر فرمائش ہوئی۔

جب پارٹی ختم ہوئی اور منوہر چلا گیا تو سلونی کو محسوس ہوا کہ اس کے دل پر ایک پھول

اُگ آیا ہے جس کا نام محبت ہے......؟!

منوہر وہاں روز آنے لگا۔اس کے من میں بھی شاید ایسا ہی پھول اُگ آیا تھا جو اسے اپنی خوشبو بکھیرنے کیلئے انورادھا ہوٹل لے آیا۔ پہلے شعروشاعری ہوتی پھر کافی کا دور چلتا اور پھر......پھر اس پھول کی باتیں شروع ہو جاتیں جس کا نام محبت ہے!

منوہر اور سلونی نے ممبئی سے باہر چند دن گزارنے کا فیصلہ کر لیا اور وہ دونوں لوناوالا چلے گئے......منوہر کو پا کر سلونی اپنے آپ کو بھول گئی۔

''سلونی، سوچتا ہوں آخر کب تک تمہارے سہارے جیوں گا'' وہ اکثر کہتا۔ سلونی بات کا رخ پھیر دیتی اور کہتی۔

''تمہیں یہ موسم کیسا لگ رہا ہے...... بارش نے موسم میں جو شوخی پیدا کی ہے اس پر قربان ہونے کو جی کرتا ہے۔ من کرتا ہے کہ اس بارش میں، بادلوں کی گرج میں، آندھی کے شور میں گھومتی پھرتی رہوں۔''

''سردی...... جب بارش کی ننھی ننھی بوندیں بادلوں کی گرج میں رقص کرتی ہیں تو میرا من جھوم جھوم اُٹھتا ہے......''

لمحے بھیگتے رہے، وقت بہتا رہا......اور ایک رات ......وہ رات بڑی بھیانک تھی۔ سلونی کا جسم منوہر کی باہوں میں لرز رہا تھا......اور پھر رات بھیانک سے بھیانک تر ہوتی گئی اور اس بھیانک رات میں سلونی نے اپنے آپ کو لٹا دیا۔اس خیال کے سہارے کہ منوہر اس کا ہے اور وہ منوہر کی ہے۔اس رات سلونی نے ایک سپنا دیکھا کہ اس نے ایک خوبصورت سا، سندر سرخ جوڑا پہن رکھا ہے۔ بابل کے گیت گائے جا رہے ہیں، ڈھولک بج رہی ہے اور اس کی ممی اس کے ہاتھوں میں مہندی رچا رہی ہے اور......!!

''ممی''

منوہر جاگ گیا۔''کیا بات ہے سلونی''

سلونی نے منوہر کو اپنی بات سنا دی اور کہا......منوہر تم مجھے دھوکہ تو نہ دو گے...... مجھے

چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو سلونی...... تمہیں دھوکہ دوں......

تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں...... یہ خیال تمہارے ذہن میں آیا کیسے؟"

سلونی اپنا سر منوہر کے سینے پر رکھ کر سو گئی!

دوسرے دن وہ ممبئی آئے۔ اب منوہر سلونی کے فلیٹ میں ہی رہنے لگا...... گیت اور گیت کار ایک ہو گئے......!!

ایک دن منوہر مسکراتا ہوا آیا اور سلونی سے کہنے لگا......" ایک نئی فلم میں گیت لکھ رہا ہوں...... آج ہی کنٹریک سائن کیا ہے اور سائننگ آمونٹ بھی لیا ہے......"

سلونی کو جیسے اسی بات کا انتظار تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آئے "ارے تم رو رہی ہو" منوہر نے اُسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا "یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ منوہر میں آج بہت خوش ہوں۔ میں اس دنیا کو چھوڑ کر ایک نئی دنیا بسانا چاہتی ہوں جس میں صرف تم ہو تمہارا پیار ہو۔ ان نقلی چہروں، اس مصنوعی زندگی سے نفرت ہو چکی ہے۔ "لیکن تمہارا فن...... تمہارا رقص کرنے کا وہ جذبہ۔"

" وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا...... میں رقص کروں گی ناچوں گی، گاؤں گی لیکن تمہارے سامنے اور اپنے گھر میں...... کسی ہوٹل کے سپید فرش پر نہیں۔ منوہر نے اس کی بات کاٹ دی...... "پرڈیوسر کے یہاں جانا ہے۔"

"کہاں"

"سٹوڈیو...... تم بھی میرے ساتھ چل رہی ہو......"

"لیکن...... میں......"

"تمہیں آنا ہی ہوگا سلونی...... میرے ساتھ، میرے لئے......"

منوہر سلونی کو سٹوڈیو لے گیا۔ اس نے اپنے آنے کی اطلاع پرڈیوسر کو بھجوادی۔ وہ فوراً اندر بلایا گیا۔ سلونی نے اندر جانے سے انکار کیا۔ وہ باہر ہی اس کا انتظار کرنے لگی۔

چند لمحوں کے بعد اس نے سنا۔ اندر منوہر کسی سے باتیں کر رہا تھا۔

''آیئے''

''ہاں''

''کنٹریکٹ پر دستخط ہوئے''

جی ہاں...... شکریہ''

''تم چاہو تو ایڈوانس بھی لے سکتے ہو''

''بہت اچھا''

اور وہ لڑکی''

''لیکن صاحب''

''میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ وہ لڑکی مجھے پسند ہے۔''

''لیکن وہ میری......''

پرڈیوسر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''تمہاری دوست ہے، محبوبہ ہے یہی کہنا چاہتے ہو...... میری بات سنو...... زندگی میں کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو دولت، شہرت، عزت...... تو یہ دوستی اور محبوبانہ انداز ترک کردو...... تم نے نیا نیا قدم رکھا ہے اس دنیا میں ...... تمہیں کچھ حاصل کرنے کے لئے ایک سہارے کی ضرورت ہے۔...... وہ سہارا تمہارے پاس ہے...... اس لڑکی کے روپ میں......''

''آپ نہیں جانتے، وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں ہے''

''میں سب کچھ نہیں جانتا اور نہ جاننا چاہتا ہوں۔ تم کام چاہتے ہو، شہرت اور پیسہ چاہتے ہو تو اس لڑکی کے ساتھ میری کوٹھی میں آجاؤ، آج شام''۔

منوہر خاموش رہا۔''

''ہاں یا نا......؟''

پھر وہی خاموشی چھائی رہی جیسے منوہر کسی عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا ہو۔

''جواب دو''

''ٹھیک ہے''

''منیجر سے مل کر ایڈوانس لے لو...... میں نے اسے کہہ دیا ہے۔''

سلونی باہر سب کچھ سن رہی تھی ......منوہر کے دل پر اُگنے والے پھول مصنوعی تھے۔وہ پھول بھی مصنوعی تھا خوشبو کہاں سے آتی۔تقدس کا ملمع اُتر چکا تھا۔چند سکوں کے لئے منوہر اپنی زندگی اپنی محبت اور اپنے گیتوں کو فروخت کرنے پر تیار ہو گیا تھا......منوہر جب کمرے سے باہر آیا تو سلونی جا چکی تھی۔

گھر کے باہر اس کو ہوٹل لے جانے کیلئے ڈرائیور آچکا تھا۔اس نے ڈرائیور سے کہہ دیا کہ اس کی صحت ٹھیک نہیں۔اسلئے وہ آج کے پروگرام میں حصہ نہ لے سکے گی!

روتے روتے جانے وہ کب سو گئی۔اچانک اس کی آنکھ کھل گئی کیونکہ کھنہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''مس سلونی، مجھے خود ہی آنا پڑا۔کیسی طبیعت ہے اب۔آج ہوٹل میں ایک بڑی پارٹی ہے تم کو آنا پڑے گا۔چند لمحوں کے لئے ہی سہی......میرے لئے مس سلونی، پلیز......''

''لیکن میری طبیعت......''

''میری عزت کا سوال ہے......''

آخر مجبور ہو کر سلونی کو جانا پڑا!

ایک مختصر سا رقص ہوا۔ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔اچانک سلونی مائیک کے سامنے آئی......اس نے منوہر کا گیت چھیڑا۔

میں تنہا تنہا جیتا تھا میں تنہا تنہا مرتا تھا

یہ ایک نئی بات تھی آج پہلی بار سلونی نے مائیک کے سامنے آکر ایک گیت گایا تھا۔اس کی سریلی آواز نے سارے ماحول کو، ساری فضا کو مسحور کر دیا۔گیت گاتے گاتے وہ بے تحاشا رونے لگی اور دوسرے ہی لمحے فرش پر گر گئی!

ایک کہرام سا مچ گیا۔

سلونی کو کمرے میں لے جایا گیا۔ ڈاکٹر آیا۔ اس نے سلونی کا بغور معائنہ کیا اور کہا کہ یہ ماں بننے والی ہے۔"

کھنہ بے ساختہ چیخ اُٹھا...... سلونی مجھ معاف کردو...... مجھے معاف کردو" ڈاکٹر نے کھنہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تو یہ آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہے" کھنہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں...... "نہیں ڈاکٹر" ایسی کوئی بات نہیں ہے" "مگر ابھی تو آپ"

کھنہ نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا......

"دراصل آج سلونی کی طبیعت ناساز تھی۔ ہوٹل میں ایک بڑی پارٹی تھی اس لئے سلونی کو میں مجبور کر کے یہاں لے آیا۔ ڈاکٹر نے اپنی بات دہرائی "دیکھئے، یہ لڑکی ماں بننے والی ہے۔ میرا خیال ہے کہ فی الحال یہ رقص نہ کر سکے گی۔ اگر آپ اسے مجبور کریں گے تو...... فی الحال تو میں اس کے ہسبنڈ سے ملنا چاہوں گا۔"

"دیکھئے ڈاکٹر...... مجھے سلونی اور منوہر کے تعلقات کی کوئی جانکاری نہیں۔ ہاں میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ دونوں ایک ہی فلیٹ میں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ دوست ہیں یا میاں بیوی، میں نہیں جانتا......"

"ٹھیک ہے" ڈاکٹر نے کہا "میں نے انجکشن دیا ہے۔ یہ دوائی آپ بازار سے منگوا لیجئے۔ ہاں انہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے ذہن کو کوئی صدمہ پہنچا ہے۔ وہ ذہنی طور پر پریشان رہی ہوں گی جس کی وجہ سے وہ فرش پر گر گئیں" اور یہ کہہ کر ڈاکٹر چلا گیا۔

ادھر پرڈیوسر کے کمرے سے جب منوہر آیا تو سلونی کو نہ دیکھ کر کچھ حیران سا ہوا۔ "گھر چلی گئی۔ یہ سوچتے ہوئے وہ سٹوڈیو سے باہر نکل آیا۔ راستے میں وہ سلونی کے بارے میں سوچتا رہا......" کیا وہ سلونی کو دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے...... نہیں، شاید نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم شادی کے بندھن میں بندھ گئے ہوتے اور اگر میں واقعی سلونی سے محبت کرتا تو میں نے

پرڈیوسر کی بات سننے سے پہلے ہی اس کا سر پھوڑ دیا ہوتا ...... میں تو ممبئی آیا ہوں نام اور شہرت حاصل کرنے کیلئے، روپیہ کمانے کیلئے ......سلونی ...... یہ سلونی نہ ہی کوئی اور سلونی مل جائے گی ......لیکن آج شام سلونی کا میرے ساتھ پرڈیوسر کی کوٹھی پر جانا......وہ تو اہم ہے......"

سلونی گھر میں نہ تھی۔ منوہر نے سوچا ہوٹل میں ہوگی۔ سلونی کا انتظار کرتے کرتے وہ سو گیا......رات کو منوہر نے کروٹ بدلی تو سلونی کا بستر خالی پایا۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا، رات کے دس بج چکے تھے وہ کچھ گھبرا سا گیا...... پو پھٹ گئی سورج نکلا لیکن سلونی نہیں آئی۔ اس نے انورادھا ہوٹل فون کیا......

"میں منوہر بول رہا ہوں"

"منیجر کی آواز سنائی دی......" منوہر صاحب، آپ اب تک کہاں تھے۔ ہم تو کل شام سے آپ کو تلاش کر رہے ہیں......سلونی......"

"کیا ہوا سلونی کو۔"

"سلونی کل اچانک گاتے گاتے بے ہوش ہوگئی۔ ڈاکٹر نے معائینہ کیا دوائی دی لیکن رات کو اس کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی اور کھنہ صاحب نے انہیں نرسنگ ہوم میں ایڈمٹ کروالیا......"

"ایک اور بات......ان کا abortion ہو گیا۔ وہ آپ کے بچے کی ماں بننے والی تھی......آپ کے خلاف FIR درج کیا گیا ہے......"

منوہر کے پاؤں سے جیسے زمین سرک گئی......!

"اب کیا ہوگا؟"

گھبراتے ہوئے قدموں سے منوہر نرسنگ ہوم جا پہنچا۔ آہستہ سے سلونی کے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا......سلونی نے منوہر کو دیکھا تو کمبل سے اپنے سارا جسم چھپا لیا......منوہر کو ایک بار پھر زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی!

"سلونی" اس نے آہستہ سے کہا

سلونی خاموش رہی۔

''میری جان، سلونی''، منوہر کی آواز ابھری

''منوہر تم'' سلونی نے کمبل کو اپنے چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا'' منوہر، تم چلے جاؤ یہاں سے ...... دور ہو جاؤ میری نظروں سے ...... میں نے سب کو کہہ دیا ہے کہ منوہر صرف میرا دوست ہے...... بچہ...... بچہ تمہارا نہیں تھا۔''

منوہر نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔

''مگر سلونی''

''تمہارا کوئی قصور نہیں'' وہ رونے لگی اور روتے روتے کہا'' ہاں تمہارا کوئی قصور نہیں، قصور صرف میرا ہے۔ میں نے تم سے محبت کی تم پر اپنی زندگی لٹادی۔ تمہیں سکون دیا گھر دیا...... ہر سہولیت دی اور تم ...... تم تو صرف چوری کرنا جانتے ہو ڈاکہ ڈالنا جانتے ہو لیکن چور یا ڈاکو کا بھی ایمان ہوتا ہے۔ ایک منزل ہوتی ہے تمہارا کوئی ایمان نہیں۔ کوئی منزل نہیں۔ تم تو ایک چور ایک ڈاکو سے بھی بدتر ہو...... خود تو مجھے لوٹ لیا اور اب میر سودا کرنا چاہتے ہو......''

''سلونی، تم یہ سب کیا کہہ رہی ہو۔ ہاں شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے...... پھر بھی......''

''پھر بھی کیا''

''اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی تو مجھے معاف کردو''

''تمہیں معاف کردوں ...... ایک بردہ فروش کو...... عورتوں کے بیوپاری کو...... تمہیں شاید کسی ماں نے جنم نہیں دیا ہے ...... تمہارے گھر میں شاید کوئی بہن نہیں ہے ...... اس لئے عورت کی عزت کرنا تم نے سیکھا ہی نہیں ہے...... تم ذلیل ہو...... جاؤ......''

منوہر کمرے سے باہر چلا آیا......!!!

رات کو کھنہ اور ڈاکٹر ایک ساتھ سلونی کو دیکھنے نرسنگ ہوم آ گئے۔

''کیا حال ہے'' ڈاکٹر نے پوچھا

''جی رہی ہوں''، سلونی نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تم تو زندگی سے بے زار نظر آ رہی ہو...... ادھر کھنہ صاحب ابھی تک پولیس سٹیشن میں تھے......"

"مگر کیوں......"

"ڈاکٹر رہنے دیجئے۔ پولیس سٹیشن جانا تو ہم ہوٹل والوں کا معمول ہے...... یہ بتایئے سلونی کو کب تک یہاں رہنا پڑے گا۔"

"یہ تو سلونی پر depend کرتا ہے۔ اگر اس رات میرے جانے کے بعد سلونی بیڈ سے اترنے کی کوشش نہ کرتی ......تو ...... آپ کہہ رہے تھے کہ یہ ہوش میں آتے ہی بھاگنے لگی۔"

سلونی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھپالیا۔

"OK...... جو کچھ ہونا تھا۔ ہو چکا ہے...... لیکن شاید رقص نہ کر سکے گی۔"

"مگر ڈاکٹر"

"دیکھئے یہ میرا ذاتی خیال ہے۔ ابھی کچھ دن اور یہاں رہنے کے بعد اور کچھ X-rays لینے کے بعد اصلیت کا پتہ چلا جائے گا......"

ڈاکٹر پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

"آپ پولیس سٹیشن کیوں گئے تھے"

"یونہی"

"پھر بھی"

"تم نے منوہر کو صاف بچالیا لیکن اس کے نتیجے میں تم پر illegal abortion کا کیس بنا۔"

"پھر"

"میں نے وہ کیس Close کروالیا......"

"آپ نے ایسا کیوں کیا......"

"اپنے مطلب کے لئے ...... تاکہ تم پھر سے میرے ہوٹل میں رقص کر سکو گی، گا سکو

گی، ناچ سکو گی۔"

"میں رقص کر بھی سکوں گی کہ نہیں یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ آپ نے شاید ڈاکٹر کی بات غور سے نہیں سنی۔"

"سن بھی چکا ہوں اور جانتا ہوں......"

"لیکن پولیس سٹیشن......کیس

"تم خوامخواہ گھبرا رہی ہو...... پیسہ کام آتا ہے، ہر جگہ ہر وقت......اور پھر سلونی...... میں کوئی دیوتا نہیں......میں بہت برا آدمی ہوں......ہاں سلونی......"

سلونی کے کان کھڑے ہو گئے۔ ایک دبے دبے ڈر نے سر اُبھارنا شروع کیا......کہیں کھنہ منوہر کا دوسرا روپ تو نہیں......"

"سنو سلونی......تم منوہر کے بچے کی ماں بننے والی تھی لیکن تم نے اُسے صاف بچالیا۔ تم میرے ہوٹل میں کام کرتی ہو...... پولیس کو منوہر میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو ان کے لئے ایک چھوٹی سی مچھلی تھی......نہ پیسہ نہ روپیہ، نہ گھر نہ ٹھکانہ...... پولیس کو ضرورت تھی ایک بڑی مچھلی کی......اور وہ مچھلی انہیں میری صورت میں نظر آئی...... پولیس کو خاموش کرانا میں بخوبی جانتا ہوں......"

"اور ڈاکٹر"

"وہ اپنا دوست ہے نرسنگ ہوم کے ریکارڈ میں معدے کی بیماری دکھائی گئی۔"

"لیکن آپ نے یہ سب کیوں کیا......کس لئے کیا"

"تمہیں پانے کے لئے، سلونی......"

یہ کہتے ہوئے کھنہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

کئی دن ایسے ہی بیت گئے لیکن اس دوران سلونی کو بتایا گیا کہ منوہر اس کے فلیٹ سے اپنا مختصر سا سامان لے کر کہیں اور چلا گیا ہے......فلم میں گیت لکھنے کا جو وہ کنٹریکٹ سائن کر چکا تھا وہ پروڈیوسر نے کینسل کر دیا ہے اور اُسے فلم سے باہر کر دیا گیا ہے......اور سب سے اہم خبر سلونی کے لئے یہ تھی کہ وہ رقص نہ کر سکے گی کیونکہ فرش پر گرنے سے اس کی ٹانگ کی ہڈی میں

ایک نقص پیدا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے اس ٹانگ میں Constant Pump رہے گا......"

نرسنگ ہوم میں اس کا آخری دِن تھا۔ کھنہ اسے لینے آیا تھا۔

"سلونی اب تم رقص نہ کر سکو گی۔ ہوٹل انورادھا کے چکنے فرش پر کبھی تھرک نہ سکو گی ......تم نے اپنے بارے میں کیا کچھ سوچا ہے......میری تجویز......میرا مطلب ہے کہ چند روز قبل میں نے ......! کھنہ یہ کہتے کہتے رُک گیا......

"اچھا، میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔ شاید تمہیں اس کہانی میں کوئی دلچسپی نظر نہ آئے پھر بھی......شاید تم سوچ رہی ہو ہر مرد بے وفا ہوتا ہے، بُرا ہوتا ہے کسی حد تک یہ درست بھی ہو سکتا ہے...... یہ میری کہانی ہے سلونی ......میں پچیس سال کی عمر میں ممبئی آ گیا۔ پیسہ میرے پاس تھا۔ پہلے ایک چھوٹی سی دکان سنبھالی ٹی سٹال، چھوٹے موٹے کام کئے، کالے بازار والوں کا ساتھ دیا......میرے پاس پیسہ آ گیا......آہستہ آہستہ ترقی کرتا گیا اور ہوٹل بزنس میں ہاتھ ڈالا ......آج میں انورادھا ہوٹل کا مالک ہوں......!

"آپ اپنی کہانی مجھے کیوں سنانا چاہتے ہیں"

"صرف اس لئے کہ ہم دونوں کے جاننے والے یہ سمجھتے ہیں
کہ ہم دونوں کا......"

"لیکن یہ تو غلط......"سلونی نے بات کاٹتے ہوئے کہا"ہاں میں جانتا ہوں کہ یہ غلط ہے......لیکن شاید یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں شادی شدہ ہوں ......میرا ایک بیٹا بھی ہے......تم مجھے بولنے دو سلونی......انورادھا سے مجھے بے حد پیار تھا......"

"انورادھا؟......کون انورادھا؟"

"میری بیوی کا نام انورادھا تھا"

"تھا......کیا مطلب؟"

"وہ اب اس دنیا میں نہیں ......میرے بچے کی ماں بننے والی تھی ......لیکن وہ بچے کو جنم دے کر اپنے آپ کو بچا نہ سکی ......وہ مر گئی۔ آپریشن ٹیبل پر ہی مر گئی۔"

اور آپ کا بچہ......"

"میرا بیٹا صحیح سلامت ہے اور وہ ڈون سکول میں پڑھ رہا ہے اور میں یہاں ممبئی میں ہوٹل انورادھا میں جی تو رہا ہوں مگر بے مقصد، بے معنی......!

"وہ بن ماں کا بیٹا ہے ......اسی لئے تو چاہتا ہوں کہ تم میری انورادھا کا روپ بنالو......میرے بیٹے کی ماں بن کر......سلونی ہاں کہو......ہاں......"

سلونی نے آہستہ سے کہا۔

"آپ کی زندگی کی کہانی پُر درد ہے۔آپ کے سینے کا گھاؤ گہرا ہے۔آپ نے مجھ پر بہت احسانات کئے ہیں، مہربانیاں کی ہیں۔میں نے آپ کے جس روپ کے بارے میں سوچا تھا وہ روپ میری آنکھوں کا دھوکہ تھا اور اب جو میں آپ کو دیکھ رہی ہوں، آپ کے بارے میں سوچ رہی ہوں، جاننے لگی ہوں تو آپ مجھے ایک دیوتا نظر آتے ہیں......آپ کو دیکھ کر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ایک بار پھر رحمان دادا میری زندگی میں آیا ہے......آپ عزت کے قابل ہیں کھنہ جی......"

"مگر سلونی"

"میں نے کہا کہ آپ دیوتا ہیں، فرشتہ ہیں......میں آپ کی بڑی عزت کرتی ہوں مگر آپ سے شادی نہیں کر سکتی......اور شادی تو میں اب عمر بھر نہیں کروں گی۔عورت زندگی میں ایک بار محبت کرتی ہے۔ایک ہی بار پیار کے ساگر میں ڈوب جاتی ہے۔میں نے منوہر کو بے تحاشا چاہا......لیکن اس میں محبت کا کیا دوش......محبت ایک جذبہ ہے، ایک خوبصورت ملاپ ہے، ایک مقدس رشتہ ہے......"

"مگر منوہر تو......"

"ہاں میں جانتی ہوں کہ اب وہ میری زندگی میں دوبارہ نہیں آئے گا۔میں آنے بھی نہ دوں گی۔وہ میرے لئے اور میں اُس کے لئے مر چکی ہوں لیکن محبت تو نہیں مرتی، محبت تو امر ہے......"

"نہیں میں اپنے وطن لوٹ جاؤں گی جس مٹی نے مجھے جنم دیا وہ مٹی بلا رہی ہے۔ جن گلیوں میں میرا بچپن گزرا ہے ان گلیوں کو میرے پاؤں کی آہٹ کا انتظار ہے۔ وہ میری اپنی مٹی ہے۔ وہ مجھے گھر سے بے گھر ہوتے نہیں دیکھ سکتی......!"

............●●●............

"شیرازہ" میں چھپنے والی نگارشات

(۱) ہر نگارش کا معقول معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ نگارش غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو۔

(۲) ہندوستانی تاریخ وتمدن اور ثقافت وادب کے مختلف پہلوؤں پر معیاری وتحقیقی مضامین قبول کئے جاتے ہیں۔

(۳) ریاست کے تمدنی اور فنی ورثے کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی مقالات ترجیحی طور پر شائع کئے جاتے ہیں۔

(۴) فنِ تعمیر، آرٹ اور مصوری سے متعلق مضامین کے ساتھ آنے والی نادر تصاویر کا الگ سے معاوضہ دیا جاسکتا ہے۔

......●●●......

● ...... وحشی سعید

فطرت

(۱)

سورج کو ڈوبے ہوئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ سمندر نگر کی وحشت گلی میں ایک لمبے قد کا آدمی داخل ہوا۔ خوبصورت چہرہ لیکن اتنا بارعب کہ پہلی بار دیکھنے والا وحشت سے چونک پڑے۔ سوٹ میں ملبوس، پاؤں میں انگریزی بوٹ۔ اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔

"مکان نمبر ۲۰۔"

وہ لمبے لمبے قدم بڑھاتا ہوا مکان نمبر ۲۰ کے پاس رکا اور دروازے کی گھنٹی بجائی۔

اندر سے ایک آدمی آیا۔

"آپ کا مکان ہے۔"

"ہاں جناب، خاکسار کا ہی ہے۔"

"مجھے انوکھے خان نے بھیجا ہے۔"

"او" وہ چونک پڑا۔

"تو آپ امین صاحب ہیں۔ معاف کیجیے میں نے آپ کو پوری طرح پہچانا نہیں لیکن آپ کا چہرہ کچھ مانوس لگنے کے سبب میں ایک پل کے لیے پرانی یادوں میں کھو گیا۔"

"یادیں..... ہاں دوست۔ یادوں کے سہارے ہی انسان زندہ رہتا ہے۔"

"یہ سوٹ کیس مجھے دیجیے اور اندر چلئے۔"

دونوں مکان میں داخل ہوئے۔ پرانی طرز کا مکان۔ ایک باورچی خانہ، ایک

ڈرائنگ روم اور دو بیڈروم۔مکان چھوٹا مگر صاف ستھرا۔سامنے ایک چھوٹا سا باغ جس میں رنگ برنگی کے پھول۔

"مکان پسند آیا۔"

"ہاں.....مجھے بھوک لگی ہے۔تم میرے لیے کچھ کھانے کا انتظام کر سکتے ہو۔"

"ابھی.....ابھی کرتا ہوں جناب۔تب تک آپ غسل کرلیں۔"

مکان کا مالک باہر آیا اور سڑک کی جانب مڑا کہ یکا یک اسے کسی نے آواز دی۔

"لالو.....لالو....."

"کیا بات ہے۔"

یہ تمہارے مکان میں کون آیا ہے۔"

"وہ......وہ میرا نیا کرائے دار ہے۔"

"لیکن وہ بھلا آدمی معلوم نہیں ہوتا۔"

"وہ بھلا آدمی ہے لیکن بڑا دکھی ہے۔"

"لیکن اس کے اطوار سے تو ایسا نہیں لگتا۔"

"جب آدمی کے لیے مایوس کن حالات پیدا ہوتے ہیں تب ہر ایک اسے برا ہی سمجھتا ہے۔"

"ہوسکتا ہے۔"

"اچھا" یہ کہتے ہوئے لالو سامنے والے ہوٹل میں گیا اور امین کے لیے کھانا لیا۔کھانا لے کر گھر آیا اور میز پر لگا دیا۔

امین غسل خانے سے باہر آیا۔

"کھانا۔"

"جی،وہ میز پر۔"

"اچھا"

''کھانا بہت اچھا ہے۔''

''شکریہ جناب۔''

''کیا نام ہے تمہارا۔''

''جی، میرا نام تو ویسے جمال ہے لیکن لوگ لالو کہہ کر پکارتے ہیں۔''

جمال کی عمر چالیس کے آس پاس تھی۔ ماں باپ گزر چکے تھے۔ شادی بھی نہیں کی تھی۔ تنہا تھا۔ مست اور رنگین طبیعت۔ اس کے باپ نے دو مکان چھوڑے تھے جن کے کمروں کو کرائے پر اٹھا کر وہ اچھی آمدنی کر لیتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد امین پلنگ پر آ گیا۔

''صاحب..... میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ مرد کے پیٹ کی جب آگ بجھ جاتی ہے تو اس کے جسم کی آگ جل اٹھتی ہے اور اسے بجھانا ضروری ہوتا ہے۔''

''تو''

''تو صاحب..... وہ لال پری ہے۔ کیا حسن پایا ہے۔ جس نے اس کا قرب حاصل کیا وہ جنت میں پہنچ گیا۔ نام بھی اس کا کس قدر خوبصورت ہے 'طوائف رانی'۔ اس کی پورے شہر میں دھوم ہے۔''

''جمال..... میں ابھی بہت تھکا ہوا ہوں اور اس وقت آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے تم ایسا کرو کل شام کو آ جاؤ۔ اس وقت تفصیل سے باتیں ہوں گی اور ہاں برتن ساتھ لیتے جاؤ۔ یہ لو کھانے کے پیسے۔''

''جی بہت اچھا۔ کل شام کو حاضر ہوتا ہوں۔''

(۲)

جمال مکان میں داخل ہوا۔ امین ابھی تک نیند میں تھا۔ دروازے کی گھنٹی سن کر آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا۔

''اٹھیے جناب، شام ہو گئی۔''

''ہوں۔''

''ارے لگتا ہے کہ آپ سارا دن سوتے ہی رہے اور دن کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ مجھے اس کا احساس تھا اسی لیے کھانا میں اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں منہ ہاتھ دھولوں۔''

جمال نے امین کے کھلے ہوئے سوٹ کیس کے اوپر ایک کتاب دیکھی۔ اس نے سوچا کہ جب تک امین کھانے سے فارغ ہو، وہ اس کو الٹ پلٹ کر دیکھے۔ لیکن وہ کتاب میں اس قدر کھو گیا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ امین نے کب کھانا ختم کیا۔

''کہاں کھو گئے جناب......جمال۔''

''ہوں.....اچھا تو آپ نے کھانا بھی کھالیا۔ دراصل یہ کتاب اتنی اچھی اور دلچسپ ہے کہ میں اس میں کھو گیا۔ ہاں.....طوائف رانی کے یہاں چلنا ہے۔ وہاں آج آپ کے لیے گانا ہوگا۔''

''میرے لیے نہیں، میرے پیسوں کے لیے گانا ہوگا۔''

''ایک ہی بات ہے جناب۔ آخر پیسے بھی تو آپ ہی کے ہیں۔''

وہ دونوں شریف گلی میں داخل ہوئے۔ یہاں ہر مکان میں حسن و جوانی کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ جمال ایک مکان کے سامنے رک گیا۔

''طوائف رانی کا گھر۔''

''مکان تو اچھا ہے لیکن مجھے طوائف رانی کو دیکھنا ہے۔''

دونوں اندر داخل ہوئے۔ ایک بڑا کمرہ قالین سے سجا ہوا۔ سات آٹھ تکیئے۔ بوڑھی آپا پان چبا رہی تھی۔ جمال نے اسے سلام کیا۔

''یہ میرے مالک، امین صاحب ہیں۔''

''آداب۔''

''شاہ خود آئے ہیں آپا۔ تو اب دیر کس بات کی ہے۔''

''اچھا جناب۔ بیٹی باہر آجاؤ، مہمان آگئے ہیں۔''

طوائف رانی اوپر سے نیچے تک گہنوں میں لدی ہوئی تھی۔ حسنِ بے پناہ نے اسے چودھویں کا چاند بنادیا تھا۔ اس نے امین صاحب کے سامنے پان کی گلوری رکھی۔

''آداب۔''

امین صاحب حسن سے متاثر ہوئے۔ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ۱۰۔۱۰ کے ۲۰ نوٹ رکھے۔ پورے ۲۰۰ روپئے۔

''طوائف رانی اپنی اداؤں اور ترنم بھری آواز سے محفل کو مستی کے عالم میں تبدیل کر دیجیے۔''

''جو حکم۔''

اگر یہ حسن میرا پیار کے شعلوں میں ڈھل جائے
تو پھر انسان ہے کیا چیز پتھر بھی پگھل جائے

اس نے دو چار گانے گائے۔ جمال صاحب رات کے کھانے کا انتظام کرنے چلے گئے۔ بوڑھی آپا نے بھی دونوں کو اکیلا چھوڑ دیا۔

''کیا نام ہے تمہارا۔''

''طوائف رانی۔''

''اصلی نام۔''

''اب تو یہی اصلی نام ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ویسے تو میرا نام شبنم تھا۔''

''شبنم...'' میں تو پرانی یادوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں... لیکن... وہ پھر یاد آگئیں۔

(۳)

امین کو پوری طرح نہ تو ماں کا پیار مل سکا اور نہ باپ کا۔ امیر ترین گھرانہ، باپ کو اپنے کاروبار سے فرصت نہیں تھی اور ماں کو اپنی سہیلیوں اور پارٹیوں سے۔ اس کے باپ کا ایک منشی رنگین شاہ تھا۔ اپنے نام کے اعتبار سے ہی رنگین۔ اس کی نظر اپنے مالک کی دولت پر تھی۔ اس

نے دوستی بڑھاتے ہوئے امین کے باپ کو شراب اور شباب کی لت لگائی اور اس کی ماں کو بھی اپنے پیار کے جال میں پھانس لیا۔ پھر ایک دوسرے کی مخبری شروع کر دی۔ ایک کا راز دوسرے کو بتانے لگا جس سے گھر کا امن وسکون درہم برہم ہو گیا۔ ایک دن امین کی ماں نے اپنے شوہر کو دوسری لڑکی کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا، خوب ہنگامہ ہوا۔ امین کے باپ نے اپنی غلطی مان لی۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ ایک دن امین کے باپ نے اس کی ماں کو غیر مرد کے ساتھ اپنے بستر میں پایا۔ لیکن اس مرد کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ چونکہ یہ رنگین شاہ کی سوچی سمجھی چال تھی اس لیے اس نے پہلے ہی پوری تیاری کر لی تھی۔ امین کا باپ صرف اس کی ننگی پیٹھ دیکھ سکا اور وہ کھڑکی سے کود کر بھاگ گیا۔ امین کے باپ نے اس کی ماں کو طلاق دے دی اور خود شراب اور شباب میں ڈوب کر جلد ہی جہانِ فانی سے چلا گیا۔ کاروبار اب امین کے ہاتھ میں تھا اور اسے بھی رنگین شاہ نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ وہ رنگین شاہ پر آنکھ بند کر کے اعتماد کرتا تھا۔

ایک دن امین پرانا حساب کتاب دیکھ رہا تھا۔

''بیٹا، کبھی اپنے دماغ کو آرام بھی دیا کرو۔''

''چچا جان، آرام کام کے بعد۔''

''بیٹا تم میری طرح بوڑھے نہیں ہو۔ خوبصورت جوان ہو۔ جوانی کے دن لوٹ کر نہیں آتے۔ تمہارے ابا مرحوم ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ زندگی چار دن کی ہے تو کیوں نہ اسے عیش کے عالم میں گزارا جائے۔ آؤ آج میں تمہیں دنیا کا ایک نرالا کھیل دکھاؤں۔ چلو۔''

''کہاں۔''

''آؤ تو میرے ساتھ۔''

رات کے اندھیرے میں وہ دونوں ایک حویلی میں داخل ہوئے۔

''چچا جان، ہم یہاں کیوں آئے؟ یہاں کیا ہے؟''

''بیٹا، یہاں وہ آبِ حیات ہے جس سے تمہاری جنم جنم کی پیاس بجھ جائے گی۔''

حسن کے انمول موتی نے رقص شروع کیا۔ امین کا دل اچھلنے لگا۔ عورت کا سامنا اس

طرح پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔اس نازک حسینہ نے جب شراب کا جام پیش کیا تو امین نے کہا۔

"نہیں......میں.......نہیں......پیتا۔"

"ارے بیٹا۔زندگی کا اصل راز تو اسی جام میں چھپا ہوا ہے۔پی لو اور جنت کی سیر کر لو۔"

"لیکن......"

"میری قسم۔" نازک حسینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ جام پی گیا جو بہت تلخ تھا۔لیکن پھر وہ مستی کے عالم میں ڈوب گیا۔آہستہ آہستہ شراب اور شباب اس کی زندگی کا اہم حصہ بن گئے۔رنگین شاہ بھی یہی چاہتا تھا۔اب امین کی راتیں اسی رنگینی کے ساتھ گزرتی تھیں۔

(۴)

عمر کے تقاضے انسان کو کبھی کبھی کچھ مسئلے حل کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔امین کو بھی ایک ایسا ہی مسئلہ درپیش تھا۔رنگین شاہ نے کہا۔

"شادی تمہیں کرنی پڑے گی۔"

"لیکن میں شادی کرنا نہیں چاہتا۔"

"دیکھو بیٹے،شادی انسانی زندگی کا اہم جز ہے۔انسان کی زندگی اس کے بغیر ادھوری ہے۔ہمیں سماج میں رہنا ہے۔ہم اس سماج کا حصہ ہیں تو عزت اور وقار قائم رکھنے کے لیے کچھ سماجی روایتوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی نباہنا پڑتا ہے۔تمہارا بھی کوئی نام لیوا ہونا چاہیئے۔ہم سب کو ایک دن اس فانی دنیا سے جانا ہے لیکن کیا خاندان کا نام مٹا کر جاؤ گے اور پھر نادر موقع بھی ہاتھ آ گیا ہے۔"

"نادر موقع......؟ کیا مطلب؟"

"ایک حسین ترین لڑکی ہے۔اونچا خاندان اور سب سے اچھی بات کہ وہ جہیز میں تیس ہزار روپئے نقد دے رہے ہیں۔"

"روپئے کی بات نہیں۔لڑکی کیسی ہے۔"

''ارے بھائی، حسین لڑکی ہے، خوبصورت۔اس کے ساتھ دولت بھی مل رہی ہے۔''

''مجھے دولت کی پرواہ نہیں۔''

''نہیں بیٹے، دولت کی پرواہ ہونی چاہیئے۔اس سے انسان کی سماج میں عزت اور مقام ہے۔جس کے پاس دولت نہیں ہوتی، وہ ہمیشہ دبتا رہتا ہے۔''

''لیکن میں لڑکی کو دیکھنے کے بعد ہی فیصلہ کروں گا۔''

ٹھیک ہے۔کل تم کو شاہ دین کے یہاں دعوت پر جانا ہے۔وہاں وہ بھی آئے گی۔ وہیں ملاقات کا بندوبست کرتے ہیں۔

(۵)

امین، شاہ دین کے یہاں جانے کو تیار ہو رہا تھا کہ رنگین شاہ نے کہا۔

''بیٹے، میں نے مغلانی کو کہا ہے کہ ٹھیک سات بجے وہ شاہ دین کی حویلی کے پیچھے والے باغ میں شبنم بیٹی کو لائے۔وہاں آپ بھی جائیں اور اسے جی بھر کر دیکھ لیں۔''

امین، شاہ دین کے یہاں دعوت میں جاتے ہوئے راستے میں نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔حالانکہ اس نے اب تک بہت سے پھولوں کا رس چوسا تھا لیکن شبنم کے لیے نہ جانے کیوں اس کے دل میں ایک لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔شاہ دین کی حویلی جگمگا رہی تھی۔روشنی نے رات کو دن میں بدل دیا تھا۔

مغلانی عورتوں کی محفل میں داخل ہوتی ہوئی شبنم کے پاس جا پہنچی۔

''شبنم۔''

''جی۔''

''یہاں تو بڑی گرمی ہے تم یہاں کیا کر رہی ہو۔چلو باغ میں چہل قدمی کر آتے ہیں تاکہ دماغ تازہ ہو جائے۔''

''لیکن وہاں تو آدمی ہوں گے۔''

''ارے بی بی، وہاں کوئی نہیں ہے۔اس طرف آدمیوں کا آنا جانا بند کیا گیا ہے۔

آؤ بھی۔''

''لیکن......''

مغلانی اسے تقریباً کھینچتے ہوئے باغ میں لے آئی۔

''میں نے سنا ہے تری شادی ہو رہی ہے۔''

''ہاں۔''

''تم نے دولہے کو دیکھا۔ تمہیں پسند ہے۔''

''ماں باپ کی پسند ہی میری پسند ہوگی۔ مجھے دولہا دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ماں باپ جس کے ساتھ ہاتھ پکڑا دیں گے، چلی جاؤں گی۔''

امین درخت کے پیچھے سے شبنم کو دیکھ رہا تھا اور اپنی قسمت پر ناز کر رہا تھا کہ وہ اس نازک حسینہ کا ہونے والا خاوند تھا۔ اس کے باغ سے باہر آنے پر رنگین شاہ نے پوچھا:۔

''کیوں.... دیکھ لیا، لڑکی پسند آئی۔''

''ہاں چاچا۔ وہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کی ذہین بھی ہے۔ آپ جلدی رشتہ پکا کیجیے اور ہاں نقدی کا بھی خیال رکھیئے گا۔''

''ہوں..... بیٹا اب عقلمند ہو گیا ہے۔''

(۶)

اکبر خاں کی بڑی حویلی کے سامنے ایک باغ تھا۔ پورے شہر میں یہ سب سے اچھا اور خوبصورت مانا جاتا تھا۔ اس لیے اس کا نام لوگوں نے دلفریب رکھا تھا۔

رنگین شاہ نے حویلی کے اندر داخل ہوتے ہوئے اکبر خاں کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔ آیئے، رنگین شاہ صاحب۔ فرمایئے۔''

''جی حضور، میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ جو بات ہمارے درمیان ہوئی تھی، اسے آگے بڑھایا جاسکے۔''

''تو آپ نے امین صاحب سے بات چیت کی۔''

''جی ہاں۔ بڑا فرمان بردار لڑکا ہے۔ مان گیا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔''

''ہمارے آپ کے درمیان ایک اور بات ہوئی تھی۔''

''جی ہاں۔ ۳۰ / ہزار روپئے کی۔ آپ اس کے لیے بے فکر رہیں۔''

''تو پھر جمعہ کے دن منگنی کر دیتے ہیں اور اگلے ماہ شادی۔''

''آپ امین صاحب سے مشورہ کر لیجیے۔''

''آپ سمجھ لیجیے کہ یہ امین صاحب کی ہی بات ہے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ ایک ماہ کے اندر ہم بھی شادی کی اچھی طرح تیاری کر سکتے ہیں۔''

(۷)

سگائی کے اخراجات ایک عام آدمی کی شادی کے اخراجات کے برابر تھے۔ دونوں طرف سے دھوم دھام سے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس کا فائدہ اٹھا کر رنگین شاہ کافی پیسے بچا رہا تھا لیکن اکبر خان بے دریغ پیسہ خرچ کر رہا تھا۔

دلہن کے گھر میں دولہے کا شاندار استقبال ہوا۔ اسے بہترین مسند پر بٹھایا گیا، نکاح ہوا۔ امین کے قریبی دوست انور بیگ نے کہا۔

''یار آج وہاں تک تمہاری رسائی نہیں ہوگی۔''

''کیوں۔''

''یہ روایت ہے۔ دلہن کو اس دن صرف گھر لایا جاتا ہے۔ سہاگ کا کمرہ دوسری رات ملتا ہے۔ وجہ شاید یہ ہے کہ دلہن، دولہا بہت تھکے ہوتے ہیں۔''

''اف..... میرا دل چاہتا ہے کہ ابھی اس باریک پردے کو کاٹ دوں جس کے پیچھے دلہن ہے..... خیر.....''

''دلہن کو ڈولی میں سوار کیا گیا۔ وہ اپنے ماں باپ سبھی رشتہ داروں کو چھوڑ کر شوہر کے گھر چلی آئی۔'' یہاں بھی گانا بجانا ہوتا رہا۔

دوسرے دن رات کو امین نے شبنم کا گھونگھٹ اٹھایا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

"اف، اس قدر حسن۔"

اس نے نرم آواز میں پکارا۔

"شبنم۔"

شبنم نے ڈر اور شرم کے ملے جلے لہجے میں اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں کی معصومیت نے امین کو گھیرے میں لے لیا۔ کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔

(۸)

یہ سچ ہے کہ کسی شریر بچے کو کوئی نیا حسین کھلونا مل جائے تو وہ تھوڑی دیر کے لیے بہل جاتا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر اسی شرارت پر اتر آتا ہے اور ادھر ادھر دوسرے کھلونوں کی جانب بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔ امین کی شرارت بھی کچھ دنوں تک شبنم سے بہلی رہی۔ لیکن اس کی گندی فطرت نے پھر کروٹ لی اور اس کا ہر روز رات دیر سے آنا شروع ہو گیا۔ ایک دن شبنم نے شکایت کی۔

"آپ ہر دن دیر سے آتے ہیں۔ آخر یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔"

"کیا کروں بیگم۔ میرے دوست ضدی ہیں۔ وہ محفل جمانے کے بعد مجھے اٹھنے ہی نہیں دیتے۔"

"لیکن آج کل جلدی آجایا کیجیے، میری طبیعت آج کل ٹھیک نہیں رہتی۔"

"کیا۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔"

شبنم کی آنکھوں میں شرم اور ہونٹوں پر تبسم پھیل گیا۔

"ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت نہیں، آپ باپ بننے والے ہیں۔"

امین خوشی سے ناچ اٹھا۔ شبنم کو بانہوں میں بھر لیا۔

"آپ وعدہ کیجیے کہ اب دیر سے نہیں آئیں گے۔ محفل سے تھوڑا جلدی اٹھ جائیں گے۔"

''میں وعدہ کرتا ہوں۔''

(۹)

شبنم نے ایک خوبصورت بچی کو جنم دیا۔ امین لڑکا چاہتا تھا لیکن مجبوری تھی۔ اس کے لڑکے کا باپ بننے کا خواب پاش پاش ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے کچھ ظاہر نہیں کیا۔ لیکن وہ شبنم سے کیے ہوئے وعدہ کو برقرار نہ رکھ سکا۔ آخر شرابی کے وعدہ کا بھی کیا بھروسہ۔

دو سال اسی طرح بیت گئے۔ شبنم دوبارہ ماں بننے والی تھی۔ اس بار امین نے کہا۔

''دیکھو بیگم۔ اس بار ہمیں بیٹا چاہیئے۔''

''جو خدا کو منظور ہوگا، وہی ہوگا۔''

''تم دعا کرو۔ خدا تمہاری دعا سے لڑکی کو لڑکے میں تبدیل کر دے گا۔ خدا نیک بندوں کی سنتا ہے۔ بیگم تم بھی نیک ہو۔ وہ تمہاری دعائیں ضرور قبول کرے گا۔''

دو ماہ بعد شبنم کو لڑکا ہوا۔ امین خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس نے لڑکے کو ہاتھوں میں لے کر پیار کیا اور ایک قیمتی لاکٹ اس کے گلے میں ڈال دیا۔

''آپ نے اتنا قیمتی لاکٹ اس چھوٹے سے بچے کو پہنایا ابھی تو......''

''ارے بیگم یہ بھی تو دیکھو کہ بیٹا کس کا ہے۔''

رات کو امین کی حویلی میں ناچ گانا ہوا۔ کچھ دوستوں نے ضد کر کے پلائی۔ کچھ وہ خود بھی خوشی میں پی گیا۔ بہکے قدم..... نشے میں ڈوبی آواز.....

''آپ..... آپ نے شراب پی لی۔'' شبنم کے چہرے پر نفرت اور حقارت پھیل گئی۔

''بس بیگم آج اتنی خوشی کا دن تھا کہ دوستوں نے پینے کے لیے مجبور کر دیا۔''

بات آئی گئی ہو گئی۔

(۱۰)

دوستوں کی محفلیں اب حویلی کے اندر بھی جمنے لگیں۔ دھیرے دھیرے یہ روز کا معمول بن گیا۔ نئی نئی کمسن لڑکیاں حویلی میں آتی تھیں۔ شبنم اس نئی حالت کو دیکھ کر حیران ہو رہی

تھی۔اس نے جب بھی احتجاج کیا امین نے اس کو رام کر دیا۔لیکن کب تک۔جلد ہی شبنم نے تیسرے بچے کو جنم دیا۔چونکہ امین کے لڑکے کا باپ بننے کا خواب پورا ہو چکا تھا اس لیے اس نے اس جانب کوئی توجہ نہ کی۔وہ اس رات بھی طوائف کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا رہا۔گھر کے حالات دن بہ دن خراب ہوتے جارہے تھے۔شبنم اپنے بچوں کی تربیت ایسے گندے ماحول میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ایک دن آخری فیصلہ کر کے وہ امین کی غیر موجودگی میں اپنے بچوں کو لے کر اپنے باپ کے گھر کے لیے نکل پڑی۔ملازموں نے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن سب بے سود۔وہ ریل گاڑی میں سوار ہوئی۔راستے میں ایک بڑا پل پڑتا تھا۔ریل اس پر سے گزر رہی تھی کہ پل ٹوٹ گیا۔ریل کے ٹکڑے ہو گئے۔

(۱۱)

امین شراب کے نشے میں ڈوبا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا۔شبنم اور بچوں کو نہ پا کر اس نے ملازم کو بلایا۔

''کیوں بے.....مالکن کہاں ہیں؟''

''جناب، وہ اپنے باپ کے گھر چلی گئیں۔''

''کیوں....؟''

''آپ کا یہ رنگ ڈھنگ وہ برداشت نہ کر سکیں۔''

امین کا نشہ کافور ہو گیا۔

''ابے کم عقل! تم نے جانے کیوں دیا۔اب کیا ہوگا۔چلو ہم ابھی چلتے ہیں اور اکبر صاحب سے کوئی بہانہ بنا کر منت سماجت کر کے ان کو واپس لائیں گے۔جلدی چلو۔''

وہ دونوں اسٹیشن پہنچ گئے۔ٹکٹ کھڑکی پر امین نے کہا۔

''سولن کی دو ٹکٹیں۔''

''سولن کی.....کیا آپ کو معلوم نہیں کہ سولن کا پل ٹوٹ گیا ہے اور صبح جو گاڑی سولن جا رہی تھی، اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔''

''کیا.....اور.....اور.....ان میں جو سواریاں تھیں، ان کا کیا ہوا؟''

''ابھی تک پتہ نہیں کہ کتنے مرے اور کتنے زندہ ہیں۔''

''نہیں......شبنم......میرے بچے....''

وہ حادثے کے مقام پر پہنچا۔ لاشیں نکالی جا رہی تھیں اور شناخت کروائی جا رہی تھیں۔ امین کی حالت غیر معمولی طور پر تبدیل تھی۔ بال بکھرے، کپڑے بے ترتیب۔ وہ اس وقت ٹوٹ گیا جب شبنم اور اس کے چھوٹے بیٹے کی لاش ملی۔ بیٹی اور بڑے بیٹے کا کچھ پتہ نہ تھا۔ شبنم اور بچے کو سپرد خاک کیا گیا۔ اس پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ اس کا دوست انوکھے خان اسے دلاسہ دینے لگا۔

''زندگی تو مصیبتوں کا مجموعہ ہے، وقت کے ساتھ زخم بھر جاتے ہیں۔''

''نہیں یار.....میں نے اپنی بیوی کی قدر نہ کی جو ہر وقت مجھ پر سب کچھ فدا کرنے کو تیار رہتی تھی۔ میں وہی عیاشی کا کیڑا رہا۔ نہ جانے میری بیٹی اور بیٹے کا کیا حال ہوگا۔''

''جہاں بھی ہوں گے اچھے ہی ہوں گے۔ تم کوئی غلط خیال دماغ میں نہ لاؤ۔ بہتر ہے کہ کچھ دنوں کے لیے تم ہوا پانی بدل دو۔ ایسا کرتے ہیں کہ سمندر نگر میں میرا ایک دوست ہے۔ اس کے دو مکان ہیں جن کو وہ کرائے پر چلاتا ہے۔ میں اسے کل خط لکھ دیتا ہوں۔ وہ ایک مکان تمہیں کرائے پر دے دے گا۔ تم جب تک چاہو، وہاں رہنا۔ پھر آ جانا۔''

امین نے کچھ سوچتے ہوئے ہاں میں سر ہلایا اور سمندر نگر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

(۱۲)

''کس سوچ میں ڈوب گئے۔'' شبنم نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں۔'' امین یادوں کی دنیا سے باہر آیا اور شبنم کے حسن کو نہارنے لگا۔ اس کی بیوی شبنم خواب تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے جو شبنم تھی وہ حقیقت۔ ایک بار پھر اس کی گندی فطرت نے انگڑائی لی اور وہ سب کچھ بھول کر طوائف رانی کے خیالوں میں ڈوب گیا۔

صبح ہوئی تو اس نے کپڑے بدلے۔ باہر نکل ہی رہا تھا کہ جمال آ گیا۔

''آخر آپ پر بھی طوائف رانی کا جادو چل ہی گیا۔''

''جمال تم بہت باتیں کرنے لگے ہو۔'' طوائف رانی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''جمال، آؤ چلیں۔''

''آپ چلیے حضور، میں ابھی آتا ہوں۔''

''آپا۔ ہماری جیب آج کل سرد ہے۔''

''ابھی گرم کئے دیتی ہوں۔ لیکن یہ تبھی گرم رہ سکے گی جب امین جیسے قدر دان آتے رہیں۔ ورنہ اپنی جیب کو سرد رکھنے کی عادت ڈال لو۔''

دولت دولت کو کھینچتی ہے۔ امین نے دیکھا کہ سمندر نگر میں روئی بوئی جاتی ہے تو اس کے دماغ میں کپڑے کا کارخانہ لگانے کا خیال آیا۔ اس نے احمد خان کو بلایا اور سمندر نگر میں کارخانے کے لیے اچھی زمین تلاش کرنے کے کام پر لگا دیا۔ کچھ دنوں بعد احمد خاں واپس آیا۔

''کیا ہوا احمد خاں۔''

''صاحب آپ کے کہنے کے مطابق ۲۰ کنال زمین کا سودا ہو گیا ہے۔ آپ کاغذات دیکھ کر اسے خرید سکتے ہیں۔''

''ہاں۔ مجھے بھی اس کاروبار میں بڑا منافع سمجھ میں آرہا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اپنا سارا روپیہ اسی میں لگا دوں جس سے کہ یہ ملک کا سب سے بڑا کارخانہ بن جائے اور بہت منافع ہو۔''

''جی۔''

(۱۳)

کارخانے کی ابتدا کے دن اس نے ایک بڑی تقریب رکھی اور سمندر نگر کے لوگوں کو بھی اس میں مدعو کیا۔ امین نے اپنی تقریر میں کہا:۔

''بھائیو!۔ میں نے آپ لوگوں کی مالی حالت کو مضبوط کرنے کی غرض سے یہ کارخانہ کھولا ہے۔ یہاں مزدور مالک سب برابر ہوں گے۔ مل کر کام کریں گے اور اس کارخانے کو بلندی پر پہنچائیں گے۔''

امین کی اس عیاری نے لوگوں کا من جیت لیا۔ لوگ زبردست محنت سے اس کے کارخانے کو بلندی پر لے جانے لگے۔ لیکن جلد ہی اس کی گندی فطرت نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا۔ مزدور جب تک اس کی عیاری اور مکاری سمجھتے، بہت دیر ہو چکی تھی۔ وقت اسی طرح گزرتا رہا۔

(۱۴)

''امی حضور۔ ایک دوست نے خط لکھا ہے کہ تم سمندر نگر چلے آؤ تو میں تمہیں نوکری دلوا دوں گا۔''

''میرے لال، کیا تو اپنی بوڑھی ماں کو چھوڑ کر کوسوں دور نوکری کرنے جائے گا۔''

''ایک جگہ بیٹھنے، چھوٹا موٹا کام کرنے سے ہماری مفلسی دور نہیں ہوگی امی۔ بڑی جگہوں پر بڑے مواقع ہوتے ہیں۔ دوست نے لکھا ہے کہ ملک کا سب سے بڑا کپڑے کا کارخانہ ہے۔ یہاں آگے بڑھنے کے بڑے امکانات ہیں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا جاؤ۔ میری دعائیں ترے ساتھ ہیں۔ کب جانا ہے۔''

''کل۔ امی آپ فکر نہ کریں۔ اللہ کی رحمت اور آپ کی دعائیں مرے ساتھ ہیں۔ جلد ہی میں آپ کو وہاں بلالوں گا۔''

دوسرے دن رقیہ نے بھاری من سے اپنے بیٹے کو وداع کیا۔ بہت دیر تک دروازے پر کھڑی ہو کر اس کو دیکھتی رہی اور وہ جب آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ ماضی کی یادوں میں کھو گئی۔ جب وہ جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھی اور کوئی اس کا پُرسانِ حال نہ تھا۔ تنہائی اور افلاس سے لڑتے لڑتے وہ نہ جانے کب خود کو ختم کر لیتی اگر اقبال علی اسے اپنے بچپن میں ندی کے کنارے ریت پر بے ہوش پڑا نہ ملتا۔ معصوم بچہ۔ لگتا تھا کہ کسی رئیس گھرانے کا ہے۔ لیکن اب تو قدرت نے اسے اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ رقیہ کو جینے کا سہارا مل گیا تھا اور اسی کے بھروسے اس نے جوانی سے بڑھاپے تک کے دن افلاس سے جدوجہد میں کاٹ دیئے۔

(۱۵)

دو دن کے سفر کے بعد اس کی ریل گاڑی سمندر نگر کے اسٹیشن پر پہنچی۔ وہاں اس کا دوست شوکت موجود تھا۔

"کیسے ہو؟"

"اچھا ہوں۔ لیکن تم کچھ دبلے پتلے دکھائی دے رہے ہو۔"

"کچھ نہیں یار۔ یہ سب افلاس اور بے روزگاری کی نشانی ہے۔"

"فکر نہ کرو.... مجھے پورا یقین ہے کہ تمہیں یہاں ضرور نوکری مل جائے گی۔ لیکن مالک تھوڑا ٹیڑھا ہے۔ اس کی ہاں میں ہاں ملانا اور اس کے سامنے خود کو کمتر سمجھنا۔ کسی کے بہکاوے میں آ کر کوئی ایسی حرکت، کوئی ایسا کام مت کر بیٹھنا کہ نوکری پر بن آئے۔"

"مجھے کسی سے کیا مطلب۔ مالک کا حکم بجا لانا، اپنا کام ایمانداری سے کرنا، یہی میری زندگی کا اصول ہے۔"

امین فائلوں میں غرق تھا کہ جمال کمرے میں داخل ہوا۔

"کہو جمال کیسے آئے۔"

"حضور آپ نے طوائف رانی جیسی کتنی ہی جوانیوں کو بڑھاپے میں بدل دیا لیکن خود اب تک جوان ہیں۔ اس لیے آپ کے لیے ایک بالکل نئی کلی منگائی گئی ہے۔ وہ نازنین..... مہ جبیں....."

"اتنا قصیدہ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"حضور، وہ صیاد شاہ جو آپ کا پاسنگ بھی نہیں، اس کلی کا رس چوسنے کو اکثر چکر لگاتا ہے لیکن ابھی تک منی بائی نے گلنار کو سیپ میں بند موتی کی طرح محفوظ رکھا ہے۔"

"اس بھکاری صیاد شاہ کی یہ مجال۔ اس کی اوقات ہی میرے سامنے کیا ہے۔ اس کے جیسے سینکڑوں میرے ملازم ہیں۔ میرے جوتے کے نیچے ہیں۔ تم جاؤ اور دیکھو کہ وہ گلنار کو حاصل نہ کرنے پائے۔ یہ کچھ روپۓ بھی لیتے جاؤ۔ منی بائی سے کہنا روپیوں کی پرواہ نہ کرے۔"

"جی، بہت اچھا۔"

''اب تم جا سکتے ہو۔''

جمال باہر آیا اور اقبال امین کے کمرے میں داخل ہوا۔ دفتر کی سجاوٹ دیکھ کر اقبال حیرت زدہ رہ گیا۔ قیمتی قالین، فانوس، قیمتی تصویریں، قیمتی فرنیچر۔ اس نے اس سے قبل اتنا شاندار کمرہ نہیں دیکھا تھا۔ امین اس کی درخواست دیکھ رہا تھا۔

''تو تمہارا نام اقبال ہے۔ بی، اے پاس ہو۔''

''جی ہاں۔''

''ٹائپ بھی کرنا جانتے ہو۔''

''جی ہاں۔''

''اس سے پہلے کہیں کام کیا ہے۔''

''جی نہیں۔''

''دیکھو، ڈیڑھ سو روپے کی نوکری تمہیں مل سکتی ہے۔''

''میں تیار ہوں۔''

''ہماری کمپنی کا اصول ایمانداری سے کام کرنا ہے، تم جانتے ہو۔''

''جی ہاں۔ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

وہ باہر آیا۔

''کام مل گیا۔''

''ہاں۔''

''مبارک ہو یار۔ اب اپنی ماں کو یہیں بلالو۔''

''ہاں یار۔ آج ہی خط لکھ دیتا ہوں۔''

خط ملتے ہی رقیہ دوسرے دن سمندر نگر کے لیے روانہ ہوگئی۔ وہاں پہنچنے پر اقبال نے اسے اسٹیشن سے لیا اور گھر آ گیا، جو اسے کمپنی کی طرف سے رہنے کو ملا تھا۔

''یہ ہمارا گھر ہے امی۔ اب ہم سکھ سے رہیں گے۔''

''بیٹا، مجھے سکھ تو تب ملے گا جب اس گھر میں ایک چاند سی بہو آئے گی۔''

''ابھی تو امی اپنی تنخواہ ڈیڑھ سو روپئے ہے۔ اتنے میں شادی.....''

''بیٹا، جب تمہاری شادی ہوگی تو بہو بھی اپنی قسمت سے روزی لائے گی۔''

(۱۶)

''شاہ، آپ تو عید کا چاند ہو گئے۔''

''کیا کروں منی بائی اب کام بہت رہتا ہے۔ اچھا اس لڑکی کو بلاؤ۔''

اس نے گلنار کو آواز دی۔ گلنار چھم چھم کرتی آئی۔ اس کے ہاتھ میں پاندان تھا۔ اس نے امین کے سامنے رکھتے ہوئے کہا:۔

''آداب''

گلنار حسن کی بجلی تھی۔ امین نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''واقعی تم گلنار ہو۔''

اس نے پانچ ہزار روپئے گلنار کے ہاتھ میں رکھے اور اس کو اپنے بازو میں کھینچنے ہی والا تھا کہ کارخانے کا منشی دوڑتا ہوا آیا۔

''کیا بات ہے، یہاں کیوں آ گئے۔''

''حضور بات ہی کچھ ایسی ہے۔ جس پارٹی نے آپ سے پانچ لاکھ کا کپڑا لینے کی بات کی تھی وہ اچانک آ گئی ہے۔ پیسے بھی ساتھ لائی ہے۔ اسے صبح ہی جانا ہے۔ اس لیے سودا ابھی کرنا ہے۔ صبح چار بجے ہی اس کی ریل گاڑی ہے۔ اس لیے آج کی رات میں ہی سودا پکا کرنا بڑی مجبوری ہے۔ ورنہ بہت نقصان ہو جائے گا۔''

''اوہو..... یہ کاروبار بھی نا.....''

حالانکہ امین وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ ایک بار جی میں آیا کہ منشی کو واپس کر دے۔ لیکن تجارتی دماغ نے عیاش دل پر قابو پایا۔ دماغ نے کہا کہ گلنار تو اپنی ہی ہے۔ آج نہیں تو کل۔ لیکن پارٹی ایک بار چلی گئی تو اس نقصان کے ساتھ ساتھ آئندہ کے کاروبار سے ہونے

والے فائدے پر بھی روک لگ جائے گی۔اس لیے دانش مندی اسی میں ہے کہ آج چلا جائے۔ گلنار تو اپنے ہاتھ کا مال ہی ہے۔

''منشی،کل کا کیا پروگرام ہے۔''

''حضور کل تو آپ کو شہر سے باہر جانا ہے۔''

''اوہ۔اچھا واپسی کب ہوگی۔''

''جی پورن ماشی کے دن۔''

''تو ٹھیک ہے منی بائی۔ہم پورن ماشی کے دن آئیں گے۔تب تک گلنار تمہارے پاس ہماری امانت ہے۔''

(۱۷)

''امی میں آ گیا۔''

''بیٹے میں چائے لاتی ہوں۔''

اقبال چائے پینے لگا تو رقیہ نے بات چھیڑی۔

''آج صبح ہی اپنی بستی سے آدم آیا تھا۔''

''کون آدم۔''

''بیٹے وہ تمہارے لیے رشتہ لایا تھا۔''

''امی۔آپ تو میری شادی کے پیچھے ہی پڑ گئیں۔''

''بیٹا، میں بوڑھی ہو چکی ہوں۔نہ جانے کب آنکھ بند ہو جائے اور تمہارا سہرا دیکھنے کی تمنا دل میں ہی رہ جائے۔''

''امی آپ ایسی باتیں مت کیجیے۔آپ سو سال جئیں۔دیکھئے ابھی نئی نئی نوکری ہے۔ ہمارے گھر سے ابھی ابھی مفلسی دور ہوئی ہے۔تو کم سے کم ایک سال کا وقت تو چاہیئے تاکہ آنے والے مستقبل کے لیے تیاری کی جائے۔''

''ٹھیک ہے بیٹا۔بات تو تیری بالکل صحیح ہے۔لیکن یہ جو تیرے رشتے آتے رہتے

ہیں، ان کا میں کیا کروں۔"

"امی جان، آپ ان سے کہہ دیجیے کہ ہم شادی کے متعلق کم از کم ایک سال کے بعد سوچیں گے۔"

"ٹھیک ہے بیٹا۔"

(۱۸)

"محمود کیا بات ہے۔"

اقبال نے مزدوروں کے ایک چھوٹے سے گروہ کو جمع ہوتے دیکھا تو پوچھا:۔

"ارے یار، یہ ہے نا اپنا امین سیٹھ۔ یہ اس سال بھی بونس نہیں دے گا۔ اس کا خازن کہہ رہا تھا کہ اس سال بھی کمپنی کو نقصان ہوا ہے۔ جھوٹا، مکار۔"

"تو مالک سے بات کریں۔"

"کچھ فائدہ نہیں۔ وہ بوڑھا تو شہر سے باہر ہے۔ یہ تیسرا سال ہے جب ہمارا بونس ہڑپ لیا گیا ہے۔ اب تو صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔"

"تو......"

"آج ایک میٹنگ بلاتے ہیں۔ وہیں آگے کے بارے میں فیصلہ ہوگا۔"

(۱۹)

"کیا بات ہے بیٹا۔ کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو۔"

"سوچتا ہوں امی کہ غریب کی قسمت میں سکھ شانتی تھوڑی دیر کے لیے آتی ہے اور اس کے پیچھے پیچھے نئی نئی مصیبتیں اس کا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔"

"کیا ہوا۔"

"ہمارا مالک ۳ سال سے بونس نہیں دے رہا ہے۔ مزدوروں نے اس کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے کمر کس لی ہے۔ آج رات کو اس سلسلے میں میٹنگ ہے۔ مجھے وہاں جانا پڑے گا۔"

"نہیں، تم وہاں مت جاؤ۔ ٹھیک ٹھاک زندگی گزر رہی ہے۔ تمہیں اس الجھن میں

نہیں پڑنا چاہیئے۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا امی۔ آخر مجھے اپنے مزدور ساتھیوں کے ساتھ ہی کام کرنا ہے اور ان کا مطالبہ بھی ناجائز نہیں ہے۔ میں خود محسوس کرتا ہوں کہ کمپنی بہت منافع میں ہے۔ ورنہ دن بہ دن نئے نئے ملازم کیوں بھرتی کیے جا رہے ہیں اور مشینیں کیوں بڑھائی جا رہی ہیں۔ زمینیں کیوں خریدی جا رہی ہیں۔ میرا ضمیر بھی نہیں مانتا کہ میں اپنے ساتھیوں کا ساتھ چھوڑ دوں۔"

"ضمیر کی آواز کو دبانا نہیں چاہیئے بیٹا۔ تم جو مناسب سمجھو، کرو۔"

(۲۰)

"دوستو! ہم دن رات محنت کر کے اپنے سیٹھ کی تجوریاں بھر رہے ہیں لیکن وہ ہم سے لگاتار تین سال سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ کمپنی منافع میں چل رہی ہے۔ پھر بھی دو سال ہم نے ضبط کر کے سیٹھ کے جھوٹ کو نظر انداز کیا لیکن ضبط کی بھی حد ہوتی ہے۔ اگر ہم اب بھی اپنے حق کے لیے ایک نہ ہوئے اور مطالبہ نہیں کیا تو ایک دن ایسا آئے گا کہ بونس نام کی چیز اس کارخانے سے ختم کر دی جائے گی۔"

"دوستو! بونس ہمارا حق ہے۔ ہمارے خون پسینے کی کمائی ہے۔ کل سے ہڑتال شروع ہوگی اور دو دن تک چلے گی تاکہ مالک کو ہمارے مسئلے کی سنجیدگی سے واقفیت ہو اور وہ اس پر غور کر کے ہمارے حق میں فیصلہ کریں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو دو دن بعد آگے کا پروگرام بنایا جائے گا۔"

یہ کل چالیس مزدوروں کی میٹنگ تھی جس میں محمود نے تقریر کی۔ محمود کو مزدوروں نے اپنا قائد چن لیا۔ حالانکہ کارخانے میں پندرہ سو سے زائد ملازم کام کرتے تھے۔ لیکن سب کے مسئلے ایک ہونے کے سبب ان کے ایک ہونے کا پورا امکان تھا۔

(۲۱)

"اقبال جب گھر آیا تو ماں کو بیمار پایا۔"

"چاچی کیا ہوا امی کو۔"

"کچھ نہیں بیٹا۔ پتہ نہیں کیوں بے ہوش ہو گئیں۔ تم جا کر ذرا ڈاکٹر کو لے آؤ۔"

''جی۔''

وہ بھاگتا ہوا گیا اور ڈاکٹر کو لے آیا۔

''شاید کمزوری سے بے ہوش ہوگئیں ہیں۔ میں انجکشن دے دیتا ہوں۔ کل آپ انہیں ضرور اسپتال لے جا کر ان کا ٹیسٹ کروالیں۔''

''کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔''

''یہ تو ایکسرے دیکھنے کے بعد ہی بتایا جاسکے گا۔''

انجکشن کے کچھ دیر بعد رقیہ ہوش میں آگئی۔

''امی، خدا کا شکر ہے آپ ہوش میں آگئیں۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔''

''زندگی، موت تو خدا کے ہاتھ ہے بیٹا۔ جب بلاوا آجائے گا۔ جانا ہی پڑے گا۔''

''ابھی نہیں امی۔ ابھی مجھے آپ کی بہت ضرورت ہے۔ آپ کے بغیر میں بالکل تنہا ہو جاؤں گا۔''

رات کو دیر تک جاگنے کے سبب وہ صبح دیر سے اٹھا۔ اٹھتے ہی اسے اسپتال کا خیال آیا۔ وہ تانگہ لینے باہر بھاگا۔ دوڑ، دھوپ میں وہ ایک لڑکی سے ٹکرا گیا۔

''اندھے ہو گیا۔''

''معاف کرنا بہن۔ میں تمہیں دیکھ نہیں سکا۔ میں ذرا پریشان ہوں۔''

''بہن..... تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں۔ میں طوائف ہوں۔''

''تو کیا ہوا۔ طوائف بھی تو انسان ہوتی ہے۔ کسی کی بہن بیٹی ہوتی ہے۔''

''تو یہ جان کر بھی کہ میں طوائف ہوں تمہیں مجھ سے کراہیت محسوس نہیں ہوتی۔''

''بالکل نہیں۔ جب میں نے تمہیں بہن کہہ دیا تو واقعی تم میری بہن ہو۔''

''تمہارا نام کیا ہے۔ کہاں رہتے ہو۔''

''میرا نام اقبال ہے اور میں کھولی والی گلی میں رہتا ہوں۔''

''میں تم سے ملنے آؤں گی۔ آسکتی ہوں نا۔''

''بالکل بلا کسی خوف کے۔''

''میرا نام گلنار ہے اور میرا ٹھکانہ پورے شہر کو معلوم ہے۔ میں شریف گلی میں رہتی ہوں۔''

''بہن میں تم سے ملنے آتا۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہاں لوگ بھائی بہن کے رشتے پر شک کریں گے۔''

''میں جانتی ہوں بھیا۔ لیکن میں تم سے ملنے ضرور آؤں گی۔''

''بالکل آنا......ارے معاف کرنا۔ ماں بیمار ہے، مجھے سواری لینی ہے۔ میں چلتا ہوں۔''

''خدا حافظ، بھیا۔''

(۲۲)

ڈاکٹر مریض کو دیکھ رہا تھا۔

''آپ کی امی کو ہرنیا ہے۔ اس کا آپریشن جتنی جلد ہو جائے، اچھا ہے۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب، آپریشن بڑا تو نہیں۔''

''بالکل نہیں۔ بہت چھوٹا اور آسان آپریشن ہے۔''

''ٹھیک ہے میں دو دن کے بعد پھر امی کو اسپتال لا کر بھرتی کر دیتا ہوں۔''

''اب کیسا لگ رہا ہے امی۔''

''طبیعت تو اچھی ہے بیٹا۔''

''خدا کا شکر ہے۔ امی پرسوں آپ کو پھر اسپتال لا کر بھرتی کرانا ہے۔ ایک چھوٹا سا آپریشن ہے۔ اس کے بعد آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔''

رقیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بیٹا۔ آپریشن پھر بھی آپریشن ہے۔''

(۲۳)

گلنار کھولی گلی میں اقبال کے گھر میں داخل ہوئی۔

''اقبال بھائی کا گھر یہی ہے۔''

''ہاں یہی ہے۔تم کون ہو بیٹی۔''

''جی میں اقبال بھائی کی منہ بولی بہن ہوں۔آپ کی طبیعت اب کیسی ہے۔''

''ٹھیک ہوں بیٹی۔اقبال کہہ رہا تھا کہ پرسوں پھر اسپتال جانا ہے۔چھوٹا آپریشن ہے۔میں اس فکر میں ہوں کہ میرے اسپتال جانے کے بعد اس کے کھانے پینے کا کیا ہوگا۔''

''اقبال بھائی کہاں ہیں۔''

''پاس میں اپنے دوست کے یہاں گیا ہے۔'' اتنے میں اقبال آ گیا۔

''گلنار بہن کیسی ہو۔''

''اچھی ہوں بھیا۔ماں کو دیکھنے آئی تھی۔اب میں چلتی ہوں۔پھر آؤں گی۔''

''ایسا کیا کہ ابھی آئی، ابھی چلی۔کچھ کھا پی لو۔ذرا دم لے لو۔''

''نہیں امی۔اب مجھے چلنا چاہیئے۔''

''جیسی تمہاری مرضی بیٹی۔اقبال جاؤ اپنی بہن کو چھوڑ آؤ۔''

وہ دونوں شریف گلی کی طرف چل پڑے۔

''امی کہہ رہی تھیں کہ وہ دو دن اسپتال میں رہیں گی تو تمہارے کھانے پینے کا کیا ہوگا۔اگر تم مناسب سمجھو تو ان دنوں میں گھر آجاؤں، تمہارے کھانے پینے کا خیال رکھنے کے لئے۔''

مناسب کی کیا بات ہے بہن۔تمہارا گھر ہے جب آؤ جتنے دن رہو۔یہاں کوئی بات نہیں ہے لیکن اس سے تمہارے گھر والوں کو......''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔''

''پھر بھی۔''

''دیکھو میں تمہاری بڑی بہن ہوں نا۔ بڑوں کا حکم نہیں ٹالا کرتے۔''

اقبال امی کو لے کر اسپتال گیا۔ گلنار بھی ساتھ تھی۔ بھرتی میں دیر تھی۔ اقبال نے کہا۔

''کیا یہ ممکن ہے بہن کہ تم اس گلی کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اپنے بھائی کے گھر آجاؤ۔''

''اس بارے میں پھر بات کریں گے بھیا، پہلے امی کو ٹھیک ہوجانے دو۔''

امی کو اسپتال میں داخل کر کے گلنار اقبال کے گھر آ گئی۔

دوسرے دن صبح اقبال نے نہا کر کپڑے پہنتے ہوئے کہا:۔

''بہن وہ میز پر میرا لاکٹ ہے۔ میں نے نہاتے وقت اتار دیا تھا۔ ذرا اسے لے آؤ۔''

گلنار نے لاکٹ کو اٹھایا تو اسے وہ مانوس لگا۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔

''یہ تو میرا لاکٹ ہے۔ یہاں کیسے......ارے میرا لاکٹ تو میرے پاس ہے۔ بالکل ہو بہو میرے جیسا لاکٹ۔''

''بھیا یہ لاکٹ تم نے کہاں سے خریدا۔''

''میں نے اسے نہیں خریدا بلکہ یہ تو بچپن سے ہی میرے گلے میں ہے۔''

''کمال ہے، منی بائی نے مجھے بتایا تھا کہ جب میں اسے ریل کے حادثے کے بعد ملی تھی تو اس وقت یہ لاکٹ میرے گلے میں تھا۔ شاید یہ میرے ماں باپ کی نشانی ہے۔''

''ارے یہ تو میرے جیسا ہو بہو لاکٹ ہے۔ مجھے امی سے پوچھنا پڑے گا کہ یہ لاکٹ اس نے کہاں سے خریدا ہے۔ شاید تمہارے ماں باپ کا پتہ لگ جائے۔ چلو اسپتال چلتے ہیں۔''

''امی جیسا لاکٹ میرے پاس بچپن سے ہے، اسی طرح کا لاکٹ بہن کے پاس بھی بچپن سے ہے۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ میرا لاکٹ آپ نے کہاں سے خریدا تھا۔ شاید بہن کے ماں باپ کا کچھ پتہ لگ جائے کیونکہ اس کو پالنے والی نے بتایا کہ یہ اس کو ریل حادثے والے دن ندی کے کنارے ملی تھی اور اس کے گلے میں یہ لاکٹ تھا۔''

''بیٹا۔ میں نے بھی تو تمہیں ریل کے حادثے والے دن ندی کے کنارے ریت پر ہی پایا تھا۔''

''کیا، اس کا مطلب ہے تم میری اصلی ماں نہیں ہو۔''

''نہیں بیٹا۔ تو مجھ بے کس لاچار کو خدا کا دیا ہوا وہ عطیہ تھا کہ ترے ملنے کے بعد میری زندگی میں جینے کی تمنا جاگی۔ ورنہ اس بھری دنیا کی تنہائی میں تو میں کب کی مر چکی ہوتی۔'' اس کے بعد رقیہ نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہمارے ماں باپ شاید ہمیں لے کر ریل گاڑی سے کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں یہ حادثہ پیش آیا۔ شاید ہمارے ماں، باپ، کوئی بھائی، بہن ہو اور وہ زندہ ہوں، یا نہ ہوں۔''

''خدا بڑا کریم ہے بھیا، اس نے اتنے سالوں بعد مجھے میرے بچھڑے ہوئے بھائی سے ملا دیا ورنہ نہ جانے میرا کیا ہوتا۔''

رقیہ اور اقبال نے بھی خدا کا شکر ادا کیا۔

(۲۴)

اقبال پہلی بار شریف گلی میں داخل ہو رہا تھا۔ گلنار اس کے ساتھ تھی۔

''اری بیٹی۔ تو تو کچھ دن بعد آنے والی تھی.....اور یہ کون ہے؟''

''یہ میرا چھوٹا بھائی اقبال ہے آپا جی، جو بچپن میں بچھڑ گیا تھا۔ ہم دونوں ہی ریل کے حادثے میں جدا ہو گئے تھے۔ ہمارے گلے میں ایک ہی قسم کا لاکٹ ہے۔ یہ دیکھئے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوا بیٹی۔''

''آپا جی، میرا بھائی مجھے اس دنیا سے دور اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔''

''بیٹی۔ جب ایک بار کوئی لڑکی یہاں آجاتی ہے تو اس کے گھر والے بھی اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ کوئی کوئی ایسا ہوتا ہے جو زمانے سے لڑنے کی طاقت رکھتا ہے۔ ورنہ میں نے بہت سی لڑکیوں کو گھر والوں کو لے جاتے اور پھر ذلت کے ساتھ لڑکیوں کو ہمیشہ کے لیے یہاں آتے دیکھا ہے۔''

''آپ یقین مانئے آپا جی۔ چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے، چاہے مجھے یہ شہر چھوڑ کر

جانا ہی کیوں نہ پڑے، کتنی ہی مصیبتیں آئیں لیکن میں اپنی بہن کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا۔اس کو ایک شرافت کی زندگی دوں گا۔اس کی شریف گھر میں شادی کر کے اپنا فرض ادا کروں گا۔"

"مجھے تمہاری باتوں میں سچائی محسوس ہوتی ہے۔جاؤ گلنار اپنے بھائی کے ساتھ جاؤ،تم آزاد ہو۔"

"آپ بہت نیک عورت ہیں،آپا۔"

"بیٹی،ہم عورتیں جن مجبوریوں میں اس پیشے میں قدم رکھتی ہیں اور زبردستی دھکیل دی جاتی ہیں، وہ تم بخوبی جانتی ہو۔تمہیں یہاں سے آزاد کر کے میں سمجھوں گی کہ میں نے کوئی بڑا نیک کام کیا ہے۔جاؤ اب جلدی یہاں سے چلی جاؤ۔اپنے کپڑے، سامان وغیرہ سمیٹ لو۔جلدی کرو۔"

"خدا حافظ،آپا جی۔"

"خدا تمہیں سلامت رکھے اور عزت کی زندگی عطا فرمائے۔"

(۲۵)

پورن ماشی کی رات آگئی۔امین نے منی بائی کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا:۔

"لاؤ منی بائی۔میری امانت میرے حوالے کرو۔"

"آپ کے پیسے میں نے پہلے ہی میز پر رکھ دیئے تھے امین صاحب۔وہ رکھے ہیں۔گلنار یہاں سے چلی گئی۔"

"اچھا......اور تم نے اسے جانے دیا۔یہ کیوں نہیں کہتی کہ کسی رئیس زادے نے تمہیں زیادہ پیسوں میں خرید لیا اور تم نے بے ایمانی کی۔"

"نہیں امین صاحب، کچھ جذبات، کچھ نیکیاں اتنی قیمتی ہوتی ہیں کہ ساری دنیا کی دولت مل کر بھی ان کو نہیں خرید سکتی۔گلنار کا بچھڑا ہوا بھائی مل گیا۔اس کے گلے میں بھی وہی لاکٹ تھا جو ریل حادثے کے دوران مجھے ملی گلنار کے گلے میں تھا۔"

"ریل حادثہ....." امین کے دماغ پر ایک جھٹکا لگا اور وہ منی بائی سے بنا کچھ کہے بغیر

روپئے اٹھائے انتشار کے عالم میں وہاں سے چلا گیا۔

(۲۶)

''امی، آپ ٹھیک ہو کر گھر واپس آ گئیں، بہن بھی آ گئی۔ اب میں کام پر جاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہیں تمہاری بہن مل گئی۔''

''اور مجھے ماں اور بھائی۔'' گلنار نے رقیہ سے لپٹتے ہوئے کہا۔

اقبال کے گھر کے مسئلوں میں مصروف ہو جانے کے سبب محمود اکیلا پڑ گیا اور چالیس سے زیادہ لوگ اس سے نہ جڑ سکے۔ اگر یہ مہم ناکام ہو جاتی تو محمود کا اور ان چالیس مزدوروں کا کام سے نکالا جانا طے تھا۔ اقبال اب اپنے ضمیر کو دبا نہیں سکا۔ محمود تقریر کر رہا تھا کہ اقبال نے اسے پیچھے ہٹا کر خود بولنا شروع کیا۔

''بزدلو، کیا زندگی بھر یوں ہی مر مر کے جیتے رہو گے۔ کمر توڑ محنت کرنے کے بعد بھی آدھا پیٹ کھاؤ گے اور اپنے بال بچوں کو بھوکا رکھو گے۔ ان کی شادی بیاہ کے لیے لوگوں سے بھیک مانگتے پھرو گے۔ کم ظرفو، اکتالیس مزدور تمہارے حق کے لیے، اپنے حق کے لیے سرمایہ داری سے لڑ رہے ہیں اور تم ان کا ساتھ دینے کی بجائے مالک کے پٹھو بنے ہوئے ہو۔ اس طرح کب تک زندہ رہ سکو گے اور مسائل سے لڑ سکو گے۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ تمہیں اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو بھی اپنے مسائل حل کرنے کے لیے ان سرمایہ داروں کی عیاشی میں گروی رکھنا پڑے گا، یاد رکھو۔''

اقبال پڑھا لکھا تھا اور اب تک اس مہم سے دور تھا۔ لیکن اس کی تقریر میں اتنا جوش تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے سارے مزدور اکٹھا ہو گئے اور آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے۔ ایک مزدور نے جذبات میں چیخ کر کہا:۔

''آپ پڑھے لکھے ہیں، ہم آپ کی عزت کرتے ہیں، کیا آپ بھی ہمارے ساتھ ہیں۔''

''بالکل، میں تمہارے ساتھ ہوں، مرتے دم تک۔''

''تو ہم آپ کو اپنا لیڈر مانتے ہیں۔ کیوں بھائیو۔''

چاروں طرف سے 'ہمیں منظور ہے۔ ہمیں منظور ہے' کی فلک شگاف صدائیں بلند ہوئیں۔

"بھائیو! میں آپ کا لیڈر نہیں، آپ کا بھائی ہوں۔ ایک مزدور ہوں اور آپ سے التجا کرتا ہوں کہ محمود کو ہی لیڈر مانیں کیونکہ سب سے پہلے اسی نے ہماری مظلومیت کے خلاف نعرۂ احتجاج بلند کیا تھا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ محمود کو سارے لوگ لیڈر تسلیم کریں اور آپسی مشورے سے جو بھی پروگرام آگے بنے اس پر پوری طرح عمل کیا جائے۔

"ہمیں منظور ہے۔"

(۲۷)

ہڑتال شروع ہوگئی۔ امین کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے منشی کو بلایا۔

"یہ سب کیا ہے۔"

"حضور، مزدور بونس کی مانگ کر رہے ہیں۔"

"اوفو..... تو ان کے لیڈر کو خرید کر ہڑتال ختم کرادو۔"

"ابھی ایسا ممکن نہیں ہے حضور۔ میں سوچتا ہوں پہلے آپ معاملے کو سمجھ لیں۔ ان کے لیڈر کے تیور بھانپ لیں۔"

"اچھا، کون ہے ان کا لیڈر۔"

"لیڈر تو ان کا محمود ہے لیکن وہ ان پڑھ ہے۔ اس کے پیچھے اقبال کا دماغ کام کر رہا ہے۔ جو کہ بی، اے، پاس ہے۔"

"تو پھر بات کس سے کرنی چاہیئے۔"

"میرے خیال سے اقبال کو ہی بلا کر بات کرنی چاہیئے۔"

"دیکھو اقبال۔ میں سمجھتا ہوں تم میرے آدمی ہو۔ میں نے تمہاری قابلیت دیکھ کر تمہیں نوکری دی۔ لیکن تم میرے خلاف ہو گئے۔ تمہیں ان کا ساتھ چھوڑ دینا چاہیئے۔ تمہاری کوئی ذاتی پریشانی ہو تو تم مجھے بتاؤ۔"

''پریشانی تو میری وہی ہے سر، جو سارے مزدوروں کی پریشانی ہے۔بونس نہیں۔اس ماہ کی تنخواہ بھی نہیں۔''

''تو تنخواہ لے لو۔کون تمہاری تنخواہ دباتا ہے۔ابھی تنخواہ لو اور کام پر آجاؤ۔''

''نہیں سر، تنخواہ نہیں دبائی جارہی ہے بلکہ بونس کی شکل میں ہمارا حق دبایا جارہا ہے۔ اب تو بونس اور تنخواہ ایک ساتھ ہی لیں گے۔''

''تم جاسکتے ہو۔''

اقبال نے باہر جاکر مزدوروں کو اندر کا واقعہ کہہ سنایا۔اقبال کی ایمانداری سے مزدوروں میں مزید جوش پیدا ہوگیا اور انہوں نے انقلاب زندہ باد کا ایسا زور کا نعرہ لگایا کہ امین کے دفتر کے در و دیوار ہل گئے۔

''میں اس کو ختم کرادوں گا۔''

''کس کو، سرکار''

''اسی کتے اقبال کو جو ہمارے ٹکڑوں پر پلتا ہے اور.......''

''سرکار، عقل سے کام لیجیے۔ایک اقبال مرے گا تو یہ سارے ۱۵۰۰ سے زیادہ مزدور اس کی جگہ لے لیں گے۔اس کو مارنا ہے تو اس کی ضرورت سے ماریئے۔یہ خود بہ خود مر جائے گا۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''سرکار، اس کی ایک جوان بہن ہے جس کی شادی کے لیے یقیناً اسے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ سبھی مزدوروں کی طرح اس کے گھر میں بھی آج کل تنگ دستی چل رہی ہے۔اس کے متعلق اس سے بات کی جائے تو پوری امید ہے کہ وہ پگھل جائے گا۔کیونکہ اس قسم کی ضرورت کے آگے بڑے بڑے پتھر دل پگھل جاتے ہیں، ٹوٹ جاتے ہیں۔''

(۲۸)

اقبال گھر میں داخل ہوا۔گلنار اس کی منتظر تھی۔

''بھائی، بستی میں شور ہے کہ کارخانہ بند ہے اور مزدوروں نے ہڑتال کی ہے۔''

''ہاں بہن۔ ہم لوگ اپنے حق کے لیے لڑ رہے ہیں۔ خود اپنا پیٹ جلا رہے ہیں اور مالک کا صرف مالی نقصان ہو رہا ہے۔ خیر ہم حق پر ہیں، جیت ہماری ہوگی۔''

''بھیا، کچھ دنوں میں راشن کی ضرورت پڑے گی۔''

''کوئی بات نہیں بہن۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔''

اقبال کھانے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''منشی جی آپ! اس وقت۔''

''ہاں، آپ کو مالک نے اس وقت حویلی پر بلایا ہے۔ بہت خاص کام ہے۔''

''اس وقت..... اچھا چلو۔''

وہ امین کی بڑی حویلی میں داخل ہوا۔

''آؤ، اقبال۔ بھئی تم نے ہمیں اپنا نہیں سمجھا۔''

''ایک آپ ہی تو اپنے ہیں سر۔ آپ ہماری بات مان لیں۔ ہمارا حق دے دیں۔ ہم کمپنی کو پھر سے اپنی محنت سے عروج پر لے جائیں گے اور آپ کا اس وقت کمپنی بند ہونے سے جو نقصان ہوا ہے، وہ بھی ہم اپنی بھرپور محنت سے پورا کر دیں گے۔''

''وہ سب پرانی باتیں ہیں۔ تم ابھی نئے آئے ہو، محنتی ہو، تمہیں اس سے کیا۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارے گھر میں آج کل تنگ دستی ہے اور تمہاری بہن کی شادی کے لیے بھی روپے چاہئیں۔ دیکھو، تم تو ابھی نئے آئے ہو، تین سال کے بونس سے تمہارا کوئی مطلب تو ہے نہیں اور پھر تم تو مزدور بھی نہیں ہو۔ پڑھے لکھے کلرک ہو جو آگے بہت ترقی کر سکتا ہے۔''

''اسی طرح کی باتوں سے سرمایہ داری آج کل حاوی ہے جناب۔ بیدار ذہنوں کو خرید کر، ان کو اپنی طرح آسائشیں دے کر، ان کو اپنے گروہ میں شامل کر کے مظلوموں کو اکیلا کر دیا جا رہا ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہے سر، میں کسی بھی حال میں اپنے مزدور بھائیوں کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔''

امین اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا اور اقبال وہاں سے واپس آ گیا۔

(۲۹)

منشی بھاگتا ہوا امین کی حویلی میں داخل ہوا۔

''کیا بات ہے، اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

''حضور سرکاری افسر آیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے سرکار تک ہڑتال والی بات پہنچ گئی۔''

''کوئی بات نہیں حضور۔ میں تو آپ سے یہ کہنے کے لیے پہلے ہی دوڑتا ہوا آیا ہوں کہ آپ کچھ روپئے نکال لیں۔ جتنا زیادہ روپیوں کا وزن ہوگا یہ افسر اتنی ہی ہلکی رپورٹ آپ کے خلاف بنائے گا یا پھر ادھر ادھر کر کے معاملے کو پوری طرح رفع دفع ہی کر دے گا۔''

''ہوں۔''

سرکاری افسر اندر داخل ہوا۔

''آیئے حضور۔ تشریف رکھئے۔''

''امین صاحب، آپ کی کمپنی میں شاید کچھ ٹھیک نہیں چل رہا ہے۔ مزدوروں نے ہڑتال کی ہے۔ مجھے سارے واقعے کی رپورٹ سرکار کو بھیجنی ہے۔ اس لیے......''

افسر اپنے جملے پورے بھی نہ کر پایا تھا کہ امین نے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں۔ افسر انہیں کنکھیوں سے دیکھنے لگا۔

''دراصل جناب، یہ مزدور بڑے مفت خور ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے کارخانہ گھاٹے میں ہے۔ اگر ایک کو نکالو تو سارے ایک ہو جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ظلم مجھ پر ہو رہا ہے۔ کارخانہ بند ہے۔ نقصان پر نقصان۔ بتایئے میں کہاں جاؤں اپنی فریاد لے کر۔ پولیس، کورٹ میں جاؤں تو انہیں تکلیف ہوگی۔ ان کی تکلیف دیکھ کر مجھے تکلیف ہوگی۔ آخر ہیں تو یہ سب میرے ہی پالے ہوئے۔ آپ سمجھ گئے نا۔'' امین نے نوٹوں کی گڈی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ افسر نے نوٹوں کی گڈی اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ درست فرماتے ہیں امین صاحب، یہ مزدور قوم ہوتی ہی کام چور ہے۔ جب

مصیبت میں ہوتے ہیں تو ہاتھ پیر جوڑ کر نوکری مانگتے ہیں اور جب پیٹ کچھ بھرنے لگتا ہے تو اپنی اصلیت پر آجاتے ہیں۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میری رپورٹ آپ ہی کی حمایت میں جائے گی۔''

(۳۰)

''دوستو! ہم نے ہڑتال کر کے دیکھ لی۔ لیکن مالک نے کسی بھی طرح ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ اس لیے ہمیں بھوک ہڑتال کے لیے مجبور ہونا پڑ رہا ہے۔ کل سے بھوک ہڑتال شروع ہوگی۔''

سرکاری افسر نے امین سے کہا:۔

''امین صاحب! مزدوروں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی ہے۔ شہر میں چاروں طرف اس کا چرچا ہے۔ حکومت کو خوف ہے کہ بھوک ہڑتال کے دوران فساد نہ پھیل جائے۔ قانونی نظام درہم برہم نہ ہو جائے۔ آپ کو کچھ ایسا کرنا ہوگا کہ ہڑتال ختم ہو۔ کیونکہ عام ہمدردیاں بھی مزدوروں کے ساتھ ہوتی جارہی ہیں۔ سیاسی جماعتیں بھی اپنا ووٹ بڑھانے کے لیے ان کا ساتھ دے رہی ہیں۔ شہر بھر کے امیروں کے خیالات بھی آپ کے خلاف ہیں کہ آپ مسئلے کو صحیح طرح سلجھا نہیں پا رہے ہیں اور اس طرح ان کے ملازمین کو بھی بہک جانے کا خطرہ ہے، میں کیا کروں۔''

امین کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ منشی نے اشارہ کیا اور سمجھایا۔

امین نے ہنستے ہوئے کہا۔

''جناب آپ کے ہوتے ہوئے کس کی مجال ہے کہ حکومت کے کان بھرے۔ اب آپ اس مسئلے کو اور اس کے متعلق شہر کے لوگوں کے خیالات کو اتنا سمجھتے ہیں تو اس کا حل بھی اگر آپ کی نظر میں کوئی ہو تو تجویز کریں، پیسوں کی فکر نہ کریں۔''

''کام مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کافی رقم خرچ ہوگی تقریباً ۲۰/ہزار روپئے۔''

''مجھے منظور ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کوئی ایسا راستہ سوچتا ہوں کہ جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

(۳۱)

اقبال بھوک ہڑتال پر بیٹھ گیا۔ محمود باہر لوگوں سے باتیں کر رہا تھا۔ اسی طرح تین دن بیت گئے۔ مسئلہ حل نہ ہوا۔ اقبال کی طبیعت بگڑنے لگی۔

''اقبال، سب ٹھیک تو ہے۔''

''ہاں محمود۔ لیکن سر میں درد ہو رہا ہے اور کچھ چکر بھی آ رہا ہے۔ شاید کمزوری کے سبب۔''

''اچھا۔ تب تو تمہیں گھر جانا چاہیئے۔ ہڑتال تو تم وہاں بھی جاری رکھ سکتے ہو۔''

''نہیں یار گھر گیا تو ماں اور بہن پریشان ہو جائیں گی اور ممکن ہے محبت میں آ کر مجھے ہڑتال توڑنے کو کہیں۔''

''اچھا..... تو ایسا کرتے ہیں تم میرے جھونپڑے میں چلو، وہاں تمہیں آرام ملے گا۔''

دروازے پر دستک ہوئی۔ محمود کی بہن رضیہ نے دروازہ کھولا۔

''رضیہ، یہ میرے دوست اقبال ہیں جو کہ بھوک ہڑتال پر بیٹھے ہیں۔ ان کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ انہیں آرام کرنا ہے۔ تم ان کی دیکھ بھال کرو۔ تب تک میں ہڑتال والی جگہ جا کر مزدوروں سے آگے کے پروگرام کے متعلق مشورہ کرتا ہوں۔''

رضیہ نے سہارا دے کر اقبال کو چارپائی پر لٹایا۔ دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے مل گئے۔ محبت کی کونپل پھوٹی۔ رضیہ شرما گئی۔ اقبال کے دل میں بھی کچھ ہوا۔ رضیہ اس کا سر دبانے لگی۔ اقبال اس کی نگاہوں اور اس کی خوبصورتی میں گم ہو گیا۔ نگاہوں اور دلوں نے کتنے ہی وعدے ارادے کیے۔

''رضیہ تمہارے ہاتھوں میں جادو ہے۔ میرا سر درد کم ہو گیا۔ چکر کا اثر بھی نہیں رہا۔''

''آپ سلامت رہیں۔آپ کی زندگی سارے مزدوروں کے لیے بڑی قیمتی ہے۔''

''اور تمہارے لیے'' اقبال نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔''

''اس کے لیے آپ کو بھائی جان سے بات کرنی پڑے گی۔ میں آپ کے لیے دودھ لے کر آتی ہوں۔''

وہ شرما کر کچھ گھبراہٹ کے ساتھ اٹھ گئی۔اقبال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

رقیہ اور گلنار تک یہ خبر پہنچ گئی کہ اقبال کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ دونوں بھاگتی ہوئیں ہڑتال کی جگہ پہنچیں۔وہاں محمود سے ملاقات ہوئی۔

''بیٹا، اقبال کہاں ہے۔کیسا ہے؟''

''آپ فکر نہ کریں امی، وہ میرے گھر پر ہے اور اس کی طبیعت ٹھیک ہے۔ چلئے میں آپ کو لے چلتا ہوں۔''

راستہ اونچا نیچا تھا۔یکا یک گلنار کا پیر پھسلا۔ وہ گرنے والی تھی کہ محمود نے اسے اپنی بانہوں کا سہارا دیا۔گلنار تو سنبھل گئی لیکن دل بے قابو ہوگیا۔دو جوان جسموں کے لمس نے دونوں کے دلوں میں محبت کی چنگاری پیدا کردی۔

''سنبھل کر بیٹی۔''

''جی.....جی امی۔''

''ارے امی، آپ..... یہاں'' اقبال نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔محمود باہر چلا گیا۔

''لیٹے رہو بیٹا، کیسی طبیعت ہے۔''

''ٹھیک ہوں امی۔گلنار بہن ان سے ملو یہ رضیہ ہے۔محمود کی بہن۔''

دونوں گلے ملیں۔گلنار نے رضیہ کے کاموں میں ہاتھ بٹایا۔رضیہ کھانا بنانے لگی تو گلنار نے پورے گھر کی صفائی کرڈالی۔جس سے جھونپڑا چمک اٹھا۔رضیہ نے آواز لگائی کہ کھانا تیار ہوگیا ہے۔

''بہن ذرا محمود کو بلا لاؤ۔سب ساتھ مل کر کھانا کھالو۔میں تو ہڑتال پر ہوں۔کم سے کم

آپ لوگوں کو کھاتے ہوئے دیکھ کر ہی تسلی کرلوں گا۔'' اقبال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بھائی جان، آپ کو بلا رہے ہیں کھانے کے لیے۔''

''آپ لوگ کھا لیجئے، میں یہاں مزدوروں میں تھوڑی دیر بیٹھوں گا۔شام کو آؤں گا۔''

گلنار کھڑی رہی۔

''آپ جایئے اور کھانا کھا لیجیے۔'' محمود نے بڑے پیار سے کہا۔گلنار کے منہ سے یکا یک نکل پڑا۔

''آپ کے بغیر مجھ سے کیسے کھایا جائے گا۔''

دل کی بات کو دل نے محسوس کیا۔محمود نے کہا:۔

''اچھا چلئے، راستے میں گلنار نے دوبارہ ڈگمگانے کے ڈر سے محمود کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس طرح چلنے لگی جیسے زندگی بھر کا سہارا مانگ رہی ہو۔گھر کے پاس دونوں الگ ہوگئے۔محمود جب گھر کے اندر آیا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

''ارے واہ۔یہ اپنا ہی گھر ہے۔رضیہ تم نے کیا صفائی کی ہے، بالکل چمک گیا ہے۔''

''بھائی جان، یہ میں نے نہیں گلنار نے کیا ہے۔میں تو کھانا بنا رہی تھی۔ چلئے سب لوگ کھانا کھاتے ہیں۔''

کھانے کے بعد گلنار زبردستی جوٹھے برتنوں کو دھونے بیٹھ گئی۔رضیہ نے منع کیا تو بولی:۔

''میرا ہی تو گھر ہے'' رضیہ مسکرائی۔محمود نے بھی سنا اور اپنی قسمت پر ناز کرنے لگا۔

''امی، اب میں خود کو بہتر محسوس کر رہا ہوں۔میں ہڑتال کی جگہ پر مزدوروں کے پاس جاتا ہوں۔محمود! تم امی اور گلنار بہن کو گھر چھوڑ کر وہیں آجاؤ۔''

''ٹھیک ہے لیکن تم اکیلے مت جاؤ۔رضیہ! اقبال کو سہارا دے کر کمپنی باغ ہڑتال والی جگہ تک لے جاؤ۔''

راستے میں امی ذرا پیچھے رہ گئیں تو محمود نے گلنار سے کہا:۔

''آپ نے صفائی کر کے میرے گھر کو بالکل چمکا دیا۔''

''آپ کو پسند آیا۔''

''اتنا پسند آیا کہ جی چاہتا ہے ان صفائی کرنے والے ہاتھوں اور اس چاند سے چہرے کو چوم لوں۔ اسے اپنے گھر میں رکھ لوں اور زندگی بھر اپنے سے جدا نہ کروں۔''

''اس کے لیے آپ کو امی سے بات کرنی پڑے گی۔''

(۳۲)

بھوک ہڑتال کے بعد بھی مالک کی طرف سے کوئی بات چیت نہ ہونے سے مزدور مشتعل ہو اٹھے۔ انہوں نے سیٹھ کی حویلی تک جلوس نکالنے کا ارادہ کیا۔ آناً فاناً ۱۵۰۰ سے زائد مزدوروں کا جلوس تیار ہوا اور حویلی تک آپہنچا۔

''سیٹھ مردہ باد۔ مزدوروں پر ظلم بند کرو۔ ہمیں ہمارا حق دو۔ انقلاب زندہ باد۔''

اندر سے کوئی آواز نہ آنے پر مزدوروں کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا۔ ایک مزدور نے آواز لگائی:۔

''ظلم کی حد ہوتی ہے۔ اگر سیٹھ یہی چاہتا ہے کہ ہم لوگ بھوکے مر جائیں تو ٹھیک ہے، ہم بھی سیٹھ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ چلو بھائیو سیٹھ کی حویلی میں آگ لگا دو اور سیٹھ کو زندہ جلا دو۔ وہ بھی دیکھ لے کہ جب مزدور بغاوت پر آتا ہے تو سرمایہ دار کا کیا انجام ہوتا ہے۔''

منشی دوڑتا ہوا آیا۔ امین اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

''صاحب.... صاحب.... فوراً یہاں سے بھاگ جایئے۔ مزدوروں کے دلوں میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس آگ کو اب کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ حویلی میں آگ لگا رہے ہیں۔ آپ فوراً یہاں سے فرار ہو جایئے ورنہ اگر وہ آپ کو دیکھ لیں گے تو پکڑ کر زندہ جلا دیں گے۔''

امین کے ہوش اڑ گئے۔ یہ کیا ہو گیا۔ یہ اس کے تصور میں بھی نہ تھا۔ وہ بدحواس پیچھے کے دروازے سے نکل بھاگا۔ حویلی میں آگ لگا دی گئی۔

امین بھاگتا بھاگتا اقبال کے دروازے تک پہنچ گیا۔ اب اس میں اور بھاگنے کی سکت نہ تھی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے گلنار نے دروازہ کھولا۔

''تم۔'' گلنار کو وہاں دیکھ امین بھی حیران تھا لیکن یہ وقت حیران ہونے کا نہیں تھا۔

"گلنار، مجھے بچالو۔"

"تمہیں بچالوں، جس نے میرے بھائی کی زندگی کو اجیرن بنادیا۔ تو انسان نہیں درندہ ہے جو غریبوں کا لہو پیتا ہے۔ میں ابھی تیرا انتظام کرتی ہوں۔ تو نے میرے بھائی اقبال اور مزدوروں کو بھو........"

گلنار نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ امین نے اس کے منہ پر کس کر ہاتھ رکھ دیا۔ گلنار تڑپنے لگی لیکن امین نے ہاتھ نہیں ہٹایا۔ گلنار بے ہوش ہوگئی۔ امین نے اس کو آہستہ سے دیوار سے لگایا ہی تھا کہ اس کے ہاتھ میں گلنار کے گلے کا لاکٹ آ گیا۔ امین اسے غور سے دیکھنے لگا۔

"یہ تو ویسا ہی لاکٹ ہے جیسا میں نے اپنے بیٹے کے گلے میں ڈالا تھا اور بعد میں شبنم نے ویسا ہی بیٹی اور چھوٹے بچے کو بھی پہنا دیا تھا۔" پھر اسے منی بائی کی باتیں بھی یاد آ گئیں۔

اس کا مطلب گلنار میری بیٹی اور اقبال میرا بیٹا ہے۔ اف.....خدایا.....اسے اپنے گناہ یاد آنے لگے۔ اس نے خود کو سنبھالا اور وہاں سے تیزی سے نکل گیا۔

وکیل کے دروازے پر دیر رات دستک ہوئی۔ وکیل نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا۔

"ارے امین صاحب.....اس وقت۔"

"ہاں وکیل صاحب معاف کیجیے۔ اتنی رات کو آپ کو تکلیف دی۔ دراصل میں ایک وصیت کرنا چاہتا ہوں۔"

"اتنی رات کو ایسی کیا ضرورت پڑ گئی۔"

"میں ابھی ابھی شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ تھوڑا آرام کروں گا۔"

"اچھا بولئے، کیا وصیت کرنا چاہتے ہیں۔"

"میں اپنی ساری جائداد آدھی آدھی اقبال اور گلنار کے نام کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ اقبال تو وہی ہے نا جو آپ کے خلاف بھوک ہڑتال پر بیٹھا ہے اور یہ گلنار کون ہے؟"

"ہاں اقبال وہی ہے اور گلنار میری......میرا مطلب ہے اس کی بہن ہے۔"

وصیت پر دستخط کرنے کے بعد امین بے نام، بے سمت منزل کی جانب چل پڑا۔ اس کا

ضمیر پھر اسے ملامت کر رہا تھا اور اب اس میں ضمیر کو سلا دینے یا دھوکہ دینے کی قوت باقی نہیں رہی تھی۔

(۴۳)

حویلی میں جیسے ہی آگ لگائی گئی، اسی وقت پولیس اور آگ بجھانے والا عملہ پہنچ گیا اور آگ پر فوراً قابو پالیا گیا۔ معمولی سا نقصان ہوا۔ اقبال اور محمود چیخ چیخ کر مزدوروں کو روک رہے تھے کہ اس طرح مسئلہ حل نہیں ہوگا لیکن مزدور اس قدر مشتعل تھے کہ ان کی چیخوں پر بھی توجہ نہ کی آخر کار پولیس کارروائی سے معاملہ قابو میں آ گیا۔ امین کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پولیس افسر نے کہا:۔

"مسٹر اقبال، آپ فکر نہ کیجیے۔ آپ لوگوں کے ساتھ پورا انصاف کیا جائے گا۔ دراصل ایک سرکاری افسر رشوت لے کر سرکار کو غلط رپورٹیں دے رہا تھا۔ وہ گرفتار کر لیا گیا ہے اور جیل میں ہے۔ اس کی گواہی پر ہی ہم امین سیٹھ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔"

"جناب میرا کبھی ارادہ نہ تھا کہ ہمارے سیٹھ کو کوئی نقصان پہنچے۔ ہم تو صرف اتنا چاہتے تھے کہ ہمیں ہمارا حق مل جائے۔ یہ سب جو کچھ بھی ہوا، حالات کی مجبوری کے تحت ہوا۔ آخر بھوکے ننگے لوگ کب تک ضبط کرتے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، جب پیٹ میں آگ لگی ہو اور کوئی راستہ نہ سوجھ رہا ہو تو پتھر سے پتھر دل ضبط کا بند توڑ دیتا ہے۔ یہ تو فطرت ہے۔ آپ پر اور آپ کے مزدور بھائیوں پر کوئی مقدمہ دائر نہیں ہوگا۔ آپ بے فکر رہیں۔ بس انہیں کہیں کہ جیسے اتنا صبر کیا ہے۔ ویسے کچھ دن اور...... اگر امین سیٹھ فرار بھی ہو گیا تو اس کی جائداد بکوا کر سرکار آپ لوگوں کا حق آپ کو دے گی۔"

اتنے میں وکیل وہاں آ گیا اور اس نے اقبال کو وصیت دیتے ہوئے رات کا سارا واقعہ کہہ سنایا۔

"اب آپ اور آپ کی بہن گلنار اس ساری جائداد کے آدھے آدھے مالک ہیں۔"

اقبال کچھ سوچتا رہا۔ پھر مزدوروں کو اکٹھا کر کے ان سے مخاطب ہوا۔

"دیکھا ساتھیو! جب انسان کا ضمیر جاگتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔ ہم شاید اپنے سیٹھ کو نہیں

سمجھ سکے۔ وہ جب بھی واپس آئیں گے ہم سب ان سے معافی مانگیں گے اور ان کی جائداد انہیں واپس کریں گے۔"

"لیکن تب تک تو آپ ہی مالک ہیں۔ جب تک سیٹھ واپس نہیں آجاتے آپ ان کی جگہ حویلی میں رہ کر ان کا کاروبار چلائیں۔" محمود کے اس مشورے پر سب نے اثبات میں سر ہلایا۔

رقیہ، اقبال اور گلنار حویلی میں آگئے۔ اگلے دن محمود اپنی بہن رضیہ کے ساتھ ان سے ملنے آیا۔

"ارے آؤ بیٹے محمود، بیٹی رضیہ۔ ارے اقبال، گلنار، دیکھو تو کون آیا ہے۔"

اقبال اور گلنار نے محمود اور رضیہ کو دیکھا تو دونوں کے دل کھل اٹھے۔ اقبال اور محمود اور رضیہ اور گلنار ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔ سارا دن سب ایک ساتھ رہے۔ لیکن اقبال اور رضیہ اور گلنار اور محمود زیادہ سے زیادہ تنہائی کی تلاش میں رہے اور وقت ملتے ہی ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ ساتھ جینے مرنے کے وعدہ ہونے لگتے۔ بوڑھی رقیہ کی آنکھوں نے بھی سب کچھ دیکھ لیا اور سارا معاملہ بھانپ لیا۔ جب رات کو سب کھانے پر اکٹھا تھے تو رقیہ نے بات چھیڑی:۔

"بیٹا میں چاہتی ہوں کہ اب جبکہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے تو تمہاری اور گلنار کی شادی کر دی جائے۔"

اقبال نے کہا:۔

"ارے امی....."

"نہیں بیٹا، اب میں تمہاری ایک بھی نہیں سنوں گی۔"

"لیکن امی..... گلنار میری بڑی بہن ہے۔ پہلے اس کی شادی کر لوں اس کے بعد اپنی شادی۔"

"کیوں نہ دونوں کی شادی ایک ساتھ ہو جائے۔"

"کیسے۔"

"تمہاری رضیہ سے اور گلنار کی محمود سے۔ کیوں گلنار، رضیہ، محمود میں ٹھیک کہہ رہی

ہوں نا۔"

سب حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور پھر ایک ساتھ امی سے لپٹ گئے۔
اقبال کی شادی رضیہ سے اور گلنار کی شادی محمود سے ہوگئی۔

(۴۴)

ڈاکٹر عتیق اپنے اسپتال جو کہ جادونگر میں تھا، کے لیے نکلا ہی تھا کہ راستے میں ایک ضعیف العمر شخص بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر اپنی کار رکوائی اور ساتھ اسپتال لایا۔

"نرس لگتا ہے کہ یہ کمزوری سے بے ہوش ہو گئے ہیں۔ ان کو دیکھو۔"

شام کو ڈاکٹر عتیق بوڑھے شخص سے ملنے گیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے، بابا۔"

"ٹھیک ہوں بیٹا۔ میں یہاں کیسے آیا۔ میں تو شاید سڑک پر بے ہوش......"

"جی ہاں۔ میں آپ کو یہاں لایا ہوں۔ اب آپ اپنے گھر کا پتہ دیجیے تو میں آپ کو وہاں بھجوادوں۔"

"میرا کوئی نہیں ہے، بیٹا۔"

"اچھا تو پھر اس بڑھاپے میں آپ کہاں جائیں گے۔ یہیں رہ جایئے۔ یہ ایک خیراتی اسپتال ہے، یہاں مریضوں کی خدمت کیجیے۔ آپ کو ثواب بھی ملے گا اور یہاں آرام سے رہ بھی سکتے ہیں۔"

امین نے سوچا کہ یہی اس کے گناہوں کا ازالہ ہوسکتا ہے کہ وہ ان جیسے غریبوں، مظلوموں اور بے سہاروں کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کردے جن کا اس نے خون چوس چوس کر کے اتنی بڑی جائداد بنالی تھی۔

"ٹھیک ہے بیٹا، جیسی تمہاری مرضی۔ جو خدا کی مرضی۔"

وہ بوڑھا شخص دن رات مریضوں کی خدمت میں جٹ گیا۔ ایک دن ڈاکٹر نے اس سے کہا:۔

''بابا۔آپ اس قدر جنون سے ان مریضوں کی خدمت میں لگ گئے ہیں گویا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو آپ کو بہت ثواب کمانے کی جلدی ہے یا پھر اپنے گزشتہ گناہوں کا ازالہ کرر ہے ہیں۔''

''دونوں ہی باتیں ہیں، بیٹا۔''

ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔''معاف کرنا بابا، میں تو یوں ہی آپ سے دگلی کرر ہا تھا۔''

بہت دنوں بعد بوڑھے کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔اسی وقت ایک نرس ڈاکٹر کے پاس آئی:۔

''سر کوئی بھی اسٹاف ممبر ہمارے ساتھ چلنے کے لیے راضی نہیں ہے۔''

''لیکن تم نے بتایا نہ کہ ماسک پہن لینے سے ہیضہ کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''بتایا لیکن پھر بھی سب خوفزدہ ہیں۔''

''اوہو......یہ تو بہت برا ہوا۔اگر ایک اسٹاف ممبر بھی جانے کو راضی ہوتا تو ہم تین بھی اس گاؤں میں پہنچ کر بہت کچھ کر سکتے تھے۔''

''کیا بات ہے بیٹا.....گاؤں......ہیضہ.....''

''کچھ نہیں بابا۔یہاں سے ۴۰ کیلومیٹر دور ایک گاؤں میں ہیضہ پھیلا ہے۔میں نے اسٹاف سے کہا کہ ماسک پہن کر چلیں، کوئی خطرہ نہیں ہوگا اور مریضوں کی خدمت بھی ہو جائے گی لیکن......''

''میں چلتا ہوں، بیٹا۔''

''بابا، آپ بوڑھے ہیں۔وہاں دوڑ دھوپ والا کام ہے۔میں چاہتا تھا کہ کوئی نوجوان....آپ رہنے دیں میں کچھ......''

''کیا بات کرتے ہو، بیٹا۔ابھی تم نے جنون کی بات کی۔کیا تم بھول گئے کہ خدمت کا جنون مجھ سے وہ کام بھی کرا سکتا ہے جو کہ جوان بھی نہیں کر سکتے۔''

''بابا زندہ باد۔نرس چلنے کی تیاری کرو۔''

(۳۵)

کافی دن ہو گئے لیکن امین سیٹھ لوٹ کر نہیں آئے۔ اقبال کو بڑی فکر ہوئی۔ اس نے امی، گلنار، رضیہ اور محمود سے مشورہ کیا۔ سب کی رائے تھی کہ اب اخبار میں اشتہار دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ اس لیے اخبار میں گمشدگی اور گھر واپس چلے آنے کا اشتہار دے دیا گیا۔

بوڑھے نے گاؤں جا کر ہیضہ کے مریضوں کی وہ خدمت کی کہ ڈاکٹر عتیق حیرت زدہ رہ گیا۔ بوڑھا خود میں ایک تنظیم تھا اور جس طرح وہ خدمت کا کام انجام دے رہا تھا، وہ نوجوانوں کی ایک پوری تنظیم کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے کام میں اس قدر کھو جاتا کہ اس کی ماسک لگانے اور نہ لگانے پر بھی توجہ نہیں رہتی۔ ڈاکٹر عتیق نے کئی بار اس سے کہا:۔

''بابا۔ ماسک لگانے کا خیال رکھا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان بیماروں کو ٹھیک کرتے ہوئے تم خود اس بیماری کی زد میں آ جاؤ۔ خود کو بچانے کا خیال رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔''

لیکن بوڑھے کو ہوش کہاں تھا۔ آخر کار وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ پورا گاؤں تو ہیضے کی زد سے بچا لیا گیا لیکن بوڑھا اس کی شدید زد میں آ گیا۔ اسے اسپتال میں داخل کیا گیا۔

ڈاکٹر عتیق گھر پر صبح صبح اخبار دیکھ رہا تھا کہ یکا یک اس کی نظر اخبار کے اشتہار پر پڑی جس پر بوڑھے بابا کی تصویر بھی لگی تھی۔

''ہمارے امین سیٹھ صاحب۔ آپ کہاں ہیں۔ مہربانی کر کے واپس آ جایئے اور اپنا کاروبار اور جائداد سنبھالیئے۔ ہمیں معاف کر دیجیے۔ ہم نے آپ کو غلط سمجھا اور اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ آپ سے کوئی گناہ ہوا تو یہ خیال اپنے دل سے نکال دیجیے۔ آپ کو یہاں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ سب آپ سے معافی کے طلب گار اور آپ کے منتظر ہیں۔''

منیجر

اقبال

ڈاکٹر عتیق غور و فکر میں ڈوب گیا۔ اتنا بڑا آدمی جو مجھ جیسی حیثیت والے سینکڑوں کو خرید سکتا ہے۔ میرا ملازم بنا ہوا ہے۔ آج اس سے پوچھتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔

(۳۶)

''بابا، کیسی طبیعت ہے۔''

''لگتا ہے جانے کا وقت آ گیا ہے، بیٹا۔''

''بابا، آپ مجھے اپنا بیٹا کہتے ہی ہیں یا واقعی بیٹا مانتے بھی ہیں۔''

''کیا کہتے ہو بیٹا۔ جب میں بے ہوش پڑا زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا، زندگی بے مقصد، بے معنی ہو گئی تھی، تو تم نے مجھے بچایا۔ زندگی کا ایک عظیم مقصد دیا جس سے مجھے اپنے پچھلے گناہوں کی کچھ حد تک تلافی کا موقع نصیب ہوا.....'' بوڑھا جذبات کی رو میں بہہ گیا۔

''دیکھو بابا، اپنے بیٹے سے جھوٹ نہیں بولنا۔ میں کچھ حد تک جان گیا ہوں کہ آپ کون ہیں۔ آپ سمندر نگر کے سب سے بڑے رئیس امین سیٹھ ہیں جو اس ملک کے سب سے بڑے کپڑے کے کارخانے کے مالک ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آپ کی اتنی جائدادیں ہیں کہ نسلوں کی نسلیں بیٹھ کر کھائیں تو بھی ختم ہونے میں عرصہ لگ جائے۔ میں پوری بات جاننا چاہتا ہوں۔ شروع سے آخر تک۔ آپ کو خدا کا واسطہ۔ بیٹا کہا ہے تو اپنے بیٹے سے جھوٹ نہیں بولنا۔''

امین مجبور ہو گیا۔ اس نے اول تا آخر سارا واقعہ کہہ سنایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''بیٹا میں بہت بڑا گنہگار ہوں۔ اپنی بیوی بچوں کا، مزدوروں کا.....سب کا۔''

''نہیں بابا۔ آپ اب گنہگار نہیں رہے۔ آپ کی خدمتِ خلق نے آپ کے سارے گناہوں کا ازالہ کر دیا۔ پوری امید ہے کہ خدا بھی آپ کو معاف کر دے گا۔ کیونکہ آپ کے بچوں اور مزدوروں نے آپ کو معاف کر دیا ہے۔ یہ دیکھئے۔'' اخبار سے اشتہار والا صفحہ کھول کر اس نے امین کے آگے رکھ دیا۔

''خدا تیرا شکر ہے۔ لیکن بیٹا میں یہاں سے سیدھا اب مالکِ حقیقی کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ اب میں گھر بار، دھن دولت کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ بس یہیں مریضوں کی خدمت کرتے ہوئے مر جانا چاہتا ہوں۔''

''جیسی آپ کی مرضی بابا لیکن آپ کے بچوں کو اطلاع تو دے دوں کہ آپ یہاں ہیں۔''

''بیٹا پھر شاید میں بچوں کی محبت میں پھنس کر اس عظیم مقصد کو چھوڑ بیٹھوں۔ میرا ضمیر بڑا لچکدار ہے۔ زندہ، مردہ ہوتا رہتا ہے۔ تم بچوں کو اطلاع دے کر مجھے اس عظیم مقصد سے دور مت کرو۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ بچوں کو نہیں لیکن منیجر کو تو اس کے مالک کی اطلاع دے سکتا ہوں۔ ان کو پتہ نہیں چلے گا کہ وہ آپ کے بچے ہیں۔ آپ ان سے مل کر دل کو ٹھنڈا بھی کر لیجیے گا اور ان سے کہہ بھی دیجیے گا کہ آپ یہیں رہنا چاہتے ہیں۔ کاروبار وہ سنبھالیں اور یہاں آتے جاتے رہیں۔ اس طرح آپ کا دل بھی ٹھنڈا رہے گا اور آپ کا عظیم مقصد بھی پورا ہوتا رہے گا۔''

''ٹھیک ہے بیٹا۔''

(۳۷)

''منیجر صاحب.....'' منشی دوڑتا ہوا آیا۔ ''مالک کی خبر مل گئی۔ جادونگر کے ایک اسپتال سے تار آیا ہے۔''

''جلدی دکھاؤ۔''

تار پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھیں خوشی سے نم ہوئی جا رہی تھیں لیکن آخری سطر نے اس کے خوشی کے آنسوؤں کو غم کے آنسوؤں میں تبدیل کر دیا۔

''ان پر ہیضہ کا شدید اثر ہے۔ جتنی جلد ممکن ہو آجایئے۔''

رقیہ، گلنار، رضیہ اور محمود کو ساتھ لے کر اقبال اسی وقت جادونگر کے لیے روانہ ہو گیا۔

اسپتال پہنچ کر نرس سے دریافت کیا۔

''امین سیٹھ کس نمبر کے کمرے میں ہیں۔''

''کمرہ نمبر ۱۰ میں لیکن......''

نرس کے جملے کو ادھورا چھوڑتے ہوئے اقبال بھاگتا ہوا امین کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں سناٹا تھا۔ امین مالکِ حقیقی سے جا ملے تھے۔ ڈاکٹر عتیق خاموش کھڑا تھا۔ اس نے اقبال سے کہا:۔

''آپ نے آنے میں تھوڑی دیر کر دی۔''

رقیہ، گلنار، رضیہ، محمود بھی اندر آ گئے اور بے تحاشہ رونے لگے۔

اقبال نے خوب رو کر دل ہلکا کرنے کے بعد ڈاکٹر سے کہا:۔

''ڈاکٹر یہ ہمارے مالک ہیں۔ان کا کوئی وارث نہیں ہے۔کیا ہم ان کے جسدِ خاکی کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔''

''بالکل لے جا سکتے ہیں جناب اور چونکہ یہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور حقیقت کو اب کھل بھی جانا چاہیئے تو میں آپ کو بتا دوں کہ ان کے وارث بھی موجود ہیں۔ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔''

''کیا..... کہاں ہیں۔ہم ان کے والد کی ساری جائداد انہیں سونپ دیں گے۔''

''آپ کو ان کی جائداد کسی کو سونپنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آپ ان کے بیٹے اور گلنار ان کی بیٹی ہے۔'' اور پھر ڈاکٹر نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔

اقبال اور گلنار زار و قطار رونے لگے۔روتے روتے اقبال نے امین کے سر سے چادر ہٹائی تو اسے یوں لگا جیسے کہ ان لوگوں کے طویل انتظار کے بعد ان کے والد کی آنکھیں بند ہوئیں ہوں۔چہرے پر عجیب دلکش سکون تھا۔اقبال کو یوں لگا جیسے اس کے والد کے مردہ چہرے کے نور سے پورا کمرہ روشن ہو گیا ہو۔

...........●●●...........

● ...... ترنم ریاض

مورتی

کلاسنگم کی پانچ منزلہ عمارت شہر کے عین درمیان بڑی شان سے ایستادہ تھی اور کئی دہائیوں سے فن کے دلدادہ اذہان کے تجسس کی تسکین کا سامان فراہم کر رہی تھی۔ سب سے نچلی منزل کے سامنے بڑا سا باغیچہ تھا جس میں لمبی لمبی قوسیہ سیڑھیاں گھنی ہری گھاس میں چھپی، مخمل سے ڈھکے زینے کی طرح نظر آتی تھیں۔ جب سامنے والے برآمدے کو تماشگاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تو یہ زینہ نشست گاہ کا کام دیتا تھا۔ اُس کے ٹھیک عقب میں داخلی پھاٹک کی بائیں جانب کے مستطیل احاطے کے ایک کونے میں پیپل کے ایک بڑے درخت کے موٹے سے تنے کے پاس لکڑی کی کُرسی پر فیصل خاموشی سے بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے پتھر کی میز تھی۔ وہ کبھی مجسموں کو دیکھنے آرہے تماشائیوں کو دیکھتا اور کبھی اُس کی نظریں قطار میں لگے مجسموں سے اُلجھ جاتیں۔

ٹوٹے ہوئے ایک پنکھ والی فاختہ کے مجسمے کی چونچ ٹوٹ گئی تھی اور آنکھ کی پتلی کی سیاہی غالباً بارش سے دھل گئی تھی۔ اُس کا ہاتھ بے اختیار قمیض کی اوپری جیب کی طرف چلا گیا۔ مگر اگلے ہی لمحے اُس نے وہاں سے ہاتھ ہٹالیا اور ہتھیلی پر چہرہ ٹکا کر دوسرے مجسمے کو دیکھنے لگا۔

فن شناس ہو...... کسی نے نہایت جاذب آواز میں شاید اُس سے کہا تھا۔ اُس نے چونک کر دائیں بائیں دیکھا پھر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کا اندرونی حصہ جوڑ کر اپنی ٹھڈی اُس پر ٹکادی اور کہیں دور دیکھنے لگا۔

کُرسی کے قریب کی پتھریلی دیوار پر لگے Laminated کاغذ پر ایک حسین لڑکی کی تصویر تھی۔ موتیوں کی دو لڑیوں ایسے دانتوں والا مسکراتا چہرہ۔ نازک گردن کے ساتھ گریبان پر آئی ہوئی چوٹی میں گندھے بال کہیں کہیں بکھر گئے تھے۔ سیاہ کُرتے کے نچلے بٹن کے قریب تصویر کے حاشیے کے نیچے انگریزی میں اُس کا نام اور تعارف درج تھا۔

پھر کب مسکرائیں گی آپ۔ فیصل نے ایک طویل سانس لے کر تصویر پر نظریں گاڑ دیں۔

تصویر سے ذرا دُور سامنے کے زاویئے سے بنا ہوا بائیں جانب دیکھ رہا چھاتی تک تراشا گیا ایک وجیہہ مرد کا مجسّمہ تھا...... بالکل مجھ جیسا لگ رہا ہے نا...... فیصل مجسّمے کے برابر کھڑا تھا...... نہیں فیصل مجسّمے کے برابر نہیں کھڑا تھا وہ پتّھر کی میز کے قریب بیٹھا ہاتھوں میں چہرہ لیے مجسّمے کو دیکھ رہا تھا۔

مرد کے مجسّمے کا کندھا ٹوٹ چکا تھا اور ٹوٹا ہوا کندھا باقی حصّے کے ساتھ لگا کر رکھا گیا تھا۔ جسم اور شانے کی درمیانی دراڑ واضح تھی۔ اُس کے قریب ایک گملے میں کیکٹس کا پودا تھا جس کی تازہ سیراب کی گئی مٹّی مہک رہی تھی۔ پاس ہی ایک اور مجسّمہ تھا، ہرن کے بچّے کا۔ اُس نے کان کھڑے کر کے چوکنے انداز میں اپنی ننھی سی تھوتھنی ذرا سی اوپر اٹھا رکھی تھی۔ اُس کا داہنا کان آدھا ٹوٹا ہوا تھا۔ اُس کے برابر چھوٹا سا ایک لڑکا کُتے کے ساتھ کھڑا تھا، ان دونوں کا مجسّمہ ایک گول پتّھر پر رکھا تھا۔ کُتے کی آدھی دم بھی ٹوٹ گئی تھی اور اُسی پتّھر پر پڑی ہوئی تھی۔ اُس کے بعد پتّھر کے ایک چوڑے دہانے والے گملے میں لیموں کا چھوٹا سا پیڑ اُگا تھا۔ اور اُس کی بھیگی ہوئی مٹّی سے سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی۔ گملے کے برابر دھونی رمائے سادھو کا مجسّمہ تھا جس کی نیم وا آنکھوں کے اوپر ابروؤں کے عین درمیان سے پیشانی تک جاتی ہوئی چار آڑھی لکیریں اُبھری ہوئی تھیں۔ فن کی یہ باریکی دیدنی تھی۔ سادھو کے سر کے اوپر تراشا گیا جوڑا ٹوٹ چکا تھا اور پدم آسن میں مُڑی ہوئی اُس کی ٹانگوں کے قریب گود میں پڑا تھا۔ اوپر پیپل کے درخت کی شاخوں میں چہک رہی چڑیاں میوے کُتر کُتر کر گرا رہی تھیں اور بہت سے ننھے گول گول میوے جوڑا ٹوٹنے سے خالی ہوئی جگہ میں جمع ہو چکے تھے۔ برابر میں رقّاصہ کا مجسّمہ تھا جس

کے ہوا میں اُٹھے ہوئے پاؤں کا پنجہ ٹوٹ گیا تھا۔ جانے پنجے کا ٹوٹا ہوا حصّہ کہاں تھا۔ اُس کے قریب زمین میں مدھومالتی کی بیل اُگی تھی جو دیوار کی طرف جھکتی ہوئی پیپل سے لپٹ گئی تھی اور اُس کے سرخ و گلابی پھولوں کی پتّیاں نیچے رکھے ماں اور بچّے کے مجسّمے پر گری ہوئی تھیں۔ بچّے کا مجسمہ جہاں ماں کے مجسّمے سے جڑتا تھا وہاں ایک بڑی سی دراڑ میں سے ڈھلتے سورج کی پیلی روشنی آر پار ہو رہی تھی، حالانکہ اُس کے ایک کونے کے نیچے مجسّمے کا توازن برقرار رکھنے کے لیے ایک اینٹ بھی رکھی گئی تھی۔

فیصل نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر اینٹ کو ذرا سا باہر کی طرف سرکایا اور کچھ ٹیڑھا کر کے رکھا مگر دراڑوں کی توُں قائم رہی۔

"کیا یہ Transportation میں ٹوٹ گئے ہیں؟" ایک شخص نے فیصل سے سوال کیا تو فیصل نے اُسے چونک کر دیکھا۔

"......ہاں......کچھ ایسا ہی......ہوا ہے۔" وہ کچھ پل اُسے دیکھتا رہا پھر باقی لوگوں کو، جو اُسے بات کرتا دیکھ کر اُس کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے۔

"ایسے......شاہکار......اور......اور یہ لاپرواہی۔" کھادی کا کُرتا پہنے ایک نوجوان نے دُکھ سے کہا۔

"تقریباً ہر مجسّمے کا کوئی نہ کوئی حصّہ ٹوٹ......" اُس نے مزید کہا تو فیصل نے اُنگلی سے کپڑے کے بڑے سے بینر کی طرف اشارہ کیا جو ایک طرف سے پیپل کی ایک شاخ سے بندھا تھا اور دوسری طرف کی ڈوری آرٹ گیلری کے لمبے سے گول ستون کے ساتھ لپیٹی گئی تھی۔ اس پر بڑے بڑے حروف میں ایک عبارت درج تھی:

"ٹوٹے ہوئے ستارے"

"اوہ......I am sorry" نوجوان آگے بڑھ گیا۔

"یہ ستم......کیسے ہوا......" جینز پہنے ایک لڑکی نے تصویر کھینچی۔ فیصل کچھ نہیں بولا۔

سب مر گئے فیصل......اُس نے ابھی ابھی کسی کو کہتے سنا تھا۔

......☆☆......

ایک عمر رسیدہ خاتون پتّھر کی میز کے قریب دیوار پر لگی تصویر کے ساتھ لکھی عبارت پڑھ کر مجسّموں کو دوبارہ دیکھ رہی تھی۔ فیصل کو بات کرتے سنا تو قریب آ گئی۔ فیصل کو اُس کی نظروں سے اُس کے سوال کا اندازہ ہو گیا تھا۔

آج نمائش کا پہلا دن تھا۔صبح سے وہ ایسے سوالات کا کئی بار جواب دے چکا تھا اور جھوٹ بولتے ہوئے اور زیادہ رنجیدہ ہو جانے کے ڈر سے وہاں سے ہٹ کر وہ دوسری طرف نکلنے ہی والا تھا کہ صحافیوں کے ایک قافلے نے اُسے گھیر لیا۔

''آ گئیں...... کیا میڈم......؟'' کسی نے پوچھا۔

''جی نہیں ......شاید کہیں مصروف ہو گئی ہیں...... ورنہ اب تک تو...... آ جانا چاہئے تھا اُن کو......'' وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''آئیں گی نا......اصل میں ہم آج کسی بھی طرح اُنہیں انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ آپ پلیز ہماری Help کیجئے۔'' دوسرا بولا۔

''جی ہاں......میں خود بھی انہی کا انتظار کر رہا ہوں...... آئیں گی تو آپ کو Inform کردوں گا......آپ سب کے کارڈس تو میرے پاس ہیں ہی۔''

''کیا صبح وہ یہاں ہوں گی......؟'' تیسرے نے پوچھا۔

''اُمید تو ہے'' فیصل بولا۔ ''Excuse Me.''

وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

شام ڈھل رہی تھی۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھا رہے تھے۔ واپس ڈرائیو کرتے ہوئے وہ پتّھر کے بُت کی طرح خاموش تھا۔ بارش کے قطرے وِنڈسکرین پر پڑے تو اُس نے وائپر کا بٹن دبا دیا۔

...... یہ Pre-monsoons ہیں...... کسی نے چپکے سے کہا تھا۔ اُس نے گاڑی کی رفتار دھیمی کر دی اور پھر گاڑی سڑک کے کنارے پارک کر کے برستی ہوئی بارش کو نظر بھر کر دیکھا اور آنکھیں موند کر سٹیئرنگ پر سر ٹکا دیا۔

جانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔ اندھیرا گہرا گیا تھا۔ وہ کہیں اور نہ جا کر گھر کے راستے پر ہولیا۔ کئی کئی خیالات نے اُسے گھیر رکھا تھا۔

کیا جواب دے گا وہ کل...... اُس نے تو جانے کس کس غم کا مداوا کرنے کی تلاش میں Exhibition کی تھی۔ لوگوں کے اتنے سوالات...... اُس نے تو یہ سب سوچا بھی نہ تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ کسی طرح وہ ملیحہ کو گھر سے لے آنے میں کامیاب ہو جائے گا اور مجسّموں کی نمائش دیکھ کر وہ...... شاید...... شاید۔

گھر پہنچ کر بھی وہ سوچوں میں گم رہا یہاں تک کہ رات اُتر آئی۔

اگلی صبح وہ جلدی تیّار ہونے لگا۔ اُسے نمائش گاہ کے کھلنے سے پہلے وہاں موجود رہنا تھا اور وہ پہلے ملیحہ کے پاس جانا چاہتا تھا...... کاش آج وہ اُس کے ساتھ Exhibition دیکھنے آ جائے اور مجسّموں کو دیکھ کر شاید...... وہ...... مگر ٹوٹے ہوئے مجسّموں کو دیکھ کر کہیں...... کہیں......

ملیحہ کے پاس پہنچا تو وہ سو رہی تھی...... گہری نیند۔

کتنا وقت ضایع کر دیا آپ نے سو کر...... جاگ جایئے...... کچھ بات کیجئے......

فیصل اُس کی پائنتی کھڑا مسلسل اُسے دیکھتا رہا۔

اور کتنی دیر خاموش رہیں گی آپ...... آواز سننا ہے مجھے آپ کی...... کچھ بولیے نا......

فیصل کی آنکھیں بھر آئیں تو وہ پلٹ آیا۔ یہ...... کیا ہوا جا رہا ہے......

یہ کیوں ہو رہا ہے...... یہ کب تک ہوگا۔ وہ بے چارگی سے سوچنے لگا۔

پہلے تو ایسا نہ تھا۔

......☆☆......

''جی میں فیصل بول رہا ہوں۔'' ایک نہایت خوبصورت آواز میں ہیلو کے جواب میں ایک غیر مانوس نام سنائی دیا۔

''معاف کیجئے گا، میں نے پہچانا نہیں آپ کو۔'' وہ نرمی سے بولی۔

''جی میں۔ اصل میں آپ لوگ مجھے جانتے بھی نہیں۔ میں ابھی حال ہی میں دلّی آیا

ہوں۔ بڑی مشکلوں سے ڈائریکٹری میں کوئی ایک سو پچاس اکبر علی صاحبان کے رانگ نمبر ملا کر یہ آخری نمبر ملایا ہے۔ جو یقیناً مجھے سب سے پہلے ملانا چاہیئے تھا۔" فون پر ایک دبی دبی مختصر سی سُریلی ہنسی فیصل کی سماعت کو چھوگئی۔

"مگر میرے خیال میں یہ بھی رانگ نمبر......" وہ بولی۔

"جی نہیں، بالکل نہیں...... یہ نہیں ہوسکتا۔ آپ میری بات سنیئے۔ میں فیصل ہوں ظہیرالدین کا چھوٹا بھائی۔ عافیہ بیگم کا چھوٹا سا دیور......" وہ بڑے اعتماد سے ہنسا۔ مگر دوسری طرف خاموشی چھائی رہی۔

"دیکھیئے محترمہ، میری عافیہ بھابی اور آپ کی امّی بچپن سے یونیورسٹی تک ساتھ پڑھی ہیں۔ ایک دوسرے کی بڑی گہری دوست رہی ہیں...... شادیاں وادیاں کر کے کوئی بیس ایک برس سے بچھڑ گئی ہیں...... ہم لوگ مسقط میں......"

"اوہ...... اچھا...... کیسے ہیں سب لوگ......؟" کچھ لمحے خاموش رہ کر وہ خوشدلی سے بولی۔

"عافیہ بھابی نے آپ کو Rediscover کرنے کو کہا تھا اور فوراً آپ سب کی خیریت سے انھیں بذریعہ فون آگاہ کرنے کو کہا تھا...... مگر یہاں سب کچھ Set کرنے میں کچھ وقت لگ گیا...... ایک برانچ یہاں بھی کھولنا ہے...... اور میں دن رات......"

"آپ گھر تشریف لایئے...... نا...... جب بھی وقت ملے تو......"

"شام کو حاضر ہوتا ہوں...... چھ بجے کے آس پاس؟...... ٹھیک رہے گا؟"

"بالکل ٹھیک رہے گا۔"

فیصل نے فون رکھا تو مسکرا رہا تھا۔

اُف اتنی پیاری آواز...... الگ سی...... باریک نہ بھاری۔ جیسے دو آوازیں ہوں...... نہیں...... جیسے بات کرتے وقت آواز ایک لمحے کے دسویں، نہیں، بیسویں حصّے میں اچانک مہین ہو کر گھنگھرو کی طرح بج اُٹھے اور پھر...... پہلے کی طرح میٹھی میٹھی سی ہو کر ویسی ہی پُر وقار

ہو کر......یعنی کہ......حد ہے......ایک آواز تک کی Quality کو میں Describe نہیں کرسکتا......اور پھر......اگر آواز یہ ہے تو چہرہ کیا ہوگا......کتنا بیوقوف ہو گیا ہوں......ظاہر ہے کہ اپنی ماں جیسا ہی ہوگا۔

اُس نے عجب سی بے چینی سے گھڑی دیکھی اور پھر ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اُس کے بعد ہلکے سے سر جھٹکا اور ذرا اونچی آواز میں ہنسا...... پاگل ہو گئے فیصل میاں۔ اُس نے اور اُونچی آواز میں کہا اور قمیض اُتار کر غسل خانے میں گھس گیا۔

''ملیحہ دنیا کی سب سے مکمل لڑکی تھی، میرے خیال سے......''

عافیہ نے کئی دفعہ گھر میں ذکر کیا تھا۔

''ہر ایک کی ہمدرد......خوش شکل......خوش گلو......خوش لباس اور......ایک اونچے کردار کی مالک......اور......ایک عظیم فن کارہ......اُس میں اتنی خوبیاں تھیں کہ میں ہر وقت اُس جیسا بننے کی کوشش کرتی رہتی۔'' عافیہ کے چہرے پر دوستانہ خلوص چھلکنے لگتا۔

''مگر مسلسل ناکام ہوتی رہیں۔'' ظہیر قہقہہ لگاتا۔ عافیہ ہلکے سے مسکرا دیتی۔

''اچھے کھاتے پیتے گھر کی تھی۔ مگر ایک دولت مند شخص نے پیغام دیا اور فوراً شادی کی شرط رکھی تو اُس کے بھائی اور بھابی نے رشتہ قبول کرلیا۔''

اُف...... جب دولہا میں نے دیکھا......تو اللہ کی وضع کی ہوئی تقدیر پر ایمان لانا پڑا۔ لڑکا پست قامت اور فربہ بدن بھی۔ گہرا سانولا رنگ، اور آواز بھی لڑکیوں ایسی......اونچی ایڑھی والا جوتا۔ ٹخنے تک اونچا جس کے اندر کی طرف بھی ایڑھی کا کچھ حصّہ ہوتا ہے......بیش قیمت لباس اور پارلر سے سیدھا نکل کر آنے والی سج دھج کے علاوہ ولایتی گاڑی بھی اُس میں کہیں سے کوئی جاذبیت پیدا نہ کرسکی تھی۔''

''ہوسکتا ہے اُس میں دوسری خوبیاں ہوں......اور پھر ملیحہ میں بھی تو کوئی نہ کوئی خامی رہی ہوگی......اللہ نے ہر انسان میں کوئی نہ کوئی......'' فیصل نے پوچھا تھا۔

''ہاں، وہ بہت دولت مند تھا......اور ملیحہ میں......ایک بہت بڑی خرابی تھی...... اُسے

غصہ اتنا بے تحاشہ آتا کہ...... بے قابو ہو جاتی۔ خود کو بھی نقصان پہنچاتی اور آس پاس کی چیزوں کو بھی۔ بات کرنا ترک کر دیتی۔ کئی کئی دِنوں تک......"

"او مائی گاڈ......اور اُس کے شوہر......؟"

"بالکل اُس کا ضِد۔ یعنی غصّے کے معاملے میں بھی۔ اُس کے دل کی بات ملیحہ کبھی جان نہ پاتی۔ بہت Introvert قسم کا۔ آخری بار میری شادی پر ملاقات ہوئی تھی اُن لوگوں سے۔ میری شادی اس کی شادی کے سال بھر بعد ہی ہوئی تھی۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے۔ لمبے لمبے بالوں والی ایک نہایت حسین لڑکی نے مجھے گود میں اُٹھا رکھا تھا اور بار بار میرا منہ چوم رہی تھی۔" فیصل ہنسا۔

"جی نہیں، جناب کوئی چھ سات برس کے تھے اور ماشاء اللہ خوب صحت مند بھی......اور وہ نازک سی لڑکی......" عافیہ بھی ہنسی۔

"ہم مسقط آ گئے......اور......وہ......میں نے فون کیا تو نمبر بدل چکا تھا......بچھڑ کر ہی رہ جاتی ہیں......سہیلیاں......" عافیہ اُداس ہو گئی تھی۔

......☆☆......

فیصل آئینے میں بال سنوارتے ہوئے یاد کر رہا تھا۔

پھر بڑی دلرُبا سی خوشبو اُس نے اپنے کانوں کے قریب گردن پر چھڑکی اور دونوں ہاتھوں کو گلے پر پھیر کر خوشبو کی باقی نمی کلائیوں اور ہتھیلیوں پر رگڑ دی اور پھر ہلکے نیلے اور سفید چیک کی قمیض کے ساتھ ہلکی نیلی جینز پہن کر پلنگ کے نیچے سے کل رات لاپرواہی سے پھینکے ہوئے نیلے رنگ کے فلوٹرس نکالنے لگا۔

دو روز پیشتر ہی اُس نے یہ گھر لیا تھا جو ابھی بکھرا بکھرا لگ رہا تھا۔ دراصل یہ ایک فلیٹ تھا اور ایک طرح سے عارضی انتظام۔ کاروبار جماتے ہی وہ وقت نکال کر باقاعدہ بنگلہ خریدنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

......☆☆......

جوتے پہن کر اُس نے خود کو ایک بار پھر آئینے میں دیکھا اور نکلنے سے پہلے گیلا تولیہ اٹھا کر

غسل خانے میں پھیلا دیا۔

چھ بجنے میں پانچ منٹ تھے جب وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ ملازم نے اسے ڈرائینگ روم میں بٹھایا۔ کچھ دیر وہ نفاست سے سجے ہوئے کمرے کو دیکھتا رہا۔ شفاف دیوار پر سورۃ الرحمٰن کی آیتوں سے محرک صادقین کی مختلف شبیہات پر بنی آئل پینٹنگ کی کھنچی تصویر سنہرے رنگ کے منقش فریم میں اچھی لگ رہی تھی۔ صوفوں کے سامنے کی لمبی میزوں پر مختلف ملکوں کے نوادرات سلیقے سے سج رہے تھے۔ کونے میں رکھی سیاہ کانچ کی گول میز پر کرسٹل کی کھلی چونچ والے راج ہنس کی لمبی گردن اور منقار کے درمیان پھنسے نازک سے فریم میں زیورات سے لدی ہوئی ایک لڑکی اپنی لمبی چوٹی گود میں ڈالے کرسی پر سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے عقب میں ہاتھ میں پائپ تھامے کرسی کی اونچائی سے ذرا سا اونچا ایک مرد بے تاثر چہرے سے کیمرے کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں کچھ چھوٹے بڑے مجسمے بھی تھے۔

دروازے کے قریب سر ڈھکے ایک دوشیزہ کا مجسمہ تھا جو ہاتھ میں لیے پھول کو دیکھ رہی تھی۔ فرش پر رکھے بڑے بڑے گلدانوں میں بغیر چھوئے مصنوعی نہ معلوم ہونے والے خوش رنگ پھول نہایت دلکش لگ رہے تھے۔

ملازم مشروب لے کر اندر داخل ہوا۔ پیچھے پیچھے ایک لڑکی آئی تو وہ تعظیماً کھڑا ہو گیا اور بیٹھنا جیسے کہ بھول ہی گیا۔

"...... بیٹھئے نا...... پریشانی تو نہیں ہوئی...... گھر تلاش کرنے میں......"

وہ صوفے پر بڑے باوقار انداز میں بیٹھ گئی۔ اُس کا چہرہ فوٹو والی لڑکی سے بہت ملتا تھا۔ پیازی رنگ کا لباس اُس کی رنگت سے میل کھا رہا تھا۔ گھنے بال، ابرو اور کاجل لگی آنکھیں چہرے پر نمایاں ہو کر بے حد دلکش سی تصویر پیش کر رہے تھے۔

"سب...... خیریت ہے نا...... گھر میں......" وہ ہلکے سے مسکرائی تو فیصل جیسے چونک کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"جی...... بس ٹیکسی والے نے ذرا زیادہ ہی گول گول گھما لیا۔ ۔ہاں اُدھر سب اچھے"

ہیں۔کل ہی بات ہوئی تھی۔ عافیہ بھابی بہت یاد کرتی ہیں آپ سب کو...... کتنا، Develop ہوگیا ہے یہ شہر...... کہتی تھیں سارا علاقہ ویران ہوا کرتا تھا......"

وہ کمرے کی سیلنگ کے درمیان لگے چھوٹے سے فانوس کی طرف دیکھ کر بولا جس کے ساتھ ستارے کی ساخت کی کانچ کے اندر چھوٹے چھوٹے بلب زنجیروں کے سہارے لٹک رہے تھے جو کھڑکیوں کے شیشوں پر پھیلے پردے کی آڑ سے آرہی ڈوبتے سورج کی ایک کرن میں پنکھے کی ہوا سے جھول کر چمک جاتے۔

"یہ تصویر بالکل آپ جیسی لگتی ہے۔" وہ دفعتاً راج ہنس والے فریم میں جڑی تصویر کو دیکھ کر بولا۔

بالکل ماں جیسی حسین ہے...... اُس نے دل میں سوچا تو وہ ایسے مسکرائی جیسے اُس نے اُس کے دل والی بات بھی سُن لی ہو۔

"واقعی......؟" وہ ہنس دی۔

ہنسنے سے اس کے ہلکی سی لپ سٹک لگے خوبصورت ہونٹ بائیں طرف سے ذرا سا نیچے کو خم ہوگئے۔ اُسی طرف کے نتھنے میں پہنا ہوا ننھا سا لونگ دانتوں کی موتی ایسی قطار کے ساتھ مل کر چمکنے لگا۔ رخسار ذرا سا اوپر کو اُبھرے تو کاجل لگی آنکھیں پپوٹوں کے غلافوں کی اوٹ سے مسکرا اٹھیں۔ ہنسی کی کھنک کشمیری پھرن کے نقرئی گھنگھریوں سے سجے دامن کی صدا جیسی تھی جو ہوا کے جھونکے سے اچانک لہرا گیا ہو۔

فیصل نے ایسی جادو بھری ہنسی پہلے سنی تھی نہ دیکھی تھی۔

"بھابی کہتی ہیں میری دوست بہت اچھی فن کار ہیں۔" وہ مجسمے کی طرف دیکھتی ہوئی بلوریں گردن کو دیکھ کر بولا۔

"یہ سب آپ کو بھی Genes میں ملا ہوگا......"

"Genes میں......؟ ...... پتہ نہیں......" وہ مسکرائی۔

"یہ، عمر رسیدہ خاتون کا مجسمہ۔ آپ سے مشابہ ہے...... کیسے؟"

"میں نے تراشا تھا...... بہت پہلے کہ بوڑھی ہوں گی تو ایسی نظر آؤں گی...... مگر...... ہو ہی

نہیں رہی......" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"بوڑھی ہوں گی تو کبھی......ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے......اور......وہ......چھوٹی سی بچّی کا......آپ نے اپنی تصویر دیکھ کر بنایا ہوگا......"

"ہاں......اپنی بیٹی کا مجسّمہ بنایا تھا میں نے......مگر وہ پیدا نہیں ہوئی......میں......"

"ارے......کمال ہے......کیا......Imagination ہے......تو ہو جائے گی......ابھی سے کیسے......بھلا......" وہ زور سے ہنسا مگر وہ اُسے سنجیدگی سے دیکھتی رہی۔

"چائے ......لیں گے نا۔آپ؟" وہ اُٹھ کر چلی گئی تو اُس کی لمبی چوٹی دیر تک فیصل کی آنکھوں میں لہرایا کی۔

فیصل، ملیحہ کے یہاں سے لوٹا تو ایک مسرّت بھری بے چینی اُس پر طاری رہی۔اسے بہت سے کام کرنے تھے۔ کچھ ٹیلی فون، کاروبار کے سلسلے میں کچھ لوگوں سے ملاقات، گھر کے لیے ملازم کا بندوبست، دفتر کی تلاش اور دفتر کا عملہ وغیرہ وغیرہ...... مگر اُس سے کوئی کام نہ ہو پا رہا تھا۔

اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔عافیہ بھابی کی زبانی وہ بچپن سے ہی ملیحہ کی اس قدر تعریف سنتا آیا تھا کہ اُس کا سراپا اُس کے ذہن میں بس گیا تھا۔ عافیہ بھابی جب پریوں کی کہانی سنایا کرتیں تو تصوّر میں لمبے بالوں کی چوٹی گوندھے ایک پروقار حسینہ پنکھ لگائے نظر آتی۔لڑکپن تک آتے آتے لمبی چوٹی والی حسینہ کے پنکھ غائب ہو گئے اور خوابوں میں ایک خوبصورت سراپا رہ گیا جس کا چہرہ واضح نہ ہوتا تھا۔آج ملیحہ کے یہاں اُسے چہرہ بھی نظر آ گیا تو وہ بے چین ہو اُٹھا۔

اس کا نام......اُس نے پوچھا ہی نہیں۔وہ چونکا اور پھر مسکرا دیا۔

اُس نے ٹیکسی بلوائی اور اُسے پرانے شہر کی طرف چلنے کو کہا۔

لمبی لمبی سڑکوں پر بجلی کے کھمبے روشن تھے۔وہ انہیں پیچھے بھاگتے دیکھتا رہا......شہرِ دِلّی بھی کسی دل پھینک عاشق کی طرح بدلتا رہا۔بار بار بسا، بار بار اُجڑا۔قدیم لغاتِ فیروزی میں دِلّی کی تعریف یوں ہے کہ پنجاب کا ایک شہر جو دریائے جمنا کے کنارے آباد ہے۔

پنجاب کے ٹکڑے ہو گئے۔ جمنا ندی سوکھ گئی...... یہاں...... برسات میں سیراب ہوتی ہو گی......اور......شہر دلی اپنی محرومیوں اور ترقیات سمیت نقشۂ ہند پر پورے وقار سے جلوہ افروز ہے۔کتنی تہذیبیں سمٹ آئیں ہیں اس میں......ایک نئی مضبوط Metropolis تہذیب وجود میں آ گئی ہے۔

پھر بھی ویسا ہی خوبصورت ہے جیسا عافیہ بھابی نے بتایا تھا۔

انڈیا گیٹ کے دائرے میں نصف دائرہ پار کرتے وقت کتنا روشن، رنگیلا اور نشیلا نظر آ رہا تھا شہرِ دلی۔

میرا حسین......شہر......میرا وطن......فیصل نے زیرِ لب کہا۔

بھابی نے کہا تھا کہ ملیحہ کے گھر کا علاقہ آدھے سے زیادہ ویران ہے۔ سڑک نکل آئی ہے مگر کچّی ہے ابھی...... کیونکہ لوگ اکثر اُدھر Farm Houses میں جاتے ہیں Week End گزارنے۔ جب ملیحہ کی سسرال والوں نے بنگلہ تعمیر کیا تو راستہ ایک دم اُوبڑ کھابڑ تھا۔ ان ہی دنوں ادھر ایک یونیورسٹی تعمیر ہو رہی تھی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، Late Sixtees میں۔ عافیہ بھابی اور ملیحہ، Early Batches میں شامل تھیں۔

......☆☆......

اکبر علی کا بنگلے کی تعمیر کے لیے زمین دیکھنے کے سلسلے میں اُس راستے بہت آنا جانا ہوا کرتا تھا۔ جبھی انھوں نے ملیحہ کو کہیں دیکھا تھا اور اپنے مخصوص محتاط انداز سے تحقیق کر کے شادی کا پیغام دیا تھا۔ اس کے اپنے گھر کے لوگ اور دوست تک نہیں جانتے تھے کہ اُس نے لڑکی کو دیکھا بھی تھا۔ یہ بات ملیحہ نے عافیہ بھابی کو بتائی تھی۔ شادی کے مہینوں بعد جب خود اُسے معلوم ہوئی تھی۔

''ایک دن یونیورسٹی کے ایک مجسمہ ساز لڑکے اور ملیحہ کے مجسموں کی نمائش ہوئی تھی للت کلا اکادمی میں۔ کتنی محنت کی تھی ملیحہ نے لگاتار تین مہینے۔ ہتھوڑی سے چھینی پر ضرب لگا لگا کر اُس کی انگلیوں میں چھالے پڑ جاتے تھے، جب جا کر کہیں پتّھر کا چھوٹا سا ٹکڑا اپنی جگہ سے سرکتا تھا۔ اس

کا داہنا بازو کوئی انچ بھر لمبا ہو گیا تھا۔ دو یا تین گھنٹے سوتی تھی وہ کل ملا کر...... اتنی Dedicated فنکارہ روز روز پیدا نہیں ہوتی......" عافیہ بھابھی نے لمبی سے آہ بھری تھی۔

"اکادمی میں اب بھی اُس کا وہ مجسمہ محفوظ ہوگا...... میرے خیال سے...... کمر میں گاگر پھنسائے...... پنہارن...... جیسے ابھی ابھی پانی بھر کر کھڑی ہوئی ہو...... مگر...... اکبر علی کو مجسمہ سازی بالکل اچھی نہیں لگتی تھی...... ملیحہ سے کہتے تھے کہ نہایت سُست رفتار عمل ہے...... گناہ ہے......"

ڈرائیور نے دلّی کی تاریخی جامع مسجد کی طرف گاڑی موڑ دی۔ عافیہ بیگم نے پرانی دِلّی کی اتنی دلچسپ باتیں سنائی تھیں کہ فیصل کو وہاں جانے کا بے حد اشتیاق تھا۔ فیصل کی نظر مغل بادشاہ، شاہ جہاں کی تعمیر کردہ اس عظیم عمارت پر پڑی تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ رات کے دس بج رہے تھے اور رونق ایسی تھی جیسے دن کا وقت ہو۔ اس نے ٹیکسی مسجد کے قریب رکوادی کہ اندر کے بازاروں کی نسبتاً تنگ گلیوں میں رکشے کی سواری زیادہ بہتر تھی۔ عافیہ بھابی کے زمانے سے بھی پہلے سے قایم کریم ہوٹل کی طرف مڑنے سے پہلے اُس نے ٹیکسی ڈرائیور کو کھانا کھانے کے لیے لمبا سا نوٹ دیا تو وہ سلام کر کے مسکرایا۔

"ایئرپورٹ سے رات کی سواری کے بعد تو صاب جی پُرانے شہر کے علاوہ کہیں کھانا نہیں مل سکتا ہم لوگوں کو۔ دِلّی شہر تو پھیلتا جا رہا ہے۔ اُدھر فرید آباد اِدھر غازی آباد اور نہ جانے کیا کیا مگر پرانی دِلّی نہیں بدلی۔" اُس نے گاڑی مقفّل کرتے ہوئے کہا۔

"میں اِدھر ہی ملوں گا آپ کو جب بھی لوٹیں گے۔"

"ٹھیک ہے......" وہ بولا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا گلی میں مڑ گیا۔

......☆☆......

واقعی پرانی دِلّی نہیں بدلی تھی۔ نئی نئی تعمیرات نے پرانی وضع کے مکانوں میں کچھ تبدیلی پیدا کی تھی مگر بہت کم اور صرف کسی کسی جگہ اور نسل در نسل رہ رہے مکین ابھی تک اپنا وہی طرزِ زندگی اپنائے ہوئے تھے جو اُن کی دو تین پیڑھیوں سے بھی زیادہ پہلے سے رائج تھا۔ ماسوائے کچھ جدید سہولیات کے، اپنی تہذیب کو سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ پکوان، ملبوسات، عطر، پان۔

وہی کلچر جیسا فیصل نے کتابوں میں پڑھا تھا،تصویروں میں دیکھا تھا۔عافیہ بھابی سے سُنا تھا۔

''اب آپ آگئے ہو صاب جی تو کسی دن فرصت سے آپ کو سارا شہر گھماؤں گا اِدھر کا......''فیصل لوٹ کر ٹیکسی میں بیٹھ چکا تھا۔

''میں بہت چھوٹا سا......چلا گیا تھا......اپنے وطن سے......'' اپنی تہذیب اور تمدّن کی مقناطیسی کشش کے زیرِاثر اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آئی۔

''چاندنی چوک میں نا......سوسال سے بھی پہلے کی ایک دُکان ہے......حلوائی کی......اصلی گھی میں بناتا ہے وہ جلیبی......ایک بار کھالو گے نا......تو روز کہو گے کہ کرتار بھائی چاندنی چونک چلتے ہیں......'' کرتار سنگھ نے سڑک پر چلی آئی گائے کو دیکھ کر زور کا بریک لگایا۔''او تیرا بھلا......حد ہے''۔وہ مسکرایا اور لمبا سا ہارن بجا کر رفتار بڑھا دی۔

بریک لگنے سے فیصل نے آگے کو جھٹکا کھایا اور پھر پیچھے نشست کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

اس کی جڑیں تو اس زمین میں پیوست ہیں......وہ کہاں بھٹکتا رہا......دیارِ غیر میں......نہ لوگ اپنے نہ زبان......نہ مٹی کی یہ خوشبو۔

......☆☆......

ملیحہ کے وہاں گزاری ہوئی لطیف شام کے خیالوں پر یہ کون سا جذبہ غالب آ گیا تھا۔یہ کیسی اپنائیت تھی۔یہ کیسا تحفظ تھا جو نصف شب بھی میّسر تھا۔یہ راستے جن سے وہ اپنی یادداشت میں کبھی نہیں گزرا......یہ ٹیکسی والا جس سے وہ کبھی نہیں ملا......ریاست ہائے متحدہ ہند کی چھوٹی بڑی ریاستوں سے جمہوریۂ ہند کی راجدھانی کی شکل اختیار کرنے والی یہ دِلّی......یہ مصروف دِلّی......یہ پُرانی اور نئی دِلّی......عافیہ بھابی کی دِلّی......اُس کی کتنی اپنی اپنی سی ہے۔اُس نے آنکھیں بند کرلیں اور فوراً کھول بھی دیں کہ آنکھیں بند کرنے سے بس ایک سیکنڈ کے کسی حصّے میں اُس نے ٹیکسی کی گہرے نیلے رنگ کی مخمل سے ڈھکی سلینگ پر سنہرے رنگ کی نازک گردن سے لگا ایک چہرہ دیکھا تھا جس کی سُبک سی ناک میں پہنی گئی لونگ مسکراتے ہوئے دہانے کے خم کے ٹھیک اوپر جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔

اُس نے مسکرا کر ونڈ سکرین سے باہر دیکھا۔ اشوک روڈ کی وسیع سڑکوں پر کھڑے جامن کے پُراسرار درخت بڑے جلال سے ایستادہ تھے۔

اچانک اُسے خیال آیا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے اُسے کچھ کہا تھا...... وہ یاد کرنے لگا۔

''ہاں...... کرتار بھائی...... کیوں نہیں ضرور......'' اُس کے چہرے پر آسودگی چھا گئی اور اُس نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر سر پھر پشت سے ٹیک دیا۔

''دن میں صاحب جی، ان درختوں میں بڑے بڑے چمگادڑ آرام کیا کرتے ہیں''۔ کرتار سنگھ ہنسا۔

......☆☆......

اگلی صبح وہ عافیہ بھابی کو فون پر اپنی دریافت کے بارے میں بتانا چاہ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو۔'' فیصل کو نازک سی ہیلو سنائی دی...... اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''جب تک گھر Set کرلیں۔ یہاں Shift کرلیجئے۔ ہمارے ہوتے ہوئے آپ خوانخواہ وہاں...... دِقّت ہو رہی ہوگی آپ کو۔''

''حاضر ہو جاؤں گا۔ مگر اب ایک طرح سے سمجھئے Set ہو ہی گیا ہوں...... ورنہ ایسی کوئی تکلّف کی بات......''

'' تکلّف کی باتیں خوب کر لیتے ہیں آپ ویسے......'' وہ کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔

''کب آیئے گا۔''

''جب آپ حکم کریں۔ حاضرِ خدمت ہو جاؤں گا۔ فون کر کے ہی آؤں گا۔''

''نہیں...... ایسی کوئی مصروفیت نہیں ہوتی ہے میری۔ کبھی بھی تشریف لے آیئے...... اپائنٹ منٹ لینے کی کوئی ضرورت نہیں......'' وہ ہنسی۔

''جی۔ بہت بہت شکریہ......'' وہ مسکرایا۔ اُس نے سوچا اُس کا نام پوچھ لے۔ پھر سوچا کہ شاید اچھا نہ لگے ایسے۔ گھر جا کر ہی پوچھنا چاہیئے۔

......☆☆......

فیصل کا وہ دن بہت مصروفیت میں گزرا...... پورا شوروم ترتیب دینا تھا۔ لکھنؤ کا چکن ورک، علی گڑھ کا پیچ ورک، کشمیر کی ٹیپسٹری، راجستھان کا ٹائی اینڈ ڈائی اور گوٹے کناری کا کام گجرات کی بلاک پرنٹنگ وغیرہ...... یہ سب کتنا اہم ہے آج کل...... کتنا مارکیٹ ویلیو ہے اس سب کا آج کے گلوبل ولیج میں۔

وہ کاروباری معاملات میں الجھا رہا۔

کبھی تھک کر سر نشست کی پشت سے ٹکا کر سوچوں میں گم ہو جاتا۔

کتنی خوبصورت ہے ملیحہ کی بیٹی۔

کل دن اسٹاف کے ارینجمنٹ میں گزر جائے گا۔ کیا کیا سنبھالا جائے۔ بڑے بھائی! خُوب پھنسایا اس ننھی سی جان کو۔

دفتر کے عملے کے بندوبست میں اُسے مزید چار پانچ دن بے حد مصروف رہنا پڑا۔

ہفتے کی شام اُس نے ملیحہ کے گھر فون کیا۔

''ہیلو......'' ایک تھکی تھکی سی زنانہ آواز آئی۔

''جی آداب عرض ہے۔ میں فیصل بول رہا تھا......''

''اوہ...... ہاں آپ کو تو ملنے آنا تھا...... ہم لوگوں سے......''

''جی وہ...... اس قدر مصروف رہا...... شرمندہ ہوں...... آپ ملیحہ صاحبہ بول رہی ہیں نا...... میں نے آپ کی آواز پہچان لی......'' وہ مسکراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''جی...... اچھا...... شکریہ......'' آواز کی تکان قائم تھی۔

''آیئے...... چائے پیتے ہیں...... اکبر بھی آنے والے ہیں۔ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے......''

''حاضر ہوتا ہوں......''

......☆☆......

فیصل نے گاڑی خرید لی تھی۔ تیز تیز ڈرائیو کرتے ہوئے وہ آدھ گھنٹے کے اندر ملیحہ کے

یہاں وارد ہوا۔ (بعد میں دِلی ٹریفک پولیس نے گاڑی تیز چلانے (مسقط کی رفتار سے) کے لیے چالان اُس کے گھر بھیج دیا تھا۔)

اخیر مئی کے دن جب وہ ٹھنڈی بند گاڑی سے باہر آیا تو گالوں پر گرم ہوا کے دو بے آواز تھپڑوں نے اس کا استقبال کیا۔ دربان لوہے کے تپتے ہوئے پھاٹک کی چٹخنی لگا کر عجلت سے اپنے چھوٹے سے کیبن میں گھس گیا۔

راہداری طے کرتے ہوئے فیصل نے بادلوں کی زوردار گرج سنی تو چونک کر آسمان کی جانب نظر اُٹھائی......اوپر آسمان نہیں تھا۔ قرمزی اور سفید بوگن بیلیا کی لمبی لمبی بیلوں نے گیٹ سے بنگلے کے دروازے تک لگی نیلے پلاسٹک کی چادر کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ وہ کچھ پل کو ٹھہر گیا پھر آگے بڑھا۔ برآمدے کے چوڑے مگر محض تین سیڑھیوں پر مشتمل زینے کے قریب لگے جوٹ کے رنگین دبیز پائدان پر جوتے ہلکے سے رگڑتے ہوئے برابر کی دیوار میں لگے آئینے میں اس نے خود کو ایک نظر دیکھا۔ نیلی چھت سے چھن کر قرمزی سا عکس لاتی ہوئی روشنی میں اس کی پوری آستین کی سفید قمیض کچھ زردی مائل آسمانی نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکان پھیل گئی۔ اُس نے انگلیوں سے بال سنوارے اور دونوں آستینوں کے بٹن کھول کر دو دو سلوٹ اوپر لپیٹ لیا۔

جن چند لمحوں میں یہ سب ہوا، انہیں لمحوں میں گیٹ بند ہونے کی آواز سن کر برآمدے کی سیدھ میں دروازے کے اطراف لگی دو کھڑکیوں میں سے ایک کا پردہ ذرا سا سرکا کر کسی نے باہر دیکھا تھا، جہاں ایک خوبرو نوجوان بال سنوار رہا تھا۔ اس کے گریبان اور بازوؤں کے گھنے سیاہ بال اُس کے سر کے تازہ شیمپو کیے ہوئے بالوں جیسے چمکیلے لگ رہے تھے۔ بالوں کی طرف اٹھے ہوئے ہاتھوں کی کسی ہوئی آستینوں میں سے بازوؤں کی مچھلیاں کچھ نمایاں ہو رہی تھیں۔ وہ بھورے رنگ کی پتلون اور اسی رنگ کے جوتے پہنے ہوئے تھا۔ آئینہ دیکھتی ہوئی اس کی آنکھیں بھی ہلکی ہلکی بھوری سی تھیں جو اُس کے بغیر چربی کے رخساروں والے لمبے جبڑوں کے پُرکشش کتابی چہرے کی جاذبیت میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ پردے کی اوٹ سے جھانکنے والی

آنکھیں اسے انہماک سے دیکھ رہی تھیں۔ بادل ایک بار اور گرجے تو اس نے چونک کر نظریں ہٹالیں۔

یہ کیا فضول حرکت کر رہی ہوں میں ...... مگر ...... اُس روز ...... تو جیسے ...... میں نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ خیر ...... ہوا کرے ...... جیسا بھی ہے ...... مجھے کیا لینا دینا۔

بوندیں بوگن بیلیا والی پلاسٹک کی چادر پر شور مچانے لگیں تو اُس نے کھڑکی سے اندر کی طرف پلٹتے ہوئے سوچا تھا۔ وہ اپنے سر کی تکلیف بھول گئی تھی اور چھوٹی سی گھنٹی بجتے ہی اُس نے دروازہ کھول دیا۔

"آداب ......" وہ اندر آ گیا۔

"بھیگا نہیں ...... میں ......" وہ ہنسا۔

"آداب۔ بیٹھئے ......" وہ دھیما سا مسکرائی۔

"ارے ...... یہ کیا ہوا ......؟" فیصل نے اُس کے ماتھے پر چھوٹے سے کھرنڈ کی طرف اشارہ کیا۔

"بس یادمت دلائیے ...... اس کی وجہ سے کئی دنوں سے سر میں درد ہو رہا ہے ......"

"کئی دن سے ......؟ چار پانچ روز پہلے تک تو نہیں تھا۔"

"ہاں نہیں تھا۔ اصل میں مجھے سر میں اتنی چوٹیں لگی ہیں کہ اب بغیر چوٹ کے بھی سر دُکھتا رہتا ہے۔"

"مطلب ...... سر میں چوٹ لگانا آپ کا مشغلہ ہے ......؟؟"

"ہاں ...... کچھ ایسا ہی ہے۔ سر ہے تو ...... دُکھے گا ہی ...... نا؟" وہ ہلکے سے مسکرا دی۔

باہر بارش تیز ہوگئی۔ ملازم چائے لے کر اندر آیا، ساتھ ہی سوندھی مٹی کی خوشبو بھی دروازے سے داخل ہوئی۔

"باہر ...... چلا جائے؟" وہ بولی تو فیصل نے باہری دروازے کی طرف دیکھا۔

"نہیں ...... ادھر نہیں ...... دراصل آپ نے یہ گھر سارا نہیں دیکھا ...... نا ...... اس کی کچھ

باتیں بڑی خوبصورت ہیں...... جیسے اُس طرف کا برآمدہ...... جس میں ہم صبح شام اکثر چائے پیا کرتے ہیں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''یہ ہمارے کمرے اور باورچی خانے دونوں سے ملحقہ ہے۔''

''چلیئے...... ضرور...... باقی لوگ کہاں ہیں......'' وہ بھی اُٹھا۔

''آنے والے ہوں گے......''

''اور ملیحہ صاحبہ؟...... آج فون پر اُن سے بات ہوئی تھی......'' وہ پیچھے پیچھے چلتا ہوا بولا۔
وہ برآمدے میں لگی شیشم کی لکڑی کی مُنقش پشت والی جوٹ کی بُنی گئی نشست والی کُرسی پر بیٹھنا چاہتی تھی کہ ٹھٹھک کر اُس کی طرف مُڑی اور پھر ایک پل بعد کُرسی پر بیٹھ کر بارش کو دیکھنے لگی۔
جوٹ کی ہی چھوٹی چھوٹی تپائیوں پر ملازم نے ان دونوں کی چائے بنا کر پیالیاں رکھ دیں۔

''یہ......Pre-monsoons ہیں......'' بارش کو برآمدے کے اوپری زینے پر چھینٹے اڑاتے دیکھ کر وہ بولی۔

''کتنا خوبصورت ہو گیا موسم۔ آن کی آن میں......'' وہ باغیچے کی سبز گھاس کو بھیگتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر یکا یک اس کی طرف پلٹا۔

''اتنے دن سے...... میں نے آپ کا نام تک نہیں پوچھا...... اور ملیحہ صاحبہ بھی نظر نہیں آرہیں......'' کچھ دیر پہلے یہ سوال سُن کر وہ چونکی تھی۔ پھر اُسے لگا کہ شاید بوندوں کے شور میں اس نے کچھ غلط سنا ہو۔

''جی......؟؟؟'' حیرت سے اس کا خوبصورت دہانہ ادھ کھلا رہ گیا تو فیصل کی نظر اُس کے دانتوں پر ٹھہر گئی۔ اوپر کے درمیانی دو دانت ایک دوسرے سے ذرا ذرا سے دُور اُس کے اوپری لب کی اوٹ میں سے جھانکتے اُس سے بھی زیادہ حیران نظر آرہے تھے۔

''آپ کو عافیہ نے...... میرا نام نہیں بتایا گیا......'' اُس کے چہرے پر سے حیرت کے تاثرات کم ہوئے تو ہنستے ہوئے بولی۔

''او...... نو...... میرا مطلب ہے...... آپ...... آپ......؟''

''میں......میں......میں کیا؟......میں آپ کی عافیہ بھابی کی دوست ملیحہ اکبر علی ہوں......''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے......میں......میں تو......''

''کیا نہیں ہوسکتا۔تم نہیں جانتے ہمیں کیا۔ہم سب کو؟'' وہ گردن اونچی کیے مسکراتی ہوئی، کچھ سمجھاتی ہوئی، کچھ حیران سی بولی۔وہ پتھر کے بُت سا حیرت زدہ اُس اٹھی ہوئی نازک گردن کو دیکھتا رہا۔کئی پل ایسے ہی گزر گئے۔ٹھنڈی ہوا ہلکے ہلکے چلتی رہی۔بارش کی بوندیں تھم تھم کر گرتی رہیں۔دُور کہیں کوئل بولنے لگی۔

یکایک اندر سے نہایت سُریلی مغربی دھن سنائی دی۔

''کوئی گٹار بجارہا ہے کیا......؟'' وہ اندر کی طرف منہ موڑ کر بولا۔

''نہیں......یہ گھڑی ہے......گھنٹہ بجانے سے پہلے گٹار بجا کر اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔'' وہ کچھ لمحے رُک کر بولی۔

گھڑی نے سات گھنٹے بجائے۔باہر سے گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔تین دفعہ......لمبے لمبے......تین ہارن۔

''پکوڑے بنالاؤ......'' وہ برتن سمیٹ رہے ملازم سے مخاطب ہوئی۔

''وہ......آگئے......'' اس نے فیصل کی طرف دیکھا۔

''اب کچھ نہیں ہوسکتا......'' اُس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

''کس کا......تمہاری عقل کا......؟'' وہ خوشدلی سے ہنسی۔

......☆☆......

اکبر علی سیدھے برآمدے میں آئے اور فیصل سے بشاشت سے ملے۔

''اور بھائی......ظہیر صاحب کب آرہے ہیں۔'' انہوں نے ملیحہ کے ہاتھ سے چائے لیتے ہوئے کہا۔ملیحہ ان کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔خود اُس کے چہرے پر سنجیدگی چھا رہی تھی۔

''ملیحہ نے بتایا تھا کہ تم آئے ہو......بہت دن بعد فرصت ملی......'' اکبر علی نے فیصل کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔

"آجایا کرو کہ...... ذرا......" انہوں نے چائے کا گھونٹ نگلا۔ ملیحہ پریشان نظر آنے لگی تھی۔

"کہ ذرا یہ سونا گھر آباد ہوجایا کرے گا...... کچھ انسانوں کی آوازیں سنائی دیں گی...... یہاں تو پتھر ٹوٹنے کی صدائیں آتی ہیں بھائی......"

ملازم آلو اور پالک کی پکوڑیاں طشتری میں لے آیا تھا۔ اکبر علی نے ان پر کالی مرچ اور کالا نمک چھڑک دیا اور ماتھے پر بل ڈالے ایک نظر ملیحہ کو دیکھا اور چائے کی پیالی اٹھالی۔ وہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔

"چائے اچھی دم بناتا ہے ہمارا غفور......"

انہوں نے ایک اور ویسی ہی نظر ملیحہ کی طرف ڈالی مگر اس وقت ان کا سر جھکا ہوا تھا اور کیتلی فیصل کی طرف سرکائی۔ فیصل ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اکبر علی نے ہونٹ مسکراہٹ کی طرز پر پھیلا رکھے تھے۔ مگر چہرے پر قطعی کوئی تاثر عیاں نہ تھا۔ آنکھ کی پتلی کی جسامت کا نیلم جڑی سفید دھات کی موٹی سی انگوٹھی والی چھوٹی انگلی چائے کی پیالی کا دستہ تھامنے والے مختصر سے ہاتھ کی بقیہ تین انگلیوں سے ذرا دور چمک رہی تھی۔

فیصل ابھی ملیحہ کے انکشاف سے ہی سنبھل نہ پایا تھا کہ اکبر علی کسی سراپا انکشاف، کی صورت سامنے آگئے اور پھر ان کے بے اولاد ہونے کا انکشاف...... اپنی پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے وہ اُنہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

اس آدمی کا نام اکبر علی نہیں...... اصغر علی ہونا چاہیئے تھا۔ یہ چھوٹا سا سراپا...... اور یہ لمبے لمبے جملے...... کیا زبان عطا کی ہے خدا نے...... اصغر علی...... اُس نے اندر ہی اندر دہرایا تھا۔

پھر چہرے پر چپکے سے چلی آئی مسکراہٹ کو بڑے ضبط سے روک کر اس نے ملیحہ کی طرف دیکھا۔ ملیحہ اس سے نظریں ملتے ہی مسکرانے کو کوشش کرنے لگی، مگر اس کا چہرہ کئی دن کے بخار زدہ مریض کے ایسا لگ رہا تھا۔

رنج کی ایک ان جانی سی لہر فیصل کے سینے میں دوڑ گئی۔

وہ دوبارہ آنے کا وعدہ کرکے وہاں سے چلا آیا...... اور جانے کیا کیا سوچتا ہوا ڈرائیو کرنے

لگا۔ بارش سے بھیگی سڑکوں پر کچھ ہلکی رفتار سے گاڑی چلانا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

اُس رات اس نے مسقط ٹیلی فون کیا۔

"عافیہ بھابی...... آپکی سہیلی تو اتنی سمارٹ ہے اور آپ...... اگر میرے آنے تک آپ نے اپنا وزن کم نہ کیا...... تو کبھی نہیں آ ؤں گا......"

"میں سمجھی نہیں تمہارا مطلب۔" عافیہ بیگم اس کے جملے پر ہنس دیں۔

"مطلب و طلب کچھ نہیں۔ بس جو میں نے کہا وہی ہوگا...... عافیہ بھابی...... وہ اصغر علی......" وہ ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا۔

"کون اصغر علی......؟" وہ بولیں۔

"وہ...... وہ...... جو......" وہ ہنستا گیا۔

"اب بولو گے بھی کہ...... چلو ہنس لو پہلے......" وہ بھی ہنسیں۔

"میرا مطلب ہے اکبر علی...... کتنا متضاد نام رکھا ہے گھر والوں نے...... وہ تو......"

"چُپ۔ شریر کہیں کا...... ایسا نہیں کہتے......" عافیہ بیگم نے پیار سے ڈانٹا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ بیٹی ہے ان کے...... کوئی......؟ دیکھا بھالا خاندان......"

"یہی تو رونا ہے عافیہ بھابی بیٹی ہی نہیں ان کی......"

"اور بیٹے......؟" انہوں نے جلدی سے پوچھا۔

"...... نہیں...... اُن کے...... کوئی اولاد ہی نہیں......" اس کی سنجیدہ آواز آئی۔

......☆☆......

فیصل نے خود کو کام میں مصروف کر لیا تھا اور مزید مصروف رہنے کے لیے کام کا انتظام کر رہا تھا کہ اسے ارادہ بدلنا پڑا۔ عافیہ بیگم نے کسی کے ہاتھ کچھ سامان بھجوایا تھا جس میں ملیحہ کے لیے بھی کچھ چیزیں تھیں۔ خوشبو کی کچھ شیشیاں...... شب خوابی کا لباس...... ہرے نیلے گل بوٹوں کی کڑھائی والا سیاہ برقع اور ایک خط۔

فیصل نے فون پر ملاقات کی اجازت چاہی جو بخوشی دے دی گئی۔

ملیحہ کے ماتھے کا زخم بھر گیا تھا۔ مگر بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی پر بینڈ ایڈ چپکا تھا۔ چہرہ بشاش لگ رہا تھا۔

''آج آپ نے انگلی پر غصّہ اُتارا......'' وہ مسکرایا۔ ملیحہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''آپ کو کس نے کہا...... کہ...... کہ......'' وہ پل بھر کو خاموش ہوگئی۔

''یہ دراصل...... دب گئی تھی مجھ سے...... ان جانے میں...... اُس دن البتہ میں نے غصّے میں...... ماتھے......'' وہ یکلخت چُپ ہوگئی تو فیصل سوچ میں پڑ گیا۔

ایک...... خرابی ہے ملیحہ میں...... اُسے غصّہ بے تحاشا آتا ہے...... اپنے آپ کو بھی تکلیف پہنچاتی ہے اور......

''اب آپ نے غصّہ صرف خود پر اُتارنا شروع کر دیا ہے......''

وہ اُس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ نظریں جھکائے اپنی انگلی کو دیکھتی رہی۔ پھر فیصل کی طرف دیکھنے لگی۔

''اب...... اور کسی پر نہیں اتارتی میں غصّہ...... عافیہ سے کہہ دینا۔''

اُس نے اداسی سے کہا...... مگر اگلے ہی پل اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''جانتے ہو...... میں ایک Sculpture بنا رہی ہوں......'' وہ بچّوں کی طرح چہکی۔

''اوہ تو کیا...... انہوں نے...... اکبر بھائی نے اجازت......؟''

''انہوں نے بہت پہلے کہہ دیا تھا...... کہ کبھی کبھار ٹھیک ہے مگر اس شرط پر کہ Exhibition نہ کی جائے...... تم دیکھو گے......؟'' وہ فیصل کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

فیصل نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں میں دو جہاں کی خوشی سمٹ آئی تھی۔

''بالکل......'' وہ جگمگ کرتی آنکھوں کو پل بھر دیکھا کیا اور پھر دفعتاً اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی کھڑی ہوگئی اور اس کے آگے آگے چلنے لگی۔

''Basement میں ہے میرا Studio۔'' وہ زینہ اُترتے ہوئے بولی۔

تہہ خانے میں جہاں کئی نیم فضول چیزیں پڑی تھیں وہیں دوسری طرف اس کے بنائے

ہوئے مجسمے رکھے تھے۔

رقاصہ کا کوئی تین فٹ اُونچا مجسمہ۔

کتا گھماتا ہوا چھوٹا سا لڑکا...... لڑکے کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور چھوٹا سا Pekinese اصل سے کتنا قریب نظر آ رہے تھے۔ فیصل مبہوت دیکھتا رہ گیا...... کئی منٹ...... پھر اس نے رقاصہ کی طرف دوبارہ نظر ڈالی۔ بھرت ناٹیم کے مخصوص انداز میں دل کی باتیں کہتی ہوئی...... ایک ابرو اُوپر کو اٹھائے ہوئے ہاتھوں سے کنول کا پھول بنائے ایک گھٹنا آدھا خم کیے، جس کے پاؤں کی ایڑھی زمین سے لگی ہے اور پنجہ ہوا میں اُٹھا ہے۔ اُس کے لباس کی سلوٹیں پیٹ سے ہوتی ہوئی پیروں کے قریب آکر پھیل گئی ہیں...... کسی قدر دلکش...... وہ انگشت بدنداں دیکھتا رہ گیا۔ وجیہہ شانوں والے مرد کا بائیں جانب دیکھتا ہوا چھاتی تک تراشا گیا مجسمہ۔ آدھے ٹوٹے پنکھ والی فاختہ کا مجسمہ...... اور اس طرح کے کچھ اور شاہکار۔

یہ فن پارے اس طرح بے وقعت پڑے ہیں...... فیصل رنجیدہ سا ہو گیا۔ اس نے ملیحہ کی طرف دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ فوراً مسکرا دیا۔

"ارے واہ۔ لاجواب۔" اس نے تالیاں بجائیں۔

"ذرا سا میں...... کچھ دخل دوں...... اگر آپ کی اجازت ہو تو۔" ملیحہ نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔

"اجازت ہے......" وہ مسکرائی۔

فیصل نے قمیض کی اوپری جیب سے قلم نکالا اور سنگ مرمر کی فاختہ کے قریب چلا گیا۔ اُس نے قلم سے فاختہ کی آنکھ کی پتلی سیاہ کردی۔ فاختہ ایک دم جیتی جاگتی سی جیسے دیکھنے لگ پڑی۔ ملیحہ نے کچھ پل فاختہ کو غور سے دیکھا تو وہ ٹھٹھکا۔

"مٹ بھی سکتا ہے...... سیاہی ہے......" اُس نے جلدی سے کہا تو ملیحہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ملیحہ کے چہرے پر خوشی کے آثار تھے۔ وہ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی۔

"فن شناس ہو......" وہ بولی اور جلدی سے سر جھکا لیا۔ مگر فیصل نے اُس کے چہرے پر کرب

کے تاثرات چھاتے اور پھر غائب ہوتے ہوئے دیکھ لیے تھے۔ وہ آگے بڑھی اور ایک نامکمل مجسمے کے قریب ٹھہر گئی۔ اس نے چھوٹی سی ہتھوڑی ہاتھ میں لے لی۔

''اس نے کیا ہے میری انگلی کو زخمی......'' وہ مسکرا کر بولی۔

''اِس کی خاطر......'' اس نے نامکمل مجسمے کے نصف حصّے پر جو قدرے چھوٹا تھا ہاتھ رکھ دیا، جس پر کچھ ہی ضربیں پڑی تھیں۔ مگر اندازہ ہوتا تھا کہ کیا تراشا جانے والا ہے۔

''ماں اور بچّے کا مجسّمہ بنے گا...... یہ۔''

''سمجھ گیا تھا میں......واہ......'' وہ خوشدلی سے مسکرایا۔

''چلو چائے پیتے ہیں......'' وہ زینے کی طرف بڑھنے لگی تو فیصل کے لبوں پر ایک شعر ابھر آیا۔

میں شاعر ہو گیا ہوں۔ اُس نے مسکرا کر سوچا۔

''میں نے ایک شعر کہا ہے۔ سنیں گی......'' وہ بولا۔

''ایسا......؟'' وہ مسکرائی تو اس نے بہ آوازِ بلند گلا صاف کیا۔

''جی ہاں......عرض کیا ہے کہ:

مری آنکھوں سے گزر کر روح میں آن بسے
تیرے چہرے پہ جو آ ٹھہرے تھے غم کے سائے

شعر سناتے ہوئے وہ اداس سا ہو گیا۔

''تو...... یہ شوق بھی پال رکھا ہے جناب نے...... کب سے......؟'' وہ خوش دلی سے بولی۔

''ابھی اسی وقت سے......'' وہ مسکرا دیا۔

''واہ......اچھا شعر کہہ لیا آپ نے......آپ اچھے شاعر ہو سکتے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''یہ سب آپ کے فن کا کرشمہ ہے کہ میں پل بھر میں......شاعر بن گیا۔''

وہ چلتا ہوا مرد کے مجسّمے کے قریب پہنچ گیا۔

''بالکل مجھ جیسا لگتا ہے نا......'' اُس نے مجسّمے کی طرح کھڑے ہو کر گردن بائیں جانب موڑی......اور بائیں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے دیکھے بغیر آپ نے میرا مجسّمہ کیسے بنالیا......'' وہ گردن دوسری طرف کیے بولتا رہااور ملیحہ کے کھنکتے ہوئے قہقہے یکے بعد دیگرے گونجنے لگے۔

''اب ہٹ بھی جاؤ......وہاں سے......'' وہ ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی تو وہ مجسّمے کے پاس سے چلا آیا۔

برآمدے میں چائے لگادی گئی تھی۔ملیحہ نے کیتلی سے ٹی کوزی ہٹا کر کیتلی کو چھوا۔

''کچھ......ٹھنڈی نہیں ہوگئی......؟'' اس نے ایک پیالی میں چائے انڈیلی تو فیصل نے پیالی کوانگلی کے پوروں سے چھوا۔

''نہیں تو......'' وہ جلدی سے بولا۔

''چلے گی......'' وہ مسکرادیا تو وہ بھی مسکرادی۔

......☆☆......

غلام گردش کی بڑی سی گھڑی نے چھوٹے چھوٹے سات گھنٹے بجائے تو فیصل نے اجازت طلب کی۔

''پھر کب آؤ گے......تم......بہت زیادہ مصروف آدمی؟'' وہ بھی کرسی سے اٹھی۔

''بہت جلد......''

''جیسے......''

''دو چار روز میں۔''

''دو میں یا چار میں؟''

''آپ حکم کریں جب......حاضر ہو جاؤں گا......''

''تمہاری طرف کب بند ہوتا ہے۔مارکیٹ......؟''

''منگل کو بازار بند رہتا ہے......''

''تو بس پیر کو رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھالو......؟''

''میں شام کو حاضر ہو جاؤں گا......مگر کھانا۔گھر......''

''بالکل ٹھیک......شام کو آجاؤ اور رات کا کھانا کھا کر چلے جانا۔نا......تمہیں......کیا پسند ہے......میں وہی بناؤں گی......'' وہ دروازے پر کھڑی رہی۔

''......ہاں......بٹیر کے کوفتے......پیاز کا شوربہ......مچھلی کی چٹنی'' وہ مسکرایا تو وہ ہنسی۔

''مچھلی کے کوفتے......بٹیر کا شوربہ......پیاز کی چٹنی، چلے گی......؟اور ساتھ میں......''

''دوڑے گی......اور ساتھ میں دس بارہ چیزیں اپنی پسند کی بناڈالیے گا......میں زیادہ نہیں کھاتا......خدا حافظ......''

وہ دروازے پر کھڑی ہنستی رہی۔

''خدا حافظ۔'' جب وہ پھاٹک سے نکل گیا تو وہ اندر کو پلٹ آئی۔

ملیحہ کے گھر کے موڑ سے نکل کر وہ بڑی سڑک پر آیا تو موڑ کی طرف مڑتی ہوئی لمبی سی ایک گاڑی کی پچھلی نشست پر ایک چھوٹا آدمی بیٹھا نظر آیا۔

......بٹیر کہیں کا......اُس نے زیرِ لب کہا اور ایک قہقہہ اُچھال کر گاڑی کی رفتار تیز کردی۔

اُس دن اُس نے عافیہ کے ساتھ فون پر ڈھیروں باتیں کیں۔

''عافیہ بھابی میں شادی کر رہا ہوں......'' وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔

''کیا کہہ رہے ہو پگلے......'' وہ ہنسیں ''میری اجازت کے بنا ہی......'' اس نے مصنوعی حیرت ظاہر کی۔

''ہوں......جیسے کہ آپ مجھے اجازت دے دیں گی......''

''تم بول کر تو دیکھو......تمہارے جیسی پیاری ہو......یہ شرط ہے......''

''مجھ سے کہیں زیادہ عافیہ بھابی......''

''سچ کہہ رہے ہو......؟ کون ہے......کون لوگ ہیں......کن کی ہے......'' عافیہ کی آواز میں خوشی بھر گئی تھی۔

''ارے ملیحہ اصغر علی ہے۔اس کچھوے اکبر علی سے اس پری کو طلاق دلوا کر رہوں

گا......آپ دیکھ......"

"چپ......بدتمیز کہیں کا......" عافیہ پر ہنسی کا دورہ پڑا۔

"ایسا نہیں کہتے......" ہنسی کچھ کم ہوئی۔

"میری عمر کی ہے......کچھ شرم کرو......سوچتے نہیں مذاق کرنے سے پہلے......

اُلّو......بدّھو۔"

کون کم بخت مذاق کر رہا ہے......عافیہ بھابی......رشتہ بھی پچاس فی صد طے ہو گیا......

میں راضی ہوں......"

"اب اُس کو راضی کرنا ہے......ہے نا۔"

"مگر وہ پچھوا......"

"خوب خبر لوں گی تمہاری......ذرا آؤ تو سہی......" وہ ہنستی رہیں۔

"اکبر بھائی نہیں بلا سکتا......اُلّو......"

فون رکھ کر فیصل مسہری پر دراز ہو گیا۔ گہرے نیلے نائٹ بلب کی نرم شعاؤں میں کانچ کے جھل مل کرتے لیمپ شیڈ پر ملیحہ کا دروازے پر کھڑا مسکراتا سراپا نظر آیا تو اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے......اُس نے آنکھیں کھول دیں......کہیں سچ مچ......میرا ارادہ......ایسا تو نہیں......

اُس نے مسکرا کر کروٹ لی اور سو گیا۔

......☆☆......

کالج کے بہت سے لوگ کشمیر گئے تھے۔ ہوسٹل کی کچھ لڑکیاں بھی تھیں۔ وارڈن بھی تھیں۔ سب لوگ گلمرگ، یوس مرگ، پہلگام وغیرہ جانے کے پروگرام بنا رہے تھے۔ ملیحہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔ وارڈن نے پوچھا کہ ملیحہ تم کہیں نہیں جانا چاہتیں تو بولی تھی کہ ایسی بات نہیں جہاں آپ کہیں میم، مگر آج میں ریسٹ کرنا چاہتی ہوں۔

عافیہ کو وہ واقعی بے چین سی نظر آئی تھی۔ اُس روز وہ بھی گروپ کے ساتھ مغل باغات دیکھنے نہیں گئی۔ جس گیسٹ ہاؤس میں اُن کو ٹھہرایا گیا تھا وہ جہلم کے کنارے تھا۔ ملیحہ پلنگ سے اٹھ کر

کھڑکی تک آ گئی اور آسمان میں اڑتی ہوئی سفید مرغابیوں کو دیکھنے لگی۔

"اللہ......ابھی تو کتنی Up Set تھیں تم......کہ میں ڈر گئی کہ شاید بیمار ہو......کیا بات ہے......" عافیہ نے حیرت سے کہا۔

"ارے ہاں یار......بیمار ہی تو ہوں بلکہ بے قرار ہوں......" وہ مسکرائی۔

"عافیہ......تمہیں یاد ہے جب ہم پل پار کر کے کنارے کی کسی کچی سڑک سے آ رہے تھے، بازار کی پچھلی طرف سے......؟"

"ہاں......صبح......وین میں نا......ٹورسٹ ریسپشن سنٹر سے آتے ہوئے؟"

ہاں......بالکل......"

"تو؟"

"تو راستے میں......میں نے کنارے پر ایک باغ میں ایک نہایت خوبصورت مجسمہ دیکھا تھا...... عافیہ اتنا حسین......اتنا حسین......کہ......عافیہ میں جب ہی سے بے چین ہوں......وہ مجسمہ وہاں کیسے آیا......کس کا تھا......دیکھو نا کسی کتابچے میں اُس کا ذکر نہیں ہے۔ ان سب میں سے......اُس جگہ کی کوئی نشاندہی بھی نہیں ہے......"

ملیحہ پھر مسہری کے کنارے آن بیٹھی اور ٹورازم ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے جاری کتابچے اپنے سامنے پھیلا کر اُن پر جھک گئی۔ عافیہ بھی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"دیکھو نا......سب صحت افزا مقامات......آثارِ قدیمہ......اونتی پورہ اور پٹن کے کھنڈرات......چشمے......پہاڑیاں......غار......عجائب گھر......مگر وہاں کا......اُس جگہ کا کوئی ذکر نہیں......وہاں جانا ہے مجھے۔ عافیہ......وہ زیادہ دور نہیں ہے......ڈھونڈ لیں گے......" اُس کی آواز میں اس قدر بے قراری تھی کہ عافیہ کھڑی ہو گئی۔

"چلو ڈھونڈتے ہیں......" عافیہ نے پاؤں چپلوں میں ڈالتے ہوئے کہا......"ادھر، ویٹر سے پوچھ لیں گے......ٹیکسی کا انتظام کر دے گا۔"

"چائے آ کر پئیں گے۔" ملیحہ نے چہک کر کہا۔ "تمھیں وہاں بہت اچھا لگے گا عافی۔"

''ٹھیک ہے بھیا۔ چلو۔'' عافیہ مسکرائی۔

ویٹر کو کسی مورتی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ مگر اُس نے یہ ضرور کہا کہ منیجر کو اس بارے میں ضرور معلوم ہوگا۔ منیجر گیسٹ ہاؤس میں موجود نہیں تھا۔

عافیہ نے منیجر کے لوٹنے تک ملیحہ کو چائے پینے پر آمادہ کیا۔ ڈائننگ ہال کے برآمدے میں سے باہر کا دلفریب منظر نظر آ رہا تھا۔

''عافیہ دیکھو تو...... وہ کلس......'' ملیحہ نے ندی کی دوسری طرف کوہِ سلیمان کی چوٹی پر ایستادہ شنکر آچاریہ کے مندر کی طرف اشارہ کیا۔

''دنیا میں...... کیسے کیسے عظیم لوگ آتے ہیں...... عظیم فنکار...... اور چپکے سے چلے جاتے ہیں......'' ملیحہ نے کہا۔

عافیہ چپ چاپ اُس کے چہرے کو تاکتی رہی۔

''چائے اچھی نہیں ہے کیا......'' عافیہ نے مسکرا کر کہا۔

''نہیں یار...... تم بھی حد کرتی ہو......'' ملیحہ نے دونوں ہاتھ میز پر اوندھے رکھ دیئے۔

''بہت بے قرار ہونا۔ مورتی کو دیکھنے کی خاطر......'' عافیہ نے بڑے خلوص سے کہا۔

''ہوں تو...... لیکن مجھے یقین ہے کہ بہت جلد...... وہ مورتی میرے سامنے ہوگی...... دراصل...... عافیہ...... میں یہ سوچ رہی ہوں کہ فن کار بھی تو ایک طرح سے۔ ایک طرح سے عبادت گزار ہوتا ہے...... نہیں؟ فن کی، اپنے فن کی معراج کی تلاش میں جیسے کوئی بزرگ خدا کی تلاش میں۔ یعنی کہ وہ دیکھو...... ایک انسان......'' ملیحہ نے پہاڑی کی طرف ہاتھ اُٹھایا۔ ایک انسان نے ادھر عبادت کی...... دوسرے نے یہ عظیم الشان مندر تراش کر ایک اور عبادت نہیں کی کیا؟ ...... بولو نا......!''

''ہاں...... ایسا بھی کہہ سکتے ہیں......'' عافیہ نرمی سے بولی۔

''نہیں ایسا ہی ہے۔ اصل میں فن کی قدر ہی نہیں ہمارے یہاں......'' ملیحہ کے چہرے پر بے زاری چھا گئی۔

''نہیں ......ایسا نہیں ہے...... میں تو فخر کرتی ہوں اس بات پر کہ تم ...... کہ میری دوست اتنی بڑی کلاکار ہے......'' عافیہ نے فروٹ کیک کی پلیٹ اُس کی طرف سرکائی۔

''اب تم ذرا روحانی غذا کے ذکر کو ملتوی کر کے کچھ اپنے اس پاپی پیٹ کا بھی خیال کرو...... کئی گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا تم نے۔''

منیجر صاحب آئے تو سارا ماجرا سن کر بڑی خوشدلی سے مسکرائے......

''میں سمجھ گیا میڈم آپ تیار ہو جائیں، ابھی چلتے ہیں ہم وہاں۔''

''کیا واقعی ......'' ملیحہ نے خوشی سے چھلکتی ہوئی آواز کی لغزش کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔

''جی ہاں۔ بالکل۔'' منیجر ابرار روانی خود اعتمادی سے مسکرایا کیے۔

''میری یہ وادی بڑی قدیم اور عظیم ہے......'' ابرار کی آواز چھوٹی چھوٹی لہروں سے ٹکرا کر اُبھری...... وہ بڑے سکون سے آسمان کو دیکھ رہے تھے۔ عافیہ نیلے روغن اور سرخ پردوں سے مزئین چھوٹے سے شکارے کا عکس جہلم کے پانی میں دیکھنے لگی۔ ملیحہ نے گردن ادھر ادھر گھمائی۔

''اُدھر پل سے بھی راستہ ہے......مگر یہ Short Cut ہے۔'' اور پھر اس پانی سے گزر جانے کا ایک اپنا ہی لطف ہے جسے صحیح معنوں میں صرف ہمارے اجداد نے ہی محسوس کیا ہوگا۔ سرینگر میں جہلم پر تیس پُل ہوا کرتے تھے۔ مگر یہ پُل کشتیوں کے پُل تھے۔ یعنی ایک کشتی سے دوسری کشتی باندھ کر ایسے ہی سلسلہ دوسرے کنارے سا جا ملتا۔ پہلا لکڑی کا مستقل پُل ہمارے ہر دلعزیز بادشاہ سلطان زین العابدین نے بنوایا تھا اور نام زینہ کدل رکھا گیا۔'' ابرار نے کہا۔

''نہیں ......ایسی کوئی بات نہیں ہے...... یہ تو اور بھی اچھا کیا آپ نے......'' ملیحہ نے نیلے شفاف آسمان کو دیکھا۔

''ایسی تاریخ دنیا کے کسی ملک کی نہیں ہے۔ پانچ ہزار برس پرانی ہسٹری ہے ہمارے پاس۔ میں خود تاریخ کا سٹوڈنٹ رہا ہوں ...... بلکہ نوکری کے ساتھ ساتھ کشمیر کے قدیم فنون پر Ph. D کر رہا ہوں اور اس دوران تاریخ نے مجھ پر ایسے انکشاف کیے کہ...... دنگ رہ گیا...... میں......''

''جیسے......؟''ملیحہ اور عافیہ میں سے کسی نے پوچھا۔

''ضرور بتاؤں گا۔مگر فی الحال ہمیں یہیں اترنا ہے۔''

کشتی بان شکارے کو کنارے لگا کر اُتر گیا اور جہاں پانی کنارے کی مٹی میں ہلکے ہلکے گھُلا ہوا نظر آرہا تھا، وہاں وہ پنڈلیوں تک پانی میں کھڑا ہو گیا۔

''اب آپ آسکتے ہیں......آرام سے......''اُس نے کشتی کی نوک سے بندھی رسی کو کھینچ کر مضبوطی سے تھام لیا۔ملیحہ اور عافیہ ذرا ذرا جھولتی ہوئی کشتی میں ڈگمگاتی سی اُتر آئیں۔

کنارے کی منڈیر ختم ہوتے ہی سڑک تھی۔سڑک کے اُس پار ایک پرانی دو منزلہ عمارت تھی جس کی دیواروں پر سفیدی کی گئی تھی۔عمارت اور باغیچے کو ایک دوسرے سے جوڑتے ہوئے بڑے سے پھاٹک پر ایک محافظ کھڑا تھا۔

''یہ رہی آپ کی منزل......''ابرار وانی نے مسکرا کر پہرے دار کو دیکھا اور پھاٹک میں لگا کواڑ وا کیا۔

ملیحہ اور عافیہ اندر داخل ہوئیں تو باغیچے میں نصب زمانہ قدیم کی کچھ مورتیوں اور پتھر کے کچھ اوزاروں اور ہتھیاروں کے علاوہ چنار کے عمر رسیدہ درختوں کی ٹہنیوں میں چھپتے پھرتے طیور کی چہکار نے اُن کا استقبال کیا۔

''یہی مورتی تھی نا میڈم......''ابرار نے سرمئی پتھر کی ایک نہایت قدیم مورتی کی طرف دیکھا......سپاٹ سی مورتی کا صرف دھڑ موجود تھا۔

عافیہ نے بے یقینی سے ملیحہ کی جانب دیکھا کہ اپنی دوست کے مزاج سے وہ بخوبی واقف تھی۔

''نہیں نہیں......''ملیحہ نے تڑپ کر دائیں بائیں دیکھا۔

''یہ......یہ وہ جگہ نہیں ہے......''وہ بولی۔

''یہی تو ہے عجائب خانہ...... جہاں آپ کو ماضی قریب اور ماضی بعید کی کئی چیزیں نظر آئیں گی۔آپ آیئے۔اندر چلتے ہیں......''

وہ لوگ عمارت میں داخل ہوئے۔ ملیحہ بے دلی سے آگے بڑھنے لگی۔ پھر اندر پرانی اور بہت پرانی اور بہت ہی پرانی چیزوں نے اُس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی کہ پہلے ہی ہال میں پتھر کی قدیم مورتیاں کچھ سالم اور کچھ نیم سالم اپنے اپنے دور کی نمائندگی کررہی تھیں۔ دھات اور مٹی کے قدیم سکے، زیورات اور ملبوسات، حنوط شدہ چرند و پرند، بوتلوں میں بند سانپ، نیولے، قدیم ترین ہاتھی کی چوڑی سی دیو قامت کھوپڑی کا آدھا حصہ (عجائب گھر کے گائڈ نے بتایا کہ اس کھوپڑی کا باقی نصف جنوبی افریقہ کے کسی عجائب خانے میں محفوظ ہے)۔ کتنے عجب ہیں دنیا کے معاملات۔ ملیحہ نے سوچا۔ آبی اور زمینی نقشے، راجاؤں، بادشاہوں کے معاہدے، لباس، ہتھیار، ازمنۂ قدیم وقت کو پھلانگ کر ایک جگہ اکٹھے ہوگئے تھے۔ ملیحہ سوچتی رہی۔ رہ رہ کر اُسے وہ مورتی بھی یاد آجاتی۔ آخر کہاں دیکھا تھا اُس نے اُسے......؟

عجائب خانے سے لگی داہنی جانب ایک لائبریری تھی، جس میں نادر کتب کا ذخیرہ بھی تھا۔ منیجر اُن کو لائبریری دکھانے بھی لے گیا اور اپنی اور ان کی پسند کی چند کتابیں انہیں اپنی ممبر شپ پر دلوادیں۔

"ہوسکتا ہے کہ ان تاریخ کی کتابوں میں...... آپ کو...... آپ کو ایسی ایسی چیزوں کے اشارے ملیں کہ آپ حیرت زدہ رہ جائیں...... بلکہ...... میں تو آپ لوگوں کو کچھ ایسے مقامات دکھانے لے جاؤں گا جو غیر معروف ہیں مگر نہایت اہم...... میڈم سے بات کروں گا۔ آپ لوگ کل جھیلیں باغات وغیرہ دیکھ لیں پھر میں کھنڈرات کی سیر کراؤں گا...... عین ممکن ہے کہ آپ کی کھوئی ہوئی مورتی آپ کو وہیں کہیں مل جائے......" وہ مسکرایا تو عافیہ خوشدلی سے اور ملیحہ بے دلی سے مسکرائی۔

اگلے روز اونتی پورہ اور پٹن کے کھنڈرات دیکھنے کے بعد کارواں ابرار وانی کی نگرانی میں اندرونِ شہر کی جانب روانہ ہوا، جہاں خانیار کے مقام پر روضہ بل کہلانے والا ایک قدیم مقبرہ تھا۔ مقبرے پر زیارت حضرت یوز آصف کندہ تھا۔ منیجر نے بتایا کہ ایک روایت یہ بھی چلی آرہی ہے کہ یہ تربت یسوع مسیح کی ہوسکتی ہے جس پر سولی کے نشان لیے دو پاؤں بھی تراشے گئے ہیں

بلکہ اُس نے یہ تک کہا کہ وادی کے بیتھ پورہ کے علاقے میں ایک مقام قدیم زمانے سے حضرت موسیٰؑ کا مزار کہلاتا رہا ہے......واللہ اعلم......لڑکیاں سنتی رہیں۔اِدھراُدھر دیکھتی رہیں۔

......☆☆......

رات کو سب لوگ تھک کر سو چکے تھے۔

وہ مورتی کہاں دیکھی تھی۔ملیحہ کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔وہ کتابیں الٹتی پلٹتی رہی۔

تاریخ گواہ ہے کہ پچھلے وقتوں میں تجارت پیشہ لوگ مغرب سے مشرق اور مشرق سے مغرب آتے جاتے رہے تھے زمین یا سمندری سفر کر کے۔صدیوں تک یہودی بھی کشمیر آتے رہے تھے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کشمیر میں قبریں یہودیوں کے انداز میں یعنی مشرق سے مغرب کی جانب بنائی گئی ہیں بلکہ ان پر عبرانی تحریر بھی ہے۔کشمیر کے گوجر خود کو اسرائیل کی اولاد بتاتے ہیں۔ کئی اشیاء جیسے لباس،ٹوپی،ناؤ کھینے کا چپوّ وغیرہ اب بھی اسرائیل میں مستعمل چیزوں سے مطابقت لیے ہوئے ہیں۔یہاں تک کہ کشمیر کی پرانی عمارات میں یہودیوں کی تعمیر کی طرز پر ہی یعنی زینے مغرب کی طرف سے تعمیر کیے گئے ہیں۔پڑھتے پڑھتے ملیحہ کی دلچسپی بڑھنے لگتی مگر کچھ پل کے علاوہ وہ اپنا دھیان مورتی سے ہٹا نہیں سکی۔

انسانی تاریخ کس قدر دلچسپ ہوا کرتی ہے......اور اگر؟......اور اگر؟......اگر فن......نہ ہوتا......یعنی اگر فن کار نہ ہوتا......ملیحہ سوچتی۔

یعنی......کمہار نہ ہوتا......تو موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی......اور اِنکا کی تہذیب......کیسے واضح ہوتی......برتن ساز......فن کار کی طرح ہی......مجسمہ ساز کی ہی طرح اہم ہوتا ہے......

اُس نے کتاب کا ورق پلٹا۔

ان مقامات کے ناموں کی فہرست درج تھی جن کا ذکر انجیلِ مقدس اور توریت میں کیا گیا ہے اور جو انہی ناموں سے وادی میں بھی موجود ہیں۔جیسے مٹن،نابو،ڈور،اُڑی وغیر ہیں۔کچھ جوں کے توں اور کچھ غالباً بگڑ گئے تھے۔جیسے گول گوت سے گلگت،ہاروان سے ہارون۔دنیا کے شمالی خطوں سے لوگ کشمیر آئے اور یہاں کی زبان میں فارسی،عربی،سنسکرت،عبرانی اور نہ جانے کون کون

سے الفاظ ملے۔اُس سے یہ......اس سے وہ۔

ملیحہ ورق الٹتی گئی......ان محققین کی قوم بھی عجیب وغریب ہوتی ہے۔کسی چیز کو کسی سے ملانا چاہیں تو ایسے ایسے جواز پیش کرتے ہیں کہ ذہن سوچ سوچ کر پریشان ہو اُٹھے......

کئی فرقے خاص موقعوں پر سنکھ بجاتے ہیں جیسے ہندو اور یہودی......اور کچھ اور قبائلی بھی......کبھی کبھی کتنی مطابقت......کتنی مماثلت ہوتی ہے......ملیحہ سوچتی۔ پھر تو......دیکھا جائے تو وسط ایشیائی ممالک کے باشندوں کی شکلیں کتنا ملتی جلتی ہیں ایک دوسرے سے......لباس بدل دیں تو شناخت بدل جائے۔

وہ بڑی دیر بعد مسکرائی۔اُس نے کتاب بند کردی۔کہتے ہیں براِعظم الگ ہونے سے پیشتر جڑے ہوئے تھے۔جبھی تو ایک خطےّ کی تہذیب کی کڑی ہزاروں میل دور کسی دوسرے خطے کے ساتھ ملتی دکھائی دیتی ہیں۔جیسے Mesopotamia اور Turkmania کی تہذیب...... سندھ کی تہذیب سے ملتی ہے......وہاں ایک سے دیوتا پوجے جاتے ہیں......دنیا بڑی دلچسپ جگہ ہے۔ایک کونے کے انسان کے ساتھ دوسرے کسی کونے کے باسی کی کوئی نہ کوئی مطابقت نکل ہی آتی ہے......بس ذرا تحقیق کی ضرورت ہے...... یہ بھی بڑا لبھاونا کام ہے مگر...... یہ تحقیق...... قطعی راست باز ہو تو......

کشمیر تم بڑے خوبصورت، دل پذیر و ہوش ربا ہو۔ان نیم بوسیدہ کتابوں میں تم نے علم کے خزانے چھپا رکھے ہیں۔محفوظ رکھنا اپنے اس علم کو۔اردو کی ان نایاب کتب کو آثارِ قدیمہ نہ ہو جانے دینا۔عبرانیٔ زبان کی طرح، جسے لوگوں نے گھروں میں زندہ رکھا اور اب کوئی چالیس پینتالیس برس سے باقاعدہ اس زبان کو صفحۂ قرطاس پر اُتارا جارہا ہے۔تم بھی اردو سے اپنی محبت کم مت کرنا کہ اس میں علم کے خزانے چُھپے ہیں۔دین اور دُنیا کے عظیم حقائق پنہاں ہیں۔اے خلدِ بریں!اور کیا کیا پوشیدہ رکھا ہے تم نے اپنے دامن میں۔اور......اور یہ مورتی کہاں چھپا رکھی ہے آخر؟

وہ مورتی کہاں ہے......

ندی کے کنارے کے سب مقامات دیکھ لیے......

ملیحہ کی تھکی تھکی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

کہاں ہو تم......عجائب خانہ چھان مارا۔ اندر باہر سے۔

ملیحہ کو نیند کے جھونکے آنے لگے۔

کس نے تراشا ہوگا اُسے۔ ملیحہ نے آنکھیں بند کیں تو لکڑی کے دستے والی سٹیل کی نازک ہتھوڑی اور چھوٹی سی چھینی اس کے ہاتھ میں آگئی......

اُسے یاد آیا جب اُس نے بس کی کھڑکی سے مورتی کو دیکھا تھا تو اُسے ایسی ہی گہری نیند آیا چاہتی تھی۔

وہ بڑے سے پہاڑ کے دامن میں، چٹان سے کاٹ کر پہلے سے الگ کی گئی مرمر کی قد آدم سِل پر ضرب لگانے لگی۔ کس بھلے آدمی نے قدِ آدم سِل کو اس کی خاطر پہلے ہی چٹان سے کاٹ کر الگ رکھا تھا۔ وہ مسکرائی۔ کتنی آسانی سے تراش رہی تھی وہ مورتی کو......سفید پتھر ٹوٹ ٹوٹ کر اِدھر اُدھر چمکتے بکھرتے لطیف سی موسیقی چھیڑ دیتے......چھینی پتھر پر ایسے پھسل رہی تھی جیسے پتھر موم ہو گیا ہو۔

وہ مورتی تراشتی رہی اور سوتی رہی۔

صبح نیند کی گرفت سے آزاد ہوتے ہوتے اچانک اُسے یاد آیا کہ اُس نے مورتی کے پاس صلیب کا نشان دیکھا تھا۔ اُس نے کمرے سے فون کر کے یہ بات منیجر کو بتائی تو جواب نہایت حوصلہ بخش ملا۔

وہ عیسائی فرقے کا ایک وسیع قبرستان تھا جس میں صدیوں پرانے چنار پہرے داروں کی طرح ایستادہ تھے......کچھ مقبرے بھی صدی بھر پہلے کے تھے۔ لمبی لمبی قبریں۔ کہیں صلیب کے نشان......کہیں بڑے چھوٹے کتبے، ملیحہ آگے چل رہی تھی۔ آس پاس......اوپر دیکھتی ہوئی......چناروں پر چڑیاں بول رہی تھیں۔

قبرستان بھی عالی شان ہوا کرتے ہیں۔

اُس نے نہایت سکون سے سوچا تھا۔

وہ کچھ پل کے لیے رک کر ایک کتبے کو دیکھنے لگی...... جس پر Anchor کا نشان بنا تھا۔ پھر ٹھٹھک کر آگے بڑھ گئی۔ واپسی پر دیکھے گی اسے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی آگے ہی آگے جا رہی تھی...... قبرستان کے دوسرے کنارے کی طرف۔ اس اندازے سے کہ صبح وین سے نظر آنے پر وہ مجسمہ سڑک سے کتنی دوری پر رہا ہوگا جو وہاں سے دکھائی دے گیا تھا۔ وہ عافیہ سے کئی سو قدم آگے نکل گئی تھی۔

''عافیہ......'' ملیحہ کی بے قرار آواز سن کر عافیہ نے دیکھا کہ وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ کر نہایت انہماک سے کچھ دیکھ رہی ہے۔ عافیہ بھاگ کر اُس کے پاس پہنچ گئی...... اور دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

وہ ایک خاتون کا مجسمہ تھا۔ جو پچیس برس کی عمر میں انتقال کر گئی تھی۔ اُس کے لیفٹیننٹ کرنل شوہر نے اپنی نو عمر شریکِ حیات کی یاد میں وہ مجسمہ بنوایا تھا۔ عیسائی دلہن کے لباس میں۔ حسن کا ایک مکمل شاہکار...... وہ ہاتھوں میں پھول لیے سر داہنی جانب کو ذرا سا جھکائے بیٹھی تھی۔ سنگِ مرمر سے تراشیدہ اس مجسمے کا رنگ سفید تھا۔ سنگ تراش نے آنکھوں کی پتلیوں کو جس مہارت سے تراشا تھا وہ لاجواب تھی...... پتلیوں کو نہایت مبہم سا نقش کر کے انہیں ہلکے رنگ کی مخصوص مغربی آنکھوں کی صورت دے دی تھی۔

ڈھیلی ڈھالی عبا کے شکنوں میں سے جھانکتا چھپتا حسین سراپا زندہ زندہ سا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی اُس کا آنچل ہوا کے جھونکے سے لہرا اُٹھے گا۔ بغیر چھوئے یقین کرنا مشکل لگتا تھا کہ یہ لباس، یہ اوڑھنی، یہ حُسن صرف پتھر ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

ملیحہ جانے کہاں کھو چکی تھی...... وہ کئی بار دیکھنے کے بعد بھی نئے سرے سے اُسے کسی گوشے سے دیکھنا شروع کرتی۔ اس کا جی نہیں بھرتا تھا۔ عافیہ کبھی مجسمے اور کبھی ملیحہ کو دیکھتی کہ ملیحہ خود پتھر کی مورت سی بن کے رہ جاتی۔ اپنے آپ میں ایک مجسمہ ہو جاتی۔ پھر وہ زمین پر بیٹھ گئی اور مجسمے کو دوبارہ دیکھنا شروع کیا۔

قبر پر ایک چبوترہ تھا سنگِ مرمر کا اور اُس چبوترے کے اوپر اس سے چھوٹا دوسرا چبوترہ۔ دوسرے چبوترے کے ساتھ مرمر کی ہی بڑی سی صلیب لگی تھی۔ پہلے اور دوسرے چبوترے کے سامنے والی طرف اوپر سے نیچے تک انگریزی میں عبارت درج تھی۔ ملیحہ نے اسے ایک بار پھر پڑھا:

IN LOVING MEMORY OF MABEL EMILY,

THE DARLING WIFE OF LIEUT. COL. J. A. CUNNINGHAM.,

WHo DIED AT SRINAGAR

20 JULY 1904, AGED 25 YEARS

اوپر کے چبوترے کی داہنی جانب کونے پر صاحبۂ قبر خود بیٹھی تھی...... اپنی ہی تربت پر، بالکل قدِ آدم اور مکمل...... اُس کا آنچل سے آدھا ڈھکا سر، کراس کے داہنے کونے کے بالکل قریب تھا۔ دوپٹے کا باقی حصّہ اس کے داہنے شانے سے ہوتا ہوا اُس کی عبا سے لگا، کمر سے ہو کر زمین تک پھیلا چلا گیا تھا۔ چپلیں پہنے اُس کے خوبصورت پاؤں ذرا ذرا سے جھانک رہے تھے۔ اُس نے داہنے ہاتھ میں زیتون کی شاخوں اور پھولوں سے گندھا چھوٹا سا دائرہ تھام رکھا تھا جو کبھی Wreath بنا اُس کے آنچل سے ڈھکے سر پر ٹھیک بیٹھتا ہوگا...... پھولوں کے تاج کی صورت۔

میبل ایمیلی! کس کو دو گی تم یہ پھولوں کا ہار۔ یہ شاخِ زیتون جس پر کبھی خزاں نہ آئے گی، جو قیامت تک نہ مرجھائیں گی...... میبل ایمیلی! تم کیوں مر گئیں...... اتنے حسین لوگ کبھی مرتے ہیں کیا...... مگر...... تم تو زندہ ہو...... تم قیامت تک زندہ رہو گی...... تمہیں کسی عظیم فن کار نے ابدی حسن عطا کر دیا ہے۔ تم سے تمہارا حسن وقت بھی نہیں چھین سکے گا۔ فن اُس عظیم سنگ تراش کو سلام کرتا ہے......

ملیحہ کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ اُس کی آنکھوں کی پتلیاں نہایت بے قراری سے مجسمے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"کون ہوگا یہ عظیم فن کار...... عافیہ...... دیکھو...... دیکھو...... فن یہاں ختم ہو جاتا ہے...... اس سے بہتر کون بنا سکتا ہے کوئی مورتی ایسی...... کہ یوں...... یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی اٹھ کر

کسی طرف چل پڑے گی۔ قیامت تک زندہ رہنے والی یہ دلہن...... یہ اَمر دُلہن...... دیکھو تو...... زندہ ہے...... یہ ہونٹوں کی ابدی مسکراہٹ...... یہ گردن کا شرمیلا خم...... یہ سمٹے سمٹائے انداز میں کونے پر ذرا سا ٹک کر بیٹھ جانا...... اِسے کون مرحومہ کہے گا...... محبت نے اسے لافانی کردیا ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل جے۔اے۔ کننگھم جانے کہاں مٹی میں مٹی ہوگیا ہوگا اپنی محبت کو امر کرکے۔ مگر اس فن کار کا تو کوئی نام بھی نہیں جانتا...... کیا یہ کسی تاج محل سے کم ہے......؟ مہابلی پورم، ایلیفینٹا، یا اجنتا، الورا کے کسی فن پارے سے......؟

عافیہ...... اس فن کار کے انگوٹھے قلم تو نہیں کر دیئے ہوں گے نا؟

کون ہوگا یہ سچّا فن کار...... عافیہ تربت پر لکھی کہانی جھوٹی ہے......"

وہ لرزتی ہوئی آواز میں کہتی گئی...... "سچ تو صرف یہ فن پارہ ہے"۔

وہ زمین سے اٹھی اور دوسرے پہلو سے مجسّمے کو دیکھنے لگی...... اب وہ مسکرا رہی تھی...... مگر اگلے ہی پل پھر اُداس ہوگئی۔

"عافیہ...... کون ہوگا وہ...... اور کیا کیا تخلیق کیا ہوگا اُس کے ان سونے کے ہاتھوں نے؟"

وہ مجسّمے کو کئی منٹ تک بائیں جانب سے گھورتی رہی۔

"اسی لیے کہتے ہیں نا...... کہ فن کبھی نہیں مرتا...... یہ سنگ تراش اس مجسّمے میں حیات ہے...... ہے نا...... دیکھو عافیہ میں اُس کے ہاتھوں کو دیکھ رہی ہوں جو اس لڑکی کے حسن کے پرتو میں زندہ ہیں...... جو...... جو تقریباً سو سال سے اس خاموش قبرستان میں بے شمار قبروں کے درمیان اکیلی زندہ وجاوید اس قبر کے کونے پر بیٹھی ہے...... مگر...... عافیہ یہ مجسمہ ہی تو شناخت ہے اس عظیم فنکار کی...... اُس کا اس سے بڑھ کر اور کیا تعارف ہوسکتا ہے کہ وہ اس شاہ کار کا خالق ہے جس کی عجیب سی کشش مجھے یہاں کھینچ لائی۔ میں تو جانتی بھی نہ تھی کہ یہ قبرستان ہے۔ میں سمجھی شاید عجائب گھر کا...... کوئی حصّہ ہوگا...... عافیہ...... میں بھی...... تم دیکھنا اپنے مجسّموں میں زندہ رہوں گی۔ بھلے ہی کوئی میرا نام نہ جانتا ہوگا۔ سو سال بعد شاید...... میرے فن پارے بھی کسی فن کے پرستار کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائیں گے...... کوئی ایسے ہی میرے بارے میں سوچے

گا...... جیسے ...... جیسے میں۔" اس کی کانپتی ہوئی آواز گلوگیر ہوگئی۔ عافیہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"چلیں......" اس نے آہستہ سے کہا تو وہ کھڑی ہوگئی۔

اتنے عرصے میں پہلی بار اس نے اس مجسمے سے نظریں ہٹائیں اور دھیرے دھیرے چلنے لگی۔ دو قدم چل کر ہی وہ ٹھٹکی اور ایک اور قبر کے پاس رکی جسے جاتی بار اس نے دیکھا تھا...... اور اچھی طرح دیکھنا چاہ رہی تھی۔ وہ قبر کا کتبہ پڑھنے لگی۔ عافیہ نے بھی اسی کی طرح جھک کر دیکھا۔ لوحِ تربت پر جہاز کے لنگر کا نشان بنا ہوا تھا۔ شاید کسی جہاز ران کی قبر تھی:

IN VERY LOVING MEMORY OF MABEL ELLEN BROADWAY

OUR DARLING MAISIE

BORN MAY 25TH 1875

FELL ASLEEP ON JUNE 9TH 1901

تم سمندر پار سے یہاں مرنے کیوں آئے تھے...... اتنی کم عمر میں......

ملیحہ نے نام کے نیچے لکھی عبارت پر نظر دوڑائی۔ رومن تحریر میں پتھر پر اُبھرے ہوئے حروف:

Passing out of shadow

Into a purer light

Stepping behind the curtain

Getting a clearer sight

Passing out of the shadow

Into eternal day

Why do we call it dying

This sweet going away

سویٹ گوئنگ اوے......؟...... ہاں...... کیوں نہیں...... ہر سوچ کے بوجھ سے آزادی...... یا ...... فرار...... یا......

وہ پھر زمین پر بیٹھ گئی۔

"عافیہ...... دیکھو تو فن کا خزانہ ہے یہ جگہ...... یہ محبت اور جدائی کے نغمے...... یہ شاندار

لکھاوٹ......دل کیسے کیسے دھڑکے ہوں گے ان حادثوں پر......لوگوں نے کیسے کیسے سہے ہوں گے یہ المیئے۔ کبھی غم سے کبھی بہادری کا مظاہرہ کرکے......''

اُس نے عافیہ کا بازو کھینچ کر اسے نیچے بٹھا دیا......عافیہ کے سامنے سے ہٹنے سے ایک اور عبارت نظر آئی جس پہ مرنے والے کے علاوہ اُس کے اُس وقت زندہ والدین کا نام بھی کندہ تھا۔ صلیب کے نشان کے نیچے کتبے پر بیٹے کا تعارف درج تھا:

CAPTAIN MAREUS WILLIAM DELAPOER BERESLORD.

3RD BATTALION RIFLE BRIGADE

BORN MAY 6TH 1862,

DIED SRINAGAR AUGUST 8TH 1900.

قبر کی چوڑی سی سِل کے اوپر اُس کے غمزدہ والدین نے اپنے نام لکھوائے تھے:

THIS CROSS IS CREATED BY

SORROWING PARENTS

GEORAGE D. BERESLORD

MARY A. BERESLORD

انسان کیا کیا کرتا رہتا ہے......مر جاتا ہے تو......سب ختم...... بیرس لارڈ کبھی اپنے اڑتیس سالہ جوان کیپٹن میں اپنا مستقبل دیکھتے ہوں گے......پھر اُس کے نام کے ساتھ اپنا نام لکھ کر وہ بھی چل دیئے......اُف......قدم قدم پر کتنے المیے......کتنی کہانیاں کتنی داستانیں......کتنے غم......

ملیحہ نے قبر سے نظریں ہٹا کر اوپر چنار کی ٹہنیوں کو دیکھا۔

دیوار کی اُس طرف سے باتیں کرنے کی آوازیں آئیں تو وہ دونوں اپنی جگہ سے اٹھیں۔ کسی نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔ عافیہ آگے آگے اور ملیحہ اُس کے پیچھے چل رہی تھی...... پھاٹک سے نکل کر انہوں نے دیکھا کہ اس طرف کا بھی آدھا حصہ قبرستان کی ہی نئی توسیع تھا۔

انگریزی حکومت کے بعد سے ادھر اِکّا دُکّا میّت ہی لائی جاتی تھی کہ اس فرقے کے لوگ وہاں نہ کے برابر تھے بلکہ اُس دوران بھی بہت کم۔

اس حصے میں ایک طرف دو لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور ایک تندرست نوجوان سفید برق

بنیان پہنے آدھی سے زیادہ قبر کھود چکا تھا کہ اُس کی ٹانگیں نظر نہیں آ رہیں تھیں۔اس حصے میں بہت کم قبریں تھیں۔ اُن دونوں نے کبھی ایسا منظر نہ دیکھا تھا...... بھلے ہی اس ذکر سے کبھی ان میں سے کسی نے خوف محسوس کیا ہو مگر اس وقت ماحول اس قدر پُر سکون سا تھا کہ وہ سارا منظر ایک حقیقت سے زیادہ اور کوئی اثر نہ رکھتا تھا......

''کس کا انتقال ہوا بھیا......'' ملیحہ نے یوں ہی دریافت کیا تھا۔

''کانوینٹ کی......ایک سینئر ٹیچر کا انتقال ہو گیا ہے......''

چوکیدار نے بتایا تھا۔

بعد میں عافیہ نے جب بھی یہ واقع دہرایا تو اپنی حیرت کا اظہار ضرور کیا کہ اُس دن وہ اُس سارے منظر سے ڈری کیوں نہ تھی...... بلکہ بہت برس بعد دوبارہ جب عافیہ کشمیر گئی تھی تو اُس علاقہ سے اُس کا پھر گزر ہوا تھا۔ جب بھی گرمیوں کا ہی موسم تھا۔

اُس وقت بھی اُس نے بالکل ویسا ہی منظر دیکھا تھا تو قریب چلی گئی تھی۔ اُس دن اُس کا شوہر ظہیر الدین بھی ساتھ تھا۔

''کس کا انتقال ہوا ہے......'' جانے اُس نے کیوں پوچھا تھا۔

''مشن اسکول کے صاحب تھے......اولڈ بوائے......غلام رسول......تبدیلی کے بعد بھی نام نہیں بدلا تھا انہوں نے۔ جہاز سے آ رہی ہے ان کی میت......وصیت کر گئے تھے کہ سرینگر کے قبرستان میں دفنایا جائے انہیں[1]......'' بوڑھے چوکیدار کے پاس بیٹھے ایک شخص نے کہا تھا۔ چوکیدار نے مٹّی کے حقّے میں لگی بانس کی نَے منہ سے نکال کر اثبات میں سر ہلایا تھا اور نَے

---

[1] سرینگر میں لال چوک اور دریائے جہلم کے درمیان کا یہ علاقہ سلاطین کشمیر کے وقت سے آبی گزر کہلاتا ہے۔ چونکہ نقل و حمل کا واحد وسیلہ آبی راستہ ہوا کرتا تھا اس لیے وہاں سے گزرنے والی کشتیوں سے اس مقام پر محصول لیا جاتا تھا۔ قبرستان ٹھیک مشن سکول کے سامنے واقع ہے جہاں ۲۰۰۲ء کا یہ واقعہ قلمبند کیا گیا ہے۔ راقم الحروف کو ۲۰۰۳ء میں اس بات کا پتہ چلا کہ غلام رسول کے بیٹوں نے انھیں وہاں دفن نہ کرنے دیا اور وہ اپنے آبائی قبرستان نگرمل باغ میں دفنا دیے گئے۔ پہلے کھودی گئی قبر پاٹ دی گئی تھی۔

دوبارہ منہ میں دبالی تھی۔

اُس دن شہر کے انگریزی سکولوں میں اچانک آدھے دن کے بعد کی چھٹی کا اعلان کردیا گیا تھا۔

عافیہ جب راستے میں شوہر کو کچھ برس پہلے کا ایسا ہی واقعہ سنا رہی تھی تو سامنے سے اچانک چھٹی ہوجانے سے خوش بچے، دنیا کی بے ثباتی سے بے خبر اپنی اپنی معصومیت میں الجھے اپنی اپنی منزلوں کی طرف جارہے تھے۔

......☆☆......

مجسمے کو دیکھ آنے کے بعد اُس رات جب ملیحہ سونے کے لیے لیٹی تھی تو عافیہ نے محسوس کیا تھا وہ اپنے بستر میں چھپی چپکے چپکے رو رہی تھی۔ عافیہ نے ہاتھ بڑھا کر درمیانی تپائی پر رکھا ٹیبل لیمپ آن کیا......اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کیوں......رو رہی ہو......'' اُس نے پتلی سی ریشمی رضائی میں چھپا ملیحہ کا شانہ ہلایا......تو ملیحہ نے رضائی میں ناک تک چھپا ہوا اپنا چہرہ باہر نکالا۔

''گھر والے شادی کرانے پر بضد ہیں۔ شاید آگے پڑھنے تک نہ دیں......اور میرا شوق......؟'' وہ رو چکی تھی۔ آہستہ سے بولی ''جانے کون لوگ ہوں گے۔''

''سب ٹھیک ہوجائے گا...... پریشان کیوں ہوتی ہو......'' عافیہ نے روایتی سی تسلی دیتے ہوئے سوچا تھا کہ شاید سچ مچ سب کچھ ٹھیک ہوگا......مگر اُس کے بعد سب کچھ خراب ہوگیا تھا۔

......☆☆......

یہ باتیں عافیہ نے بہت پہلے کبھی سنائی تھیں فیصل کو...... کچھ علم اسے ملیحہ سے مل کر ہوا تھا۔ کچھ اس نے خود تصور میں دیکھ لیا تھا۔

وہ صبح صبح اپنے بستر پر دراز سوچ رہا تھا۔

اصغر علی......تمہاری لاپروائیوں سے حسن کا یہ مجسمہ......فن کی یہ سرتاپا مورت ٹوٹ نہ جائے......اصغر علی...... پیدائشی چغد!

اُس کی آنکھوں میں اکبرعلی کی بڑے سے نگ والی انگوٹھی گھوم گئی۔

اگر یہ مرگئی تو تم Mabel Emily کے جیسا اس کا مجسمہ بنواؤ گے؟۔تم تو ایک قدآدم تصویر نہ بنواؤ اس کی...... چغد کہیں کے......نیلم پہنتا ہے......اور ہیرے کو نہیں پہچانتا۔

''......اصغرعلی......''اُس نے اونچی آواز میں ہنستے ہوئے دانت پیس کر کہا اور بستر سے اچھل کر فرش پر کوُدا اور باتھ روم میں گھس گیا۔

پچھلے پیر کے دِن سے اس جمعے تک ملیحہ سے رابطہ ہی نہ ہوا تھا کہ وہ کام میں بے حد مصروف رہا۔نہ ہی ملیحہ نے کوئی فون کیا تھا۔اگلے پیر کو وہ ملیحہ کے یہاں رات کے کھانے پر مدعو تھا۔آج شام میں مصروفیت کچھ کم تھی اُس نے فون کیا۔

''ہیلو......''ملیحہ کی اُداس آواز بمشکل نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''کیا ہوا......؟؟''وہ تشویش سے بولا۔

''کیسے ہو......تم؟''

''آپ اس قدر اُداس کیوں ہیں......؟''

''اداسی میرے ساتھ......ہی رہتی ہے......''اُس نے مزید اداسی سے کہا۔

''میں......آجاؤں......؟''

''تمہارے آنے سے......اداسی ختم ہوجائے گی کیا......؟''

''میں ختم کردوں گا اداسی آپ کی......پھر......کوشش تو کر ہی سکتا ہوں نا......''

وہ خاموش رہی۔

''آجاؤں کیا......بولیے نا......پلیز......؟''

''اچھا......ٹھیک ہے......جب آنا چاہتے ہو......تو......''

......☆☆......

اُس کی آمد کی اطلاع پر ملیحہ ڈرائنگ روم میں آئی۔فیصل اسے دیکھ کر سلام کرنا بھول گیا۔ ملیحہ بہت نحیف نظر آرہی تھی۔اُس کے ماتھے کی داہنی جانب ضرب کی شکل میں روئی کے چھوٹے

سے پھائے پر بینڈ ایڈ چپکی تھی۔

''یہ کیا ہو گیا......آپ کو......؟''

''بیٹھو......چائے کے لیے......کہتی ہوں......''ملیحہ کا سانس بے ترتیب سا چل رہا تھا آنکھیں پوری طرح وا نہیں ہو رہی تھیں۔

''نہیں......میں کہتا ہوں چائے کے لیے......آپ پلیز بیٹھیے......''

وہ کھڑا رہا......ملیحہ بیٹھی تو وہ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا......پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''آپ کو نیند آ رہی ہے......آرام کریں گی نا۔'' وہ کئی لمحے مسلسل ملیحہ کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

''نہیں......بہت دن سے......آرام ہی کر رہی ہوں۔''ملیحہ نے بشاشت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

''کیا نیند کی......گولیاں؟''

''نہیں......اُس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کچھ ایسی......میں زیادہ چوٹ لگنے کے بعد......غنودگی کے سے عالم میں......رہتی ہوں......کئی روز تک......''

''یعنی؟ مطلب......رہتی ہیں......واقعی کیا......کیا چوٹ لگانا سچ مچ آپ کا مشغلہ ہے......؟ ......یوں کوئی......ایسی حالت بنا دیتا ہے کوئی اپنی......بالکل زرد ہو گیا ہے چہرہ آپ کا......''فیصل کی آواز میں رنج شامل ہو گیا تھا۔

......☆☆......

دیوار کی گھڑی نے سنگیت چھیڑ دیا اور ساتھ ہی دروازے کی گھنٹی بجی۔ لمبی لمبی تین گھنٹیاں بلکہ آخری گھنٹی پہلی دو گھنٹیوں سے زیادہ لمبی۔ ملیحہ نے تھکی تھکی گردن کھڑکی کی طرف گھمائی جو سامنے کے برآمدے میں کھلتی تھی اور پھاٹک کی سیدھ میں تھی۔

اکبر علی اندر داخل ہوئے، ان کے بھورے رنگ کے سوٹ پر لمبی کالی دھاریاں تھیں اور سفید رنگ کی قمیض پر زرد ٹائی تھی جس پر یورپ کے کسی ملک کے پرچم کا ڈیزائن تھا۔

کوٹ کی اوپری جیب میں سے چشمے کے سنہرے قلم نما فریم کا اوپری حصّہ جھانک رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی انگلیوں والے ہاتھ میں چھوٹا سا روپہلا موبائل فون تھا۔

''السلام علیکم......'' فیصل نے نشست سے اٹھ کران کا جائزہ لیا۔

''وعلیکم۔کہاں رہتے ہو بھائی......؟'' وہ اس کے سامنے تین نشست والے صوفے کے عین درمیان میں گھٹنے دور دور کر کے بیٹھ گئے اور ٹائی ڈھیلی کرنے لگے۔

''بہت سخت گرمی پڑ رہی ہے باہر......اندر اے۔سی میں کسی کو کیا ہوگا احساس......گرمی کا......'' انہوں نے کنکھیوں سے بیوی کو دیکھا اور چہرہ فیصل کی طرف کیے بیوی کی طرف وہ ہاتھ بڑھادیا جس میں انہوں نے ٹائی تھام رکھی تھی۔ملیحہ نے چپکے سے ٹائی لے کر صوفے کے بازو پر رکھ دی۔

تمہیں......کس نے کہا تھا......اصغر علی......اس گرمی میں سوٹ ٹائی پہن کر جانے کے لیے کس نے کہا تھا......احمق کہیں کے......

فیصل نے اپنے آپ کو کہتے سنا تو پل بھر کے لیے ملیحہ کی طرف اُبھرتا ہوا فکرمندی کا احساس بھول کر مسکرادیا۔

''انہیں دیکھیے......'' اکبر علی نے چہرہ فیصل کی طرف کیے ہوئے ایک بار پھر ملیحہ کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''انہیں بار بار دورے پڑتے ہیں۔کس چیز کی کمی ہے۔ان کو ہر چیز میسّر ہے......پھر بھی پتھروں سے سر پھوڑتی رہتی ہیں......اور......''

''چپ ہوجایئے......'' وہ دفعتاً چیخی۔

''چپ کیجئے آپ......میری بات......مت کیجئے......میں......میں......''

وہ کھڑی ہوگئی۔اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔سانس بری طرح پھولنے لگ گیا تھا۔

''دیکھو......دیکھ رہے ہو......یہ ہے اصلیت ان کی......خود کو فنکار سمجھتی ہیں......دُنیا کی سب سے بڑی فنکار شاید......سدابہار حسینہ سمجھتی ہیں......کیوں نہیں بھائی......ان کو تو خدا نے

ہر فکر سے آزاد رکھا ہے نا...... انسان بوڑھا ہوتا ہے ذمّہ داریوں سے......ان پر کوئی ذمّہ داری ہی نہیں......'' اکبر علی نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ اور اطمینان سے آہستہ آہستہ چائے کی پیالی میں چمچہ چلاتے رہے۔

''یہ ہے اس دیوانی عورت کی اصلی صورت۔ پاگل عو......''

''میں پاگل نہیں ہوں......'' وہ زور سے چیخی۔

''نہیں ہوں میں پاگل...... سمجھے آپ......'' پھر دھیرے سے صوفے پر ٹک گئی اور سسک سسک کر رو پڑی۔

''تو...... پھر کیا ہیں...... آپ؟'' اکبر علی نے آرام سے منہ ملیحہ کی طرف موڑا......وہ ہاتھوں میں منہ چھپائے آہستہ آہستہ سسکیاں لے رہی تھی۔

فیصل کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگا۔

یہ اصغر علی کا بچّہ...... کہیں سچ مچ ہی پاگل نہ کر دے گا اسے......خدا نہ کرے۔

کیسے ہو جاتے ہیں......لوگ پاگل ہو کر......

اُسے اچانک خیال آیا تھا۔

......☆☆......

عافیہ کے حکم سے اُسے پاگل خانے کا منظر کچھ دن پہلے ہی دیکھنا پڑا تھا۔

ایک پاگل نے وہاں موجود محافظ کے ہاتھ میں پکڑی بریانی کی رکابی پر زور سے ہاتھ مار کر گرا دیا تھا۔ گرم گرم بریانی سے جلا ہاتھ وہ ہوا میں لہراتا رہا اور زور زور سے ہنستا رہا۔ مارے ہنسی کے اس کے آنسو نکل آئے۔ وہ اپنی دھاری دار قمیص سے ناک اور آنکھیں پونچھتا رہا۔ دوسرا مریض کافی دیر سے دیوار کی طرف منہ کیے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا، قہقہے سن کر بری طرح چیخا اور کسی غیر مانوس زبان میں بولتا ہوا، غراہٹ نما انداز میں جیسے کہ اسے دھمکی دینے لگا۔ وہ کوئی ایک منٹ بغیر رکے بولتا گیا اور پھر دوبارہ سر گھٹنوں میں دے کر بیٹھ گیا۔ مگر جب قہقہے مسلسل اس کی سماعت سے ٹکراتے رہے تو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ غصّے کے مارے اس کی آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں۔

وہ پہلے مریض کو پکڑنے کے لیے لپکا۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر پہلے مریض نے بھاگنا شروع کر دیا۔ دوسرا جو بھاری تن و توش کا تھا، اپنے دونوں پہلوؤں پر ہاتھ دھرے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کا چہرہ مارے غصے کے انگارہ ہو رہا تھا۔ پہلا مریض بھاگتے بھاگتے رک گیا اور پلٹ کر اسے دیکھا۔ اسے ایک جگہ ایستادہ دیکھ کر اس کی طرف دوڑا اور قریب پہنچ کر قہقہہ لگایا۔ وہ واپس پلٹا ہی تھا کہ دوسرے نے اُسے بھاگ کر جا لیا اور اسے پکے فرش پر اوندھا گرا کر اُس کے کولھوں پر چڑھ بیٹھا۔ پھر تب تک اس کو گھونسے مارتا رہا جب تک چار محافظ آہستہ خرامی سے آئے اور اسے پکڑ کر زنجیروں سے باندھ دیا۔ گرا ہوا مریض سر دائیں بائیں ہلا ہلا کر اونچی آواز میں روتا رہا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ جسے وہ پونچھ ہی رہا تھا اور نہ اپنی جگہ سے اٹھ رہا تھا۔ باقی مریض ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ کوئی فیصل کی لائی ہوئی بریانی کھا رہا تھا، کوئی بریانی کو اپنی قمیض کی جیب میں ٹھونس رہا تھا۔ کھانا تقسیم کرنے والا خدمت گار انہیں بار بار ڈانٹ رہا تھا۔

"آرام سے، یار......" فیصل نے خدمت گار سے کہا تھا۔

"ارے نہیں صاحب...... یہ آرام سے تو کبھی بات مانتے ہیں نہیں...... کوئی کئی کئی بار کھاتا ہے...... اور کوئی کھاتا ہی نہیں...... وہ...... وہ دیکھ رہے ہیں...... اُدھر آپ...... وہ جو کونے میں بیٹھا اِدھر دیکھ رہا ہے...... دیکھئے کب سے بلا رہا ہوں...... ابے ادھر آ، سالے۔" اُس نے گہری سانولی رنگت کے گھنگھریالے بالوں والے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ...... پچھلے پندرہ سال سے ہے...... اسی جگہ...... دو سال پہلے...... میں نے اسے تیرہ برس بعد بولتے دیکھا تھا...... ایک ڈاکٹر صاحب نئے آئے تھے۔ تمل جانتے تھے۔ انہوں نے بات کی تو بولا تھا۔ ورنہ ہم سب اسے گونگا سمجھتے تھے۔"

"ہوا...... کیا ہے اسے؟" فیصل نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پتہ نہیں صاحب...... آیا تھا تو بالکل جوان تھا...... ہٹا کٹا...... مگر کھانے پینے میں کوئی دلچسپی نہیں اس کی...... دیکھئے نا...... ہڈیوں کا ڈھانچا ہو گیا ہے......"

فرش پر گرے ہوئے مریض کو مرہم پٹّی کے لیے لے جایا گیا۔

''مگر...... یہ......اس طرح تو...... یہ بے چارے۔''فیصل نے فرش پر پھیلے خون کو دیکھا۔

''وہ اُدھر مرمّت کا کام چل رہا ہے نا۔لڑا کے خطرناک پاگل تو ادھر ہیں۔ان میں جو کچھ بہتر تھے، فی الحال ادھر لائے گئے ہیں۔ورنہ یہ زیادہ تر پُرسکون رہنے والے پاگل ہیں''۔

اس نے ایک نوجوان مریض کو کھانا پکڑاتے ہوئے کہا۔

''تم نے......میرا Application پوسٹ کر دیا نا۔''لڑکے نے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں......اور کیا......وہیں سے تو آ رہا ہوں۔''خدمت گار بھی مسکرایا۔

''او......تھینک یو......''لڑکے نے کھانے کی رکابی والا ہاتھ جالی سے اندر کھینچ لیا اور دُور دیوار سے لگ کر کھانا کھانے لگا۔

''یہ......نیا نمونہ ہے...... جب ملتا ہے یہی سوال کرتا ہے اور جواب سے مطمئن بھی ہو جاتا ہے...... پاگل کہیں کا۔''

''بالکل......نارمل لگتا ہے یہ تو......''فیصل آہستہ سے بولا۔

''ایسے ہی ہیں یہ...... ہمیں پاگل کر دیں یہ تو......وہ دیکھئے......وہ خود کو منتری کہتا ہے......ابے ادھر آ......''خدمت گار نے فرش پر بیٹھے ایک درمیانہ عمر شخص کی طرف اشارہ کیا۔وہ قریب آ گیا اور مسکرا کر ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔

''میں......آپ کا سیوک ہوں......آپ کے سب مسئلے ٹھیک کر دوں گا......سارے مکان پکّے ہوں گے تم لوگوں کے...... نیا پل بھی بنوا دوں گا......شہر والی سڑک اتنی چوڑی کروا دوں گا......''اُس نے دونوں بانہیں پھیلا دیں......

''پہلے کھا......صاحب بریانی لائے ہیں......تیرے لیے۔''

''دھنیہ واد......''اُس نے دوبارہ ہاتھ جوڑ کر مسکرا کر سر ہلایا۔

''وہ دیکھئے......وہ سر پر پائجامہ باندھے......جو آ رہا ہے نا......یہ اپنی طرف سے سہرا باندھے ہوئے ہے......''خدمت گار نے اپنی طرف آ رہے ایک دُبلے لمبے لڑکے کی طرف دیکھ کر کہا۔اس نے پائجامے سے ناک تک چہرہ چھپا رکھا تھا اور قمیض کے نیچے سے اُس کا میلا سا

زیر جامہ نظر آ رہا تھا۔

''چلو بھائی......چلو......کدھر ہے میری گھوڑی......'' اُس نے بڑی عجلت سے دریافت کیا اور کوئی جواب سنے بغیر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور منہ پھاڑ کر رونا شروع کر دیا۔

''ارے چُپ...... چپ کر......'' خدمت گار اُونچی آواز میں بولا۔

''سگریٹ......کون......پئے گا......'' خدمت گار نے نعرہ لگایا۔ تقریباً سب ہی خوشی سے چلاّئے ''ہم پئیں گے۔'' 'دولہا' بھی فوراً آنسو پونچھ کر مسکرانے لگا۔

''لائن میں......رہو......ورنہ کسی کو نہیں ملے گا۔''

چارپائی پر بیٹھے ایک عمر رسیدہ دیوانے نے اونچی آواز میں کہا۔

''نہیں......ایسے نہیں......تم سب اپنی اپنی جگہ بیٹھو......میں ایک ایک کر کے بلاؤں گا......'' خدمت گار بولا اور وہ سب چھوٹے بچوّں کی طرح اپنے اپنے بستروں پر جا بیٹھے۔ جو دو سگریٹ نہیں پیتے تھے، وہ اپنی دنیا میں ویسے ہی گم رہے جیسے کچھ دیر پہلے تھے۔

فیصل نہایت رنجیدگی سے ان کی حرکات دیکھتا رہا۔ کتنی بے قاعدگی تھی۔ نظامت میں۔ پھر وہ دوسری طرف گیا۔ خدمت گار ساتھ ہو لیا۔

......☆☆......

''صاحب ان لوگوں کے لیے کھانا لائے ہیں......'' خدمت گار نے مریضاؤں کی خاتون خدمت گار سے کہا۔

اُس حصّے کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ بلکہ شاید اس سے بھی بُرا...... گھنے، چھوٹے، میلے بالوں والی ایک نوجوان عورت کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔

''اپنے پتی کو......پتر لکھتی ہے یہ......روز......'' خدمت گار ہنس کر بولا۔

''او......Really تو......'' فیصل نے حیرت سے کچھ پوچھنا چاہا۔

''تو کیا......پاس جا کر......دیکھیں گے تو......'' وہ زور سے ہنسا۔

''تو نہ اُس Pen میں Ink ہے......اور نہ......اس گتّے کے اندر کاغذ......مگر ہر وقت

اپنے پاس رکھتی ہے اسے...... جب کبھی کوئی دوسری لڑکی اس سے یہ ٹوٹا ہوا پین چھیننے کی کوشش کرتی ہے تو...... خوب سر پھٹول ہوتی ہے۔ باپ رے باپ!''

''اس کا پتی ہے کیا......؟''

''ہاں...... بدیس گیا تھا...... آیا ہی نہیں...... دوسرا بیاہ کرلیا ہے وہاں......'' وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا تو وہ زخمی شیرنی کی طرح بھاگ کر سلاخوں کے پاس آئی اور غصّے سے اُسے گھورنے لگی۔

"Will you just shut up, you son of a bitch." وہ دانت پیس کر بولی اور سڈول بانہیں اوپر اٹھا کر اپنے بکھرے بالوں کو جوڑے کی صورت گھمانے کی کوشش کرتی ہوئی ننگے پاؤں سیمینٹ کے فرش پر پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی۔

''دیکھا صاحب...... انگریزی میں گالی دیتی ہے...... سالی...... پاگل۔'' وہ سر جھٹک کر بولا۔

''وہ دیکھئے...... یہ بھی ایک نمونہ ہے۔''

خدمت گار نے ایک جواں سال لڑکی کی طرف اشارہ کیا جو اپنے بڑھے ہوئے پیٹ کا وزن سنبھالنے کی کوشش کرتی پاؤں دُور دُور رکھتی قریب آ رہی تھی۔

''اوئے...... حرام جادے...... دوجنوں کا کھانا دے نا مجھے...... نہیں تو...... یہ تیرا بچہ جو اُٹھائے پھرتی ہوں...... مر جائے گا۔'' اُس نے پاس پہنچ کر زمین پر تھوک دیا۔

'' جھوٹ بولتی ہے...... بے شرم...... جانے کس کا ہے...... اور......''

''کس کا......؟ کس کا ہے یہ بچہ...... شام کو بجلی بجھانے کے بعد تُو ہی تو آیا تھا میرے پاس...... تیری ڈیوٹی تھی...... یہ تیری حرام کھا کھا کر بڑھی ہوئی توند سب لڑکیاں پہچانتی ہیں...... تیرے پاس سے مرے ہوئے چوہے کی سڑاند آتی ہے...... تھو...... آخ تھو......'' پھر وہ فیصل کی طرف مُڑی۔

''میں پاگل نہیں ہوں...... صاب جی...... چچا نے یہاں بند کروادیا ہے مجھے...... وہ سب بہت مارتے تھے مجھے...... میں نیند میں ڈر کر جاگ جاتی تھی۔ چیخ کر بھاگ نکلتی تھی

گھر سے......وہ میرا گھر تھا۔میرا گھر چھین لیا.....میرے باپو نے اس چچا کو بیٹے کی طرح پالا تھا.....باپو مر گئے تو......وہ......بہت ظالم لوگ ہیں......" وہ خالی خالی سی آنکھوں سے دوسری طرف دیکھنے لگی مگر اگلے ہی لمحے خدمت گار کی طرف پلٹی۔

"اور......یہ درندے......یہ جانور.....ہمیں جانور سمجھتے ہیں......یہ خود ہی تو......یہ سب ایک جیسے ہیں......بہت کم لوگ ہیں اچھے......یہاں پر......"

......☆☆......

فیصل اُس رات سو نہیں پایا تھا۔ بھابھی نے کہا تھا۔یتیم خانے اور پاگل خانے کے مکینوں کو کھانا کھلانے کے لئے......اور کیا کیا ہو رہا ہوگا۔اس دنیا میں......انسانوں کی رہائش......پنجروں میں......یہ ناروا سلوک......گھر والے ان کو لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر شاید بھول جاتے ہیں۔اپنے عزیزوں کو۔انسان کی نفسیات بھی عجیب ہے۔

فیصل کے ذہن میں کچھ دیر کے لیے دماغی اسپتال کی یاد تازہ ہوگئی تھی۔

یہ سلوک کرتا ہے یہ بے حس انسان۔اس فنکارہ کے ساتھ ......یہ سر کی چوٹیں......یہ کمزوری......یہ حالت......

فیصل سوچتے سوچتے کبھی ملیحہ کو دیکھتا کبھی اکبر علی کو۔

"جانتے ہو؟......یہ حالت ان کی......" اکبر علی نے کچھ کہنا شروع کیا تھا۔

"رہنے دیجیے نا......" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔"اکبر بھائی......" وہ کچھ رک کر بولا۔"انہیں آرام کی ضرورت ہے......" فیصل کا دل اسے بھائی کہنے کو ہرگز نہیں چاہ رہا تھا۔اس نے ملیحہ کی طرف دیکھا۔ملیحہ نے چہرے سے ہاتھ ہٹا لیے تھے اور فیصل کو دیکھ رہی تھی۔فیصل نے ایسا کرب ناک حسن پہلے نہیں دیکھا تھا۔

اُس کا جی چاہا کہ کنول کی پتیوں ایسے رخساروں پر ٹکے ان آنسوؤں کو اپنی انگلیوں سے پونچھ لے اور اس کا سر اپنے شانے سے لگا کر بال سہلا سہلا کر اسے چپ کرائے......یا کم سے کم اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس کے کمرے تک چھوڑ آئے۔

''آپ اندر جا کر کچھ Rest لے لیجئے......''فیصل نے ملیحہ کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔وہ اپنے آپ کو بے بس سا محسوس کر رہا تھا۔

''پلیز......''وہ سراپا التجا بن گیا۔ملیحہ نے اسے بغور دیکھا۔صرف ایک پل کے لیے۔وہ بھی بے اعتباری سے کہ اس نے اِس سے پہلے اپنے لیے کسی کے چہرے پر ایسے اپنائیت بھرے تاثرات نہیں دیکھے تھے۔اس کی آنکھیں مزید بھر آئیں۔وہ ہونٹ بھینچے اسے دیکھتی رہی۔آنسو پی جانے کی بسیار کوشش کے باوجود آنسو ڈھلکتے رہے۔اکبر علی سر جھکائے اپنے لیے چائے بناتے رہے۔

......☆☆......

اس شام وہاں سے لوٹنے کے بعد فیصل ملیحہ کے ہی بارے میں سوچتا رہا۔دوسرے دن دس ایک بجے اس نے ملیحہ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا تو معلوم ہوا وہ جب سے سو رہی ہے۔اکبر علی اپنے دفتر کے لیے نکل چکے ہیں۔فیصل نے ملازم سے کہا کہ ملیحہ سے کہے فیصل فون پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ملازم کو فیصل کی گھر کے فرد جیسی اہمیت کا احساس تھا۔اسی لیے بیگم صاحبہ کو جگانے کے لیے دروازے پر دستک دیتے وقت اُس نے زیادہ نہیں سوچا۔ملیحہ نے اندر سے فون اُٹھالیا۔

''کیسی ہے طبیعت......معافی چاہتا ہوں......جگا دیا آپ کو......''

''نہیں......اچھا کیا......اب اور کتنا سوتی......نیند جانے کیسی ہے......نیند بھی نہیں ہے......اور جاگ بھی نہیں رہی......''

''آپ میری ایک بات مانیں گی......؟''

''بولو۔''

''آپ ڈاکٹر کو فون کر کے بلوالیں......اپنا بلڈ پریشر چیک کروالیں......''

''زیادہ نہیں ہے میرا بی پی شاید......''آواز میں تھکن قدرے کم تھی۔

''رہتا ہے کیا......؟''

کبھی کبھی......Fluctuate کرتا ہے اصل میں......"

"اس وقت کرا لیجئے نا چیک......پلیز......"

"ملیحہ کی آنکھوں میں گزشتہ شام کا اُس کا التجا بھرا چہرہ گھوم گیا۔

"تم فکر نہ کرو......میں ٹھیک ہوں......" وہ آہستہ سے بولی۔

"کیوں نہ کروں......آپ......" وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

ملیحہ کچھ نہ بولی۔ کئی لمحے یوں ہی خاموشی میں گزر گئے۔

"کیوں کروگے......تم......میری فکر؟" وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی۔

"کروں گا......میں......بس۔" فیصل کی آواز بھاری ہوگئی اور ملیحہ کی ہچکی سنائی دی۔

"آپ ایسا نہیں کریں گی......نہیں کریں گی آپ ایسا......سمجھیں آپ؟

خود کو برباد کرنے کا......اس طرح......اس طرح آپ کو......کوئی حق نہیں۔ آپ فن کی امانت ہیں......فن شناسوں کے لیے......آپ ایسا نہیں کریں گی......" اُس کا لہجہ مضبوط تھا۔ کچھ سیکنڈ خاموشی سے گزر گئے۔

"اور......میں......میں آپ کے فن کا قدردان ہوں......" اُس نے مسکراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "سُن لیا آپ نے محترمہ۔" وہ ہلکے سے ہنسا۔

"جی......ہاں......سن لیا......" وہ کچھ پُرسکون سی معلوم ہوئی۔

"کوئی......ثبوت......" اس کی آواز میں ہلکی سی کھنک شامل ہوگئی۔

کچھ ویسی ہی جسے پہلے پہل سن کر فیصل سحر زدہ ہوگیا تھا۔

"وقت آنے پر......ثبوت بھی مہیا کروں گا......می لارڈ......" وہ ہنسا تو ملیحہ بھی کمزور سی ہنسی ہنس دی۔

......☆☆......

فیصل جب کسی بات پر سوچ سوچ کر تھک جاتا اور کوئی حل تلاش نہ کر پاتا تو پریشانی سے بچنے کے لیے کچھ اور کرنے کی کوشش کرتا۔ کبھی لمبے ڈرائیو پر جاتا۔ کبھی میلوں پیدل چلتا رہتا۔ یا کسی نئے

ریستوران میں کھانا کھانے چلا جاتا۔ اُسے اچانک پرانے شہر کا خیال آیا...... عافیہ بھابی نے ایک چیز نہاری بتائی تھی جو پرانی دلّی میں بہت لذیذ بنتی ہے۔

بڑے جانور کی ران کے بے ریشہ گوشت ادلے کی گاڑھی گاڑھی نہاری جو ساری رات مدھم آنچ پر مصالحوں میں پکتی ہے......نہار منہ کھائی جانے والی نہاری...... یہ چائے وائے تو فرنگیوں کی دین ہے......

اصغر علی......!

اس نے خاصی اونچی آواز میں پکار کر کہا۔

اصغر علی......خبیث......آج تیرا دیا غم......ہم نہاری کھا کر غلط کریں گے......اُس نے بہ آوازِ بلند کہا اور مسکرا دیا......پھر مگر اسے دفعتاً یہ خیال آیا کہ اگر ملیحہ اس کے ساتھ چلے گی تو کتنا خوش ہوگی۔ نئی دلّی کے ڈِفینس کالونی میں پیدا ہوئی......وسنت کنج کے علاقے میں بیاہی وہ لڑکی، عافیہ بھابی کی پرانی دلّی دیکھ کر کچھ دیر کو سارے غم بھول جائے گی کہ ایک بار، بہت پہلے وہ عافیہ بھابی کے ساتھ آئی تھی تو اُس نے وہاں کا مخصوص و محفوظ کلچر خود سے بہت قریب محسوس کیا تھا......آج اگر فیصل کے ساتھ آئے گی تو وہ اسے اس کی پسند کی ہر چیز دکھائے گا۔

بڑی بڑی آہنی کیلیں جڑے ایک کٹڑے کو دوسرے کٹڑے سے الگ کرتے ہوئے بلند و بالا چوبی پھاٹک دیکھ کر سوچوں میں گم ہو جائے گی۔ وہ اسے بتائے گا کہ آج کل بسائی گئی مختلف سوسائیٹیز کی طرح پہلے بھی لوگ اپنی سماجی اور اقتصادی صورتِ حال کے مطابق الگ الگ بستیاں بسائے ہوئے تھے اور یہ بستی کٹڑا کہلاتی تھی......اور اب بھی کہلاتی ہے۔ جیسے کٹڑا نیل، کٹڑا علی رضا وغیرہ اور قدیم نام بھی وہی ہیں......جیسے غالب کی گلی قاسم جان یا بارہ پھاٹک والی بارہ دری شیر افگن خاں......یا پھر......یا پھر ہمدرد کا سو سال پُرانا دواخانہ......یا......(کرتار سنگھ نے......اتنا ہی بتایا تھا اُسے)۔

ہاں اُس کے بعد ملیحہ کو جامع مسجد کے سامنے گھومتے بہشتی کے مشکیزے سے پانی پلا کر حلیم اور بریانی کھلائے گا۔ (یہ کیا Combination ہے یار) کہ سب لوگ کھاتے

ہیں......اُدھر......ایسے......ہاں......پھر......پھر......

پھر مینا بازار سے اُسے پیازی رنگ کی ساڑھی اور اسی رنگ کی چوڑیاں لے دے گا......پھر اسے گودوارہ سیس گنج کے قریب واقع صدی بھر پرانے گھنٹہ حلوائی سے رس ملائی کھِلوا کر......

جی ہاں......فیصل میاں......اور کوئی کام نہیں ہے ملیحہ کو......

یہ......یہ کس احمق کی آواز تھی......؟......وہ مسکرایا......ہاں......محکمۂ آثار قدیمہ نے فی الحال ستائیس کے قریب قدیم عمارتیں اپنی تحویل میں لے لی ہیں (کرتار بھائی نے کہا تھا)۔

کسی محراب، کسی چلمن کو دیکھتی ہوئی سنگ تراشی کے نمونوں کی داد دیتی ہوئی ملیحہ سارے غم بھول کر لوٹے گی تو اُس کی ہنسی کس قدر لبھاؤنی ہوگی......اور جس دن چاندنی چوک کو پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے پرانے انداز میں سجایا جائے گا......اُس دن اُس......اُس اصغر علی کو......افیم کھلا کر سُلا دوں گا......

اور پھر ملیحہ کو اس کے کھردرے پنجوں سے آزاد کر کے میلے کی سیر کراؤں گا۔ مگر اُس کا نام ملیحہ کیوں ہے۔ وہ تو......کتنی صاف رنگت ہے اُس کی......خیر......جو بھی ہے......اُسے خوش ہونے کا پورا پورا حق ہے۔

میں سارے دُکھ بھُلا دوں گا اُسے۔

اس کی آنکھ کبھی نم نہ ہونے دوں گا......

ورنہ......ورنہ......وہ......اصغر علی اسے کسی دن پاگل خانے چھوڑ آئے گا......اور......ایک عظیم فن کارہ کو ضائع......نہیں ہونے دوں گا۔ میں نہیں ہونے دوں گا ایسا۔

بس......یہی وجہ ہے......نا......؟

فیصل نے سر جھٹکا۔

ہاں......

یا اس سے الگ کوئی اور......اور......

اس نے ہاتھوں سے بال سنوارے۔

وہ عجب بے خبری کے عالم میں جانے کہاں کہاں پھر رہا تھا۔

سامنے پڑی نہاری پر ایک سوکھی پرت بیٹھ گئی تھی۔

''اور کچھ......لاؤں صاحب......؟''

کریم ہوٹل کے گول کالر کی لمبی قمیص اور پائنچوں والی شلوار پہنے بیرے نے مؤدبانہ پوچھا تو فیصل نے اپنی نہاری کی طرف دیکھا اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''ایک گرم گرم نہاری لے آؤ......فوراً''

ہاں......تو میں کہاں تھا؟......چاندنی چوک میں ......تو......گزشتہ برس کی طرح......

برسوں بعد جیسے سجایا گیا تھا چاندنی چوک کو......چاندنی کی طرح......

جب سارا علاقہ پرانے انداز سے سجا کر جدید طرز کی روشنیوں سے نکھار دیا گیا تھا، ہر گوشہ جھِل مِل کر رہا تھا۔ جس کی خاطر پہلے ہی ہر گھر کے برآمدے کو گلابی رنگ دیا گیا تھا۔ ریشمی کپڑے کے بڑے بڑے بینروں پر ہر مقام کی تاریخی حیثیت درج کی گئی تھی۔ فن کار ایک طرف رامائن سٹیج کر رہے تھے تو دوسری جانب میر، غالب، داغ بنے گھوم رہے تھے۔ مشاعرے ہو رہے تھے۔ قوالیاں گائی جا رہی تھیں۔ لمبی سی سفید چادر بچھا کر جیسے کہ نہر نکال دی گئی تھی۔ اَن گنت سٹال لگائے گئے تھے۔ ملبوسات کے آرائش کے سامان کے......خورد و نوش کے......ہاں......میں ملیحہ کو چاٹ پکوڑی کھلاؤں گا......پاپڑی چاٹ......مصالحے والی......ایک بار تو ضرور لے کر آؤں گا اُس کو یہاں......وہ کہاں جانتی ہوگی کہ چاندنی چوک سے چھتوں کو ٹاپتے ٹاپتے انسان بَلّی ماران جا پہنچتا ہے اور ان رنگ برنگی چُنریوں سے بھی خوش رنگ پتنگیں بکتی ہیں فراش خانے کے گڈی بازار میں......یوم آزادی پر کتنے چاؤ سے اڑائی جاتی ہیں یہ پتنگیں......سارے شہر میں سپلائی ہوتی ہیں......اُس دن التجا کروں گا کہ یہ ڈل کلرز کے کپڑے نہ پہن کر وہ بھی کوئی Multi Coloured لباس پہنے۔ کوئی جھلمل کرتا دوپٹہ اوڑھے......اور......اور......

اور......خاک......کہاں مانے گی وہ......میرا کہنا......کیوں بھلا؟

......☆☆......

ہر بار جب فیصل ملیحہ سے ملا، ایک الگ حالت میں ملا۔ اُس کے بعد بھی جب ایک دن اُس کی ملاقات ملیحہ سے ہوئی تو وہ اپنے تہہ خانے میں تھی۔ اُس نے دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ یہ معلومات فیصل کو فون پر حاصل ہوئیں تھیں کہ صاحب سے ان کی کسی بات پر لڑائی ہوگئی تھی اور انھوں نے تہہ خانے میں جاکر دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ صاحب ناشتہ کر کے جاچکے تھے۔ وہ پھر بھی تہہ خانے سے باہر نہ آئی تھی۔

مختصر سے زینے کے بعد تنگ سی غلام گردش کے دونوں طرف نیچی چھت والے دو بڑے بڑے گودام تھے۔ جس میں داہنی طرف والے گودام کے ایک کونے کے قریب ملیحہ نے اپنا 'سٹوڈیو' بنا رکھا تھا۔

فیصل نے دروازے پر ہلکے سے دستک دی......کوئی جواب نہ آیا۔

"دروازہ کھولیے نا......ایسی کیا خاص تخلیق ہو رہی ہے بھائی......جو اتنا انہماک ہے......ذرا ہم بھی تو دیکھیں۔" کوئی جواب نہیں آیا تو فیصل نے کچھ منٹ انتظار کرنے کے بعد کچھ زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پھر کوئی جواب نہ ملا۔

"دروازہ کھولیے نا......میں فیصل ہوں......بہت دیر سے کھڑا ہوں۔"

اُس نے رک رک کر جملہ پورا کیا۔

"پلیز......کھول دیجیے دروازہ......" وہ اُداس ہو کر بولا۔

"میں......پریشان ہو رہا ہوں......آپ ٹھیک تو ہیں نا" مزید کچھ دیر خاموشی چھائی رہی......پھر اندر کچھ آہٹ ہوئی......اور دروازہ کھل گیا......وہ دروازے پر دونوں بانہیں ٹکائے کھڑی ہوگئی۔

"کیوں......آئے ہو تم یہاں......کیا چاہیئے تمہیں......چلے جاؤ......یہاں سے۔ دخل مت دو میری زندگی میں......میرے حال پر چھوڑ دو مجھ کو......"

وہ پریشان سی ہو کر بولی......اور پھر رو پڑی۔ وہ بے حد نڈھال لگ رہی تھی۔ اُس کا ایک ہاتھ دروازے پر سے ہٹ کر اُس کے جسم سے لگ گیا اور وہ خود دروازے کی چوکھٹ سے لگ

گئی۔اس کے ماتھے کے عین درمیان مانگ کے قریب چھوٹے سے زخم پر خون کی لکیر جم گئی تھی۔
کچھ خون بائیں ابرو تک بہہ گیا تھا اور پھر کان کے پاس سے ہو کر اُس کے گریبان تک چلا گیا تھا۔اُس نے سیاہ رنگ کا کرتا پہن رکھا تھا،اس لیے فیصل کو اور کوئی دھبّہ نظر نہ آیا۔

''آپ بیٹھیں تو......میں بتا تا ہوں......آپ جیسا کہیں گی وہی کروں گا......پریشان نہیں ہونے دوں گا آپ کو......'' وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔

ملیحہ کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔آنکھوں کے گرد کی جلد سُرخ ہو گئی تھی۔وہ ماتھے پر سلوٹیں ڈالے اُسے دیکھتی رہی۔

''کیوں......تم......کیوں اپنے آپ کو الجھاتے ہو......یہ سب برسوں سے......ایسے ہی چلتا آ رہا ہے......ایسے ہی......چلتا......رہے گا......''

''میں خود کو کہاں الجھا رہا ہوں......میں تو آپ کی بے جا قسم کی الجھنیں سلجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''کبھی نہ کامیاب ہونے والی کوشش......'' وہ فرش پر بیٹھ گئی۔

''نہیں......میں ناکام نہیں ہوں گا۔''

وہ بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''اپنا وقت برباد مت کرو فیصل......اس طرح......تم......''

''میں وقت ضایع نہیں کر رہا ہوں......میں وقت کو کسی مصرف میں لانے کی کوشش کر رہا ہوں......آپ مجھے......''

''خود کو دھوکا مت دو......ایک سنہرا Future ہے تمہارے پاس......جس کام کے لیے عافیہ نے تمھیں بھیجا ہے وہ......کرو......اسے خوش اسلوبی سے انجام دو......اور پھر واپس جا کر Settle ہو جاؤ۔'' وہ سر جھکائے بولتی رہی۔

''میں......واپس نہیں جاؤں گا......اب آپ کو چھوڑ کر......'' وہ بھی سر جھکائے بیٹھا رہا۔
مگر اگلے ہی لمحے اس کے رخسار پر ملیحہ کا زوردار تھپڑ پڑا۔

''پاگل ہو گئے ہو......ہوش و حواس کھو بیٹھے ہو......؟'' اُسے غصّہ آ گیا تھا۔

''نہیں......میں ہوش میں آ گیا ہوں......'' وہ بے خوف سا ہو کر بولا۔

''میں نے......کہہ دیا ہے......عافیہ بھابی سے کہ میں......کہ مجھے یہاں کوئی ایسا شخص نہیں مل رہا......جسے برانچ کی ذمّہ داری سونپ سکوں......اس لیے میں یہیں رہوں گا......میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ میں اپنا وطن چھوڑ کر وہاں نہیں رہوں گا......اور میں آپ سے بھی عرض کر دوں کہ......کہ میں آپ کو اس جہنم سے نکال کر رہوں گا۔'' وہ ملیحہ کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا......اُس کی آنکھوں میں بغاوت صاف عیاں تھی۔ چہرے پر عزم تھا اور رخسار پر ملیحہ کی لمبی لمبی انگلیوں کے چار سرخ نشان۔ ملیحہ کی نظر ایک سیکنڈ کو اُس کے گال پر ٹھہر گئی۔

''میں آپ کو......ڈھیروں خوشیاں......'' وہ روٹھی سی آواز میں بولا۔

''بند کرو اپنی یہ بکواس فیصل......کچھ عقل کا استعمال نہیں کر سکتے......تو یہاں سے......چلے جاؤ......'' وہ بے چارگی سے بولی اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''ٹھیک ہے......چلا جاتا ہوں......مگر......آپ......'' اُس کی آواز رندھ گئی۔

''میں......تم سے بہت بڑی ہوں......اپنا گھر ہے میرا ایک......کسی کی بیوی ہوں۔''

وہ اسے سمجھانے کے انداز میں بولی۔

''......میں عمر کے فرق کو نہیں مانتا......میرا سہارا چاہیئے آپ کو کہ آپ اپنے فن کی معراج کو چھو لیں......پُرسکون ذہن سے تخلیق کریں......پھر......پھر......شادی کر لینے سے کوئی کسی کی ملکیت نہیں ہو جاتا......بیوی کی عزّت ہوتی ہے شوہر کی نظروں میں......اور رہا گھر......تو گھر انسان کو سکون بخشتا ہے، سکون چھینتا نہیں......سکون چھین چھین کر......آپ......آپ......'' اس کی آواز کچھ اونچی ہو گئی۔

''آپ نے ایک بے حس انسان کے ساتھ رہ کر خود پر اور اپنے فن پر جو ظلم ڈھایا ہے......اُس کے لیے آپ کو خدا بھی نہیں بخشے گا......ظلم کرنا اور ظلم سہنا......دونوں گناہ ہیں......جانتا ہوں میں......یہ روز روز کی چوٹیں کیسے لگتی ہیں آپ کو......آپ......'' آواز سن کر

برسوں پرانا ملازم غفور اوپری زینے تک آیا......اور واپس چلا گیا۔

''چُپ ہو جاؤ تم...... کچھ نہیں جانتے...... میں خود زخمی کرتی ہوں...... غصّے میں اپنے آپ کو......سر ٹکراتی ہوں اپنا میں خود......'' ملیحہ نے سر جھٹک کر کہا۔

''معلوم ہے مجھے۔ بچپن سے جانتا ہوں آپ کو......مگر کون کرواتا ہے یہ سب آپ سے...... یہ ماحول تو کسی دن...... سچ مچ ہی پاگل کر دے گا......آپ کو...... میں اسی خیال سے ڈرتا ہوں......آپ پر......اب اور ستم نہیں ہونے دوں گا...... ہرگز...... ہرگز نہیں......''

وہ خاموش ہو گیا۔ ملیحہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ حیران حیران سی۔

پھر وہاں سے اٹھی......اور آپس میں جڑے ان دو پتھروں کے قریب کھڑی ہو گئی جو فیصل نے پچھلی دفعہ دیکھے تھے۔ فیصل نے اس طرف دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ بڑے پتھر کو تراش کر اس نے ایک بیٹھی ہوئی عورت کا مجسمہ بنایا تھا، جس کے نقوش ابھی واضح کرنا باقی تھے اور چھوٹے پتھر کو اس نے مکمل تراش لیا تھا۔ ایک چھوٹے سے بچے کا مجسمہ جو ماں کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ جہاں سے دونوں پتھر آپس میں جڑے تھے وہاں اس نے بچّے کے شانے کی گولائی سے شروع کر کے ماں کا پلّو تراش لیا تھا۔ وہ دنگ رہ گیا...... یہ شاہکار اور اتنے کم وقت میں...... کتنی محنت کی ہوگی اس نے...... دن رات...... کس قدر لگن...... کتنی بے قراری...... کتنی دیوانگی...... یہ عظیم فن کارہ...... یہ عظیم ہستی......

......☆☆......

اُس نے چونک کر سر اُٹھایا۔ ملیحہ بہت دیر سے اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

''کیوں ناراض ہوئے تھے......وہ آپ سے......'' فیصل نے پوچھا۔

''جانے کیا ہو جاتا ہے ان کو...... سمجھتے ہیں......وقت ضایع ہوتا ہے۔ میں وقت ضایع نہیں کرتی...... آج صبح سے بھی میں نے...... رو دھو کر بعد میں......اس کی انگلیاں carve کی ہیں......'' اس نے بچّے کے مجسّمے پر ہاتھ رکھ دیا۔

زینہ طے کر کے وہ اوپر آ گئے۔ کشادہ سی غلام گردش سے گزرتے ہوئے فیصل ٹھٹک کر رُک

گیا۔

''ذرا رُکیئے......'' اُس نے آگے چلتی ہوئی ملیحہ کو پکارا۔

''کیوں......'' وہ رُک گئی۔

''اِدھر آیئے نا......'' اُس نے دیوار کے قریب ایزل پر رکھے بڑے سے قد آدم آئینے کی طرف اشارہ کیا۔ ملیحہ آہستہ آہستہ چلتی آئینے تک آ گئی۔

''بڑی......لگتی ہیں آپ......مجھ سے کیا؟......کہیں سے بھی......؟''

وہ ملیحہ کے قریب آ کر اپنے ساتھ اس کے عکس کو دیکھ کر بولا۔

''پاگل......ہو تم......'' اس نے ہار کر کہا۔

برآمدے میں غفور نے ناشتہ چن رکھا تھا......انہیں آتا دیکھ کر مسکراتا ہوا تیز تیز چل کر باورچی خانے تک آیا اور چولہے پر چائے کا پانی چڑھا دیا۔

......☆☆......

اُس دن فیصل کافی دیر ملیحہ کے وہاں رہا۔ دوپہر تک۔ اُس نے ملیحہ سے بہت باتیں کی۔ پہلی دفعہ ملیحہ نے کسی سے اتنی باتیں کی تھیں۔ پہلی دفعہ کسی نے اس کی باتیں سنی تھیں......پہلی بار اس شام اس کا دل ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا تھا......اور پہلی بار اسے فیصل کی قربت میں ایک عجیب تجربہ ہوا تھا کہ اسے اپنا آپ دفعتاً مضبوط محسوس ہونے لگا تھا۔ اس سے قبل اپنی بات کہتے ہوئے اس کا اعتماد تھرّانے لگتا تھا۔ آج ایسا نہیں ہوا تھا......آج اس نے خود میں وہی اعتماد پایا تھا جو کوئی فن پارہ تراشتے ہوئے اس کے اندر طغیانی پر آئے سمندر کی طرح موجزن ہوتا تھا جس کی سمت کا تعین صرف وہ خود کر سکتی تھی......صرف اور صرف اس کا اپنا وجود۔ آج ایک اور وسیلے سے وہ اپنے کھوئے ہوئے اعتماد سے دوبارہ متعارف ہوئی تھی جو شادی کے فوراً بعد اس سے لحظہ بہ لحظہ چھنتا چلا گیا تھا۔ لٹتا چلا گیا تھا...... جب جب ملیحہ نے اُسے بحال کرنے کی سعی کی، کسی نے اُس پر شب خوں مار دیا تھا۔

فیصل اس کی ہر بات کو غور سے سنتا رہا تھا۔ اُس نے براہِ راست اُس سے کوئی سوال نہ

کیا تھا۔وہ خود ہی اُسے اپنی باتیں سنا رہی تھی۔ دھیرے دھیرے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے۔مخروطی لانبی فن کار انگلیوں سے کانٹے میں ناشتے کے ننھے ننھے ٹکڑے پروکر دہانے تک لے جاتے ہوئے کہنے لگتی تو چلتا ہوا چمچ پیالی میں ٹھہر جاتا۔نوالہ کلّے میں لیے نگلنا بھول جاتی......دیوار......یا ستون پر یا ستون اور زینے سے ہوتی ہوئی ہری گھاس پر......یا گھاس پر سے تنکے تلاش کرتی کسی چڑیا پر اُس کی نگاہیں اٹک کر رہ جاتیں......اور وہ کوئی دُکھ، کوئی غم، کوئی بہت پہلے گزرا حادثہ، ایسے بیان کرتی کہ اندازہ ہو جاتا، یہ درد کتنا تازہ ہے اُس کے اندر...... فیصل دیکھتا رہ جاتا۔اس حساس دل پر......ان کمزور نسوانی شانوں پر......اس ننھی سی جانِ ناتواں پر کتنے پہاڑ ٹوٹے ہیں رنج والم کے......وہ سوچتا رہتا۔

''گھر میں......ہوتے ہیں تو میں سٹوڈیو کی طرف جاتی بھی نہیں......کوشش میں لگتی رہتی ہوں کہ......سب کچھ ٹھیک سے ہوتا رہے......کوئی تکلیف نہ ہو اُنہیں۔اور کبھی بھی کوئی تکلیف ہوئی نہیں انہیں......پھر بھی......جانے کیوں......''

کبھی بات کرتے کرتے وہ خاموش ہو جاتی۔

''جانتے ہو......یہ دو مجسّمے......نہیں مجسمہ......ماں اور بچے کا یہ مجسّمہ......جانے......کب سے بنانا چاہتی تھی میں۔مگر یہ بات میں جانتی ہی نہیں تھی......''

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔آویزے لہرانے لگے۔سنہری جلد والے نازک سے کانوں میں کالے کرتے سے میچ کرتے ہوئے سیاہ موتی کی ایک ایک چھوٹی سی لڑی والے آویزے۔شاید کل پہنے ہوں اُس نے......کہ اُلجھے سے بال......ماڈ کھوچکا ململ کا کرتا دیکھ کر فیصل کو یہی اندازہ ہوا۔رات بھر کام کیا ہوگا اُس نے۔پھول سے ہاتھوں سے پتّھر توڑے ہوں گے۔

''آدھا مجسّمہ تراشنے کے بعد......یہ بات محسوس کی تھی......میں نے......کہ میں برسوں سے اس کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی......اپنا وقت دے کر بنایا ہے اسے......کسی کو Disturb نہیں کیا......AC کا شور تھا اُن کے کمرے میں......تہہ خانے میں سے آواز وہاں پہنچتی ہی نہیں......پھر بھی......ناراض ہو گئے۔ان کی باتوں کی ضرب سے میں ریزہ ریزہ ہو جاتی

ہوں۔''

اس کے چہرے پر گہری اداسی چھا گئی۔ کئی منٹ خاموشی چھائی رہی۔ پنکھا بے آواز گھومتا رہا۔ مالی، اشوک کے درخت کے سائے میں لمبے سے چمن میں لگے گیندے کی زردمرجھائی اداس سی کیاریوں کی جگہ سوسن کے آسمانی رنگ کے پھولوں والے پودے لگا رہا تھا۔ خاموش دوپہر قیلولہ کررہی تھی۔ کل کی بارش نے آج کا موسم کچھ اچھا سا کردیا تھا۔

''مگر اس مجسّمے کو دیکھ کر...... اچھا لگتا ہے...... بہت اچھا لگتا ہے مجھے......'' ملیحہ کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تم تھک گئے ہونا...... میری باتیں سن سن کر......'' اس نے فیصل کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں...... آپ بتایئے اپنی ساری باتیں...... مجھے...... میں سارے مسئلے حل کردوں گا آپ کے۔''

''آپ بس دیکھ لیجئے گا......'' وہ خود اعتمادی سے مسکرا دیتا تو ملیحہ کو اُس کی باتوں کا یقین آنے لگتا۔

......☆☆......

وہ چلا گیا تو وہ گھنٹوں حیرت زدہ سی سوچتی رہی کہ کوئی کسی دوسرے میں اتنی زیادہ دلچسپی کیسے لے سکتا ہے...... اتنا زیادہ...... کیسے...... یہ سب کیوں...... میری فکر کوئی کیونکر...... کیوں کرسکتا ہے...... مجھ میں ایسی کوئی بات ہے نہیں۔ فن شناسوں کی ملکیت کیسے ہوسکتی ہوں میں۔ میں کوئی ایسی بڑی فنکارہ تو ہوں ہی نہیں کہیں سے...... کچھ بھی تو...... Achieve نہیں کیا میں نے...... پھر...... یہ فیصل...... کیا کہتا ہے۔ کیوں کہتا ہے...... کہیں...... کہیں اس کا کوئی Blackmailing کا ارادہ...... تو نہیں...... کہیں...... ایسا ہی تو نہیں...... یا...... شاید Emotional Blackmail۔

......☆☆......

فیصل ان دنوں اکثر اُس کے یہاں دو تین گھنٹے گزارتا۔ تقریباً ہر شام...... کبھی اکبر علی کی

موجودگی میں......کبھی اس کی غیر حاضری میں......اور ملیحہ سوچوں میں کھو جاتی۔

یہ مجھے کسی مصیبت میں تو نہیں ڈالنے جا رہا......آخر اسے......چاہیئے کیا مجھ سے......میرا اس کا جوڑ کیا ہے......ڈھلتی شام میں......یہ روشن دن بھلا......کیا تلاش کرتا ہے...... یہ سب دھوکا ہے......جانے کیا ارادے ہیں اس کے......عافیہ سے دور ہے یہ......یہاں اکیلا......کیا سوچ رکھا ہوگا اس نے۔کوئی بہروپیا......ہوگا......کوئی......ہاں یقیناً......

......☆☆......

ملیحہ کا مدتوں سے فریب کھاتا آ رہا دل اس خیال پر آ کر ٹھہر گیا۔اگلے دن فیصل کا فون آیا تو اس نے کہلوا دیا کہ گھر میں نہیں ہے۔

پھر......کہ سو رہی ہے۔

پھر......کہ صاحب کے ساتھ باہر گئی ہے۔

پھر......گھر میں مہمان آئے ہیں۔

ایسے ایسے بہانے دن میں درجن بھر بار بننے لگے......کہ وہ کئی بار فون کرتا......وہ کئی بار منع کروا دیتی۔

......☆☆......

''اُف......شکر ہے......آواز تو سنائی دی......''ایک دن بہت صبح فیصل نے فون کیا تو ملیحہ نے ہی اٹھایا تھا۔

''ہاں......کیسے ہو......میں ذرا مصروف رہی......''وہ مضبوطی سے بولی۔

''ایسی بھی مصروفیت......ہماری یاد بھی نہ آئی......آپ کو......''اس کی آواز میں شکوہ تھا۔

''واقعی نہیں آئی......کچھ مہمان......کچھ باہر......''وہ کچھ اونچی آواز میں ہنسی۔

''دھوکا دے رہی ہیں نا......خود کو......یہ کھوکھلی ہنسی......''وہ دفعتاً اداسی سے بولا۔

''دھوکا تم دے رہے ہو خود کو......''وہ سنجیدگی سے بولی۔

''کیا......کیا آپ نے......واقعی مجھے یاد نہیں کیا۔کیا آپ واقعی بہت خوش ہیں میرے

وہاں آئے بنا...... کیا......"

"ہاں...... ہاں...... ہاں...... سمجھے......؟" اُس نے چیخ کر کہا اور فون بند کر دیا۔ اکبر علی سو رہے تھے۔ ملیحہ باغیچے میں ننگے پاؤں ٹہل ٹہل کر روتی رہی۔ اس کے بعد پورا دِن فیصل کا فون نہیں آیا...... دوسرے دن بھی نہیں اور تیسرے دِن بھی نہیں...... چوتھے دِن ملیحہ کو اچانک تشویش ہونے لگی...... اس نے صبح فون کیا...... کسی نے اٹھایا نہیں...... شام کو بھی نہیں...... رات دیر سے کیا، جب بھی کوئی جواب نہیں آیا۔

......☆☆......

تین دن ملیحہ کے فون کے انتظار میں...... فیصل رویا تھا جبکہ وہ پہلے اپنی یادداشت میں کبھی نہیں رویا تھا۔ جب بھی اس کا دل بھر آیا وجہ ملیحہ ہی رہی۔

......☆☆......

تیسرے دن تک جب ملیحہ کا فون نہیں آیا تو برداشت کی ختم ہوتی ہوئی سکت کو فیصل نے نیند کی گولیاں کھا کر بہلانا چاہا کہ سو جائے گا تو شاید آرام ملنے کے بعد برداشت کا مادّہ کچھ بڑھ جائے۔

جبھی عجیب سے خوف کے زیر اثر ملیحہ کھنچی سے اس کے یہاں پہنچی۔ دہلیز کے باہر دو دن کے اخبار رکھے تھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ دروازے سے ملحقہ کھڑکی کی جالی کو کسی طرح تھوڑا سا توڑ کر ملیحہ کے ڈرائیور نے اندر کی چٹخنی ہاتھ ڈال کر کھول لی کہ مسلسل بجتی ہوئی دروازے کی گھنٹی کا کوئی جواب نہ آ رہا تھا۔

فیصل پوری طرح بے ہوش تھا۔ ملیحہ نے ڈاکٹر بلوالیا اور آدھے دن کی مسلسل کوشش کے بعد وہ ہوش میں آیا۔

"میں نے...... دعا مانگی تھی...... کہ میری زندگی آپ کو مل جائے۔"

اُس نے ملیحہ کے ہاتھ سے بازار سے منگوایا ہوا جوس لیتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ پاگل ہی رہو گے...... مجھے تو مرنا ہی ہے تم سے پہلے...... بہت پہلے......" اُس

کی آواز میں الجھن سی تھی۔

''پہلے میں نے مانگا تھا کہ...... مجھے موت آجائے...... پھر میں نے سوچا کہ...... آپ میرے بنا...... کیسے جئیں گی......''

کتنے اعتماد سے کہہ رہا تھا وہ...... ملیحہ حیرت زدہ سی رہ گئی۔

''تم تو...... سچ مچ ہی پاگل ہو......''

''کہہ لیجئے۔ ثابت کردوں گا ایک دن...... یہ سب باتیں...... پھر میں نے کہا کہ...... ایک ساتھ اٹھالے ہم دونوں کو...... تو ہم میں سے کوئی تڑپے گا نہیں...... آپ...... یہ کہنا چاہتی ہیں نا کہ آپ کو مجھ سے کوئی مطلب نہیں......؟ ...... سسک سسک کر مر جائیں گی آپ...... دم گھٹ جائے گا آپ کا...... میرے بغیر...... وہ...... مار ڈالے گا...... آپ کو وہ...... اصغر علی......'' وہ کمزور معلوم ہو رہا تھا۔

''کون......؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''وہی جسے لوگ اکبر علی کے نام سے جانتے ہیں...... میں جانتا ہوں کہ...... کہ اپنے قد و قامت کی طرح...... وہ اندر سے اور بھی زیادہ چھوٹا ہے...... اصغر علی ہونا چاہیئے تھا۔ اُس کا نام۔ اکبر علی کی بجائے......''

ملیحہ بے ساختہ مسکرادی۔ وہ بھی مسکرادیا۔

''کبھی فون پٹخ کر......'' وہ شکوہ بھری نحیف آواز میں بولا......

موت آجائے گی مجھے...... پھر...... پھر...... ایسا نہ کیجئے گا......''

''نہیں...... کروں گی......'' وہ سر جھکائے شرمندہ سی آواز میں بولی۔

اُس کے بعد ملیحہ نے واقعی اس سے کوئی بے رخی نہیں برتی...... فون کرتا تو خوشدلی سے بات کرتی...... گھر آتا تو بھی۔

اس دوران ملیحہ نے ماں اور بچّے کا مجسمہ بالکل مکمل کرلیا تھا۔ اس دن وہ بہت خوش معلوم ہو رہی تھی۔

''آج میرا کام پورا ہو گیا فیصل......'' اس نے فیصل کو فون کر کے چھلکتی ہوئی خوشی سے بھری آواز میں کہا۔

''کون سا...... بچّے والا نا؟''

''ارے مبارک ہو......اسے تو Celebrate کرنا چاہیئے ...... ہے نا......؟'' وہ سن کر بہت خوش ہوا۔

''ہاں......کرنا تو چاہیئے۔''

''مگر میں پارٹی دوں گا......کہاں، یہ آپ بتائیں......شیرٹین......تاج...... میریڈین ......یا......'' وہ گرم جوشی سے بولا۔

''جی نہیں......گھر پر......میرے گھر کے برآمدے میں......تم اور میں بیٹھ کر چائے نوش کریں گے......اور مجسّمے کی تعریف کریں گے......'' وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

''وہ تو ہم روز کرتے ہیں وہاں......مگر......آئیڈیا برا نہیں ہے۔'' وہ بھی ہنسا۔

''میں سوچ رہا تھا......ایک Exhibition ہو جائے آپ کے مجسموں کی......'' اُس شام برآمدے میں چائے پیتے ہوئے فیصل نے ملیحہ سے کہا۔

''کیا......ایسا ہو سکتا ہے......'' وہ مسرّت بھری بے اعتباری سے بولی۔

''Of Course ہو سکتا ہے۔ میں کسی Photo Journalist سے تصویریں اتروا‌ؤں گا سب کی...... آپ تہہ خانے میں انہیں......ذرا ترتیب سے لگوا لیجیئے گا...... ایک طرف...... بس......ذرا دور دور۔''

''نہیں...... برا لگے گا انہیں......'' اس کی نظروں کی چمک یکا یک غائب ہو گئی۔

''کس کو......او......اصغر علی صاحب کو......نہیں لگے گا۔'' وہ مسکرایا۔

''ان کی اجازت سے ہی ہو گا......''

''وہ کبھی اجازت نہیں دیں گے......اور ویسے بھی انہیں تہہ خانے کا Renovation کرانا ہے...... کہتے ہیں خوامخواہ جگہ گھیر رکھی ہے......اس لیے میں نے ان سب مجسموں کو ایک

جگہ کر دیا ہے کونے میں......"

"ہم کوشش تو کر سکتے ہیں...... ہے نا......" وہ نرمی سے سمجھانے کے انداز میں بولا۔

"پھر......ورنہ......کوئی اور انتظام کرلیں گے......اور تروینی کلا سنگم میں نمائش......"

"یہ تو خوابوں کی باتیں ہیں فیصل......میرے نصیب میں کہاں اتنی بڑی خوشی۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی......ہوگی اور ضرور ہوگی۔ میں بات کروں گا نا، انکار نہیں کریں گے۔ اتنے بھی برے نہیں ہیں بھائی وہ......"

"جو شخص سرے سے ہی اس کے خلاف ہو......وہ نمائش کی اجازت کیسے دے دے گا......اور تمہارے کہنے سے کہیں...... کہیں......کچھ زیادہ ہی برا نہ مان جائیں...... پھر......رہا سہا سکون بھی......نہیں فیصل......جانتے ہو۔ ماں اور بچّے کے اس مجسمے کے بعد......میں خود اپنے آپ کو اتنا مکمل سمجھ رہی ہوں......کہ جیسے......جیسے اب مجھے اور کچھ تخلیق ہی نہیں کرنا......جیسے میں نے سب سے بڑا کارنامہ انجام دے دیا ہو......جیسے......جیسے......"

وہ ہنس کر خاموش ہوگئی۔

......☆☆......

بہت پہلے ایک دفعہ پھاٹک کے ستون بنانے کے لیے لائے گئے ایک پتھر کو ملیحہ نے ملازم سے اٹھوا کر تہہ خانے میں رکھوایا تھا کہ گرنے سے پتّھر کا بڑا سا حصّہ ٹوٹ گیا تھا اور دوسرا کوئی پتّھر اس جسامت کا نہ تھا کہ دونوں کو دو ستونوں میں استعمال کرلیا جاتا۔ ملیحہ کو اس میں ایک خوبصورت مجسمہ نظر آ گیا تھا جو بعد میں چھاتی تک تراشتے ہوئے وجیہہ شانوں والے مرد کے مجسمے کی صورت میں سامنے آیا......مگر اکبر علی پتھر تہہ خانے لے جانے سے چراغ پا ہو گئے تھے......سب مزدوروں کے سامنے ناراضگی کا اظہار کیا تھا......جانتیں نہیں......کتنا مہنگا ہے آج پتھر......ضایع کرنے کے لیے نہیں منگوائی جاتیں...... یہ چیزیں......حقارت سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا تھا اور منہ پھیر لیا تھا۔

ملیحہ کو سارا واقعہ من و عن یاد تھا......درد اُس کے چہرے پر ظاہر ہو گیا۔

''یا یوں بھی...... ہو سکتا ہے کہ......'' فیصل نے اسے اداس ہوتے دیکھ کر کہا۔

''کہ تہہ خانہ جب...... خالی ہو گا تو انہیں کام کروانے میں آسانی ہو گی...... پھر تو وہ خوشی سے تیاّر ہو جائیں گے...... ہے نا؟''

''ہو سکتا ہے...... شاید......'' وہ بے یقینی سے بولی۔

''پہلے...... گیلری بک کروانا ہو گی...... تاریخ ملتے ہی ان سے بات۔''

''ہاں...... شاید...... یہ ٹھیک رہے گا......''

جس دن ملیحہ اور فیصل ہال بک کرنے کے لیے پیشگی رقم دینے آرٹ گیلری گئے تھے اسی دن مزدور آ گئے تھے۔ سارے کام اکبر علی خود کرواتے تھے، کسی کی اطلاع اور مشورے کے بغیر۔ لہٰذا اس دن بھی ایسا ہی ہوا۔ تہہ خانے کا سارا کوڑ کباڑ، اینٹ پتھر وغیرہ نکال دیا گیا تھا اور دونوں دالانوں کی درمیانی دیوار توڑ کر اسے وسیع ہال بنانے کے لیے کام شروع ہو چکا تھا۔ مجسّمے باغیچے میں باورچی خانے والی دیوار کے ساتھ رکھوائے جا چکے تھے۔ اکبر علی کے دفتر کے منیجر کی نگرانی میں یہ کام ہو رہا تھا۔ مجسّموں کے تحفظ کی صاحب کی طرف سے کوئی ہدایت نہ تھی اور بیگم صاحبہ گھر پر موجود نہ تھیں۔

......☆☆......

لوٹتے وقت ملیحہ کو گھر چھوڑ کر فیصل باہر ہی سے چلا گیا تھا۔ ایک فوٹو جرنلسٹ سے اس کی ملاقات کا وقت طے تھا۔

اُس شام جب فیصل فوٹو جرنلِسٹ کو لے کر ملیحہ کے یہاں پہنچا۔ تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ ملیحہ اپنے تازہ ترین شاہکار کے قریب بیٹھی تھی...... بچّے کا مجسمہ جو ماں کے پہلو سے ٹوٹ کر الگ ہو گیا تھا۔ وہ اسے ماں کے مجسّمے کے ساتھ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پتھروں کی طرح زمین پر پھینکے جانے سے کئی مجسّمے کہیں کہیں سے ٹوٹ گئے تھے۔ بچّے کا مڑا ہوا گھُٹنا بھی، جس کے سہارے مجسّمے کا توازن برقرار رہتا تھا، ٹوٹ گیا تھا۔ ملیحہ کبھی گھٹنے کا اور کبھی باقی کا حصّہ ساتھ ساتھ رکھتی مگر کوئی کسی طرح ٹھیک نہ بیٹھ پاتا۔

فیصل فوٹو گرافر کو لے کر کب آیا ملیحہ کو خبر ہی نہ ہوئی اس کا چہرہ دیوار کی طرف تھا۔ وہ کچھ لمحے فوٹو گرافر کے ساتھ کھڑا چپ چاپ یہ منظر دیکھتا رہا۔ اُس نے جب ملیحہ کے جسم کو وقفے وقفے سے ہلکے ہلکے لرزتے دیکھا تو وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ ملیحہ اُس کی طرف پلٹی۔

ملیحہ کی وحشت زدہ سی آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ اُس نے دونوں رخسار ناخنوں سے نوچ ڈالے تھے۔ لکیروں پر خون جم چکا تھا۔ اس کی سانسیں بے ترتیب چل رہی تھیں۔

''یہ...... یہ...... یہ دیکھو...... فیصل...... فیصل۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولی۔

''سب...... مر گئے......''

اس نے ہاتھ سے ماں اور بچّے کے مجسّمے کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ دیکھو...... یہ...... یہ ماں کے پاس بیٹھتا ہی نہیں......'' اُس نے بچّے کے سر پر دنوں ہاتھ رکھ دیئے۔

''اس کا گھٹنا...... ٹوٹ...... گیا۔'' اُس نے فیصل کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں جانے کب کے ٹھہرے ہوئے آنسو اُمڈ آئے۔

''اب...... کیا...... کیا...... ہوگا......'' اُس نے دونوں ہاتھ فیصل کے شانوں پر رکھ دیئے اور بلک بلک کر رو پڑی۔

''اب کچھ نہیں ہو سکتا...... فیصل...... سب مر چکے......'' اُس نے ہچکیاں لے کر کہا اور بے ہوش ہوگئی۔ اس کے گھاس پر لڑھکنے سے پہلے فیصل نے اسے شانوں سے تھام لیا تھا۔

فوٹو گرافر نے فن کے ایسے نادر نمونے پہلے کبھی دیکھے تھے نہ ایسی فنکارہ۔ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تصویریں کھینچنے لگا۔

جب ملیحہ کو ہوش میں لایا گیا تو وہ بالکل پُر سکون تھی۔

اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی...... سب کو باری باری دیکھا۔ ڈاکٹر کو...... فیصل کو...... اکبر علی کو......

اس کی نظریں اکبر علی پر ٹھہر گئیں۔

''سب.....مر گئے.....''اس نے نہایت معصومیت سے اطلاع دی۔''کوئی نہیں بچا..... سب.....مر گئے.....سب مر گئے۔'' وہ رُک رُک کر بولی۔''سب مر گئے، سب مر گئے سب!'' اُس نے جلدی جلدی کہا۔ پھر چُپ ہوگئی اور پلنگ سے اُٹھ کر کھڑی ہوگئی اور چیخ چیخ کر یہی جملہ دہرانے لگی اور پھر آہستہ آہستہ دہراتی رہی۔

''اوہ.....یہ تو سچ مچ ہی.....''اکبر علی حسبِ معمول بے تاثر چہرہ لیے پُرسکون لہجے میں بولے۔

''نہیں.....سچ مچ.....یعنی کہ.....''فیصل نے تشویش ناک لہجے میں جلدی سے کہا۔

''ہاں.....سچ مچ پاگل ہوگئی ہے.....میں کہتا تھا نا کہ یہ.....''اکبر علی بولا۔

''نہیں.....یہ وقتی طور پر صدمے کا اثر ہے۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں.....ٹھیک ہوجائیں گی.....میں کچھ دوائیں لکھ دیتا ہوں.....''

ڈاکٹر نے دواؤں کی لمبی سی فہرست میں زیادہ تر نیند کی گولیاں ہی لکھی تھیں۔

مگر گزرتے وقت نے ثابت کر دیا کہ ملیحہ کی یہ حالت وقتی نہ تھی۔ وہ اپنے وجود سے بالکل بے خبر ہو چکی تھی۔ ایک جگہ بیٹھتی تو بیٹھی رہ جاتی۔ کھانے پینے کا کوئی ہوش نہ پہننے اوڑھنے کا احساس۔ پتھر کی مورت سی کسی شے کو گھورتی رہ جاتی۔ کوئی بات کرتا تو جواب نہ دیتی۔ بار بار پوچھتا تو جھنجھلا کر رونا شروع کر دیتی۔ بالکل بچّوں کی طرح۔

اکبر علی نے اس کے لیے علاحدہ کمرے کا انتظام کروا دیا تھا اور اسے ایک نرس کے سپرد کر دیا تھا۔

فیصل کئی ڈاکٹروں سے اس کا معائنہ کروا چکا۔ مگر کوئی علاج کارگر ہوتا نظر نہ آرہا تھا۔ فیصل اسے ہر شام دیکھنے آجاتا اور دیر تک وہیں رکتا، جب تک وہ سو نہ جائے۔ کبھی کبھی اکبر علی سے ملاقات ہو جاتی اگر وہ جلد آجاتے۔ اب وہ کچھ زیادہ دیر سے گھر آنے لگے تھے۔ اُن کا کام شاید بڑھ گیا تھا۔ مزاج اور معمول میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی بلکہ پہلے کے مقابلے کچھ کم بولنے لگے تھے اور تہہ خانے کی اپنی نگرانی میں مزید تزئین کروا رہے تھے۔ وہاں اُن کا ایک پرائیوٹ آفس

کھولنے کا ارادہ تھا۔

......☆☆......

فیصل کی صحت کچھ گر گئی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار صاف عیاں رہا کرتے تھے۔ وہ ملیحہ کو بچوّں کی طرح بہلانے کی کوشش کرتا۔ مسکراتا اور ہنستا بھی...... مگر اس کے چہرے پر کوئی تاثر پیدا نہ ہوتا۔ وہ بس اُسے دیکھتی رہتی ٹکر ٹکر۔ کسی طرح کمرے سے باہر آنے پر بھی راضی نہ ہوتی۔ تازہ ہوا کے لیے نرس اگر نیم غنودگی کے عالم میں اسے فیصل کے سہارے باہر لے بھی آتی تو وہاں بھی وہ کسی شے پر ٹکٹکی باندھے رہ جاتی۔

......☆☆......

اگر مجسّموں ان ٹوٹے ہوئے مجسّموں کی نمائش کردی جائے تو شاید...... شاید ملیحہ ہوش میں آجائے...... کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

فیصل نے کئی بار سوچا تھا اور ایک دن مجسّمے اٹھوالایا تھا۔ اکبر علی نے کبھی پوچھا تک نہ تھا کہ مجسّمے کیا ہوئے۔

تہہ خانے میں ردّوبدل زوروں پر تھا۔ اُدھر جانے والے زینے کی شکل بالکل بدل گئی تھی۔ اب وہاں گہرے سبز سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر اخروٹ کی منقش لکڑی کے فریم والا ہلکے ہرے رنگ کا نقشیں کانچ لگا دروازہ لگ گیا تھا۔

ادھر کئی دنوں سے ملیحہ میں ایک تبدیلی یہ آئی تھی کہ وہ اب کمرے سے نکل کر اس کانچ کے دروازے تک چلی جاتی اور اس کے آس پاس دیکھ کر پلٹ آتی۔ چپ چاپ پریشان سے چہرے پر پھٹی پھٹی آنکھیں لیے۔

کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہا اور پھر ایک شام ملیحہ نے دروازے کو اپنے ہاتھوں سے توڑ دیا۔ اگر نرس آواز سن کر بروقت بھاگی نہ آتی تو ملیحہ ٹوٹے کانچ کے درمیان سے اندر گھسنے کی کوشش میں خود کو بری طرح زخمی کرسکتی تھی۔ اکبر علی جب آئے تو انہوں نے لمبی لمبی بیلوں اور بڑے بڑے پھولوں والے ہلکے ہرے رنگ کے کانچ کی بے شمار کرچیں غلام گردش میں نسب

پیلی روشنی والی بتیوں کے عکس سے جھمل جھلمل کرتی دیکھی تھیں۔

اگلا دن نمائش کا آخری دن تھا۔

اسے ایک بار ملیحہ کو کلاسنگم لے جانا ہی ہوگا...... کسی بھی طرح۔اُس نے فیصلہ کر لیا تھا۔کل وہ صبح جائے گا ملیحہ کے وہاں۔

گھر پہنچ کر اُس نے اپنے آپ کو صوفے پر گرادیا۔کچھ لمحوں بعد ہی غفور نے فون کر کے بتایا کہ صاحب، بیگم صاحبہ کو پاگل خانے چھوڑ آئے ہیں۔وہ الٹے پاؤں گھر سے باہر نکلا اور پاگل خانے پہنچ کر ہی دم لیا۔وہاں کا منظر دیکھ کر اس کی روح کانپ گئی ملیحہ کے لمبے بال دھول میں اٹے بکھرے ہوئے تھے۔اُس کے چہرے پر بے شمار خراشیں تھیں اور وہ فرش پر بیٹھی بلک بلک کر رو رہی تھی۔سلاخوں سے بنی Grill کے اس طرف موٹی توند والا چوکیدار اور اس کے دو ہم شکل اتنی زور زور سے ہنس رہے تھے کہ ان کا بدن قہقہوں کے ساتھ ہچکولے کھا رہا تھا۔قدموں کی آہٹ سن کر اس نے دوسری جانب دیکھا۔اکبر علی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر جا رہا تھا۔فیصل کا خون کھول اُٹھا۔

''اصغر علی......''

وہ پوری طاقت سے چیخا......اور......آنکھیں کھول دیں۔صوفے پر آڑھا لیٹا وہ پسینے میں نہا گیا تھا۔کونے میں رکھی قوسیہ میز پر ریڈیم لگی سوئیوں والی گھڑی اندھیرے میں اکیّس بجا رہی تھی۔اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھتا ہوا وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

اُسے کل ملیحہ کو اپنے ساتھ آرٹ گیلری لے جانا ہے...... یہ بے حد ضروری ہے......اس نے اطمینان سے سوچا اور نہانے چلا گیا۔

نہا کر وہ خود کو کچھ تازہ دم محسوس کرنے لگا مگر ذہنی طور پر مسلسل سوچوں میں گم رہا......

سونے کی کوشش میں جب وہ گھنٹوں کروٹیں بدل چکا تو آخر کار اس نے سرہانے کے قریب مسہری میں لگی دراز میں سے نیند کی گولیاں نکالی اور دو گولیاں کھا کر سکون سے سو گیا......

اگلی صبح وہ غفور کے فون سے بیدار ہوا تھا۔

''صاحب، بیگم صاحبہ کو دماغی ہسپتال لے جا رہے ہیں...... سسٹر سے کہہ رہے تھے کہ برقی جھٹکوں سے وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔''

یہ خواب نہیں تھا۔

جانے ملازم نے اور کیا کیا کہا تھا۔

فیصل جب عجلت سے تیار ہو کر نکلا تو دہلیز کے قریب پڑے اتوار کی صبح کے روزانہ سے کئی گنا بھاری گول گول لپیٹے گئے اخبار کا ربر اُس کے پاؤں کی ٹھوکر سے ٹوٹ گیا تھا اور فنونِ لطیفہ سے متعلق صفحات پر عظیم فن کارہ ملیحہ اکبر علی پر لکھا گیا تفصیلی مضمون چھپا تھا اور ساتھ میں ٹوٹی ہوئی مورتیوں کے سامنے گھاس پر بیٹھی ملیحہ اکبر علی کی مختلف زاویوں سے لی گئی کئی تصویریں بھی۔

اپنے ہی ناخنوں سے کھرچے گئے رخساروں پر پھٹی پھٹی آنکھوں میں لبالب بھر آئے آنسوؤں بھری تصویریں۔

مجسموں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے بے ہوش ہو کر گرتی ہوئی تصویریں۔

......☆☆......

فیصل جب ملیحہ کے وہاں پہنچا تو وہ سو رہی تھی۔ اکبر علی باہر جانے کے لیے ڈرائنگ روم میں تیار بیٹھے تھے۔ عمدہ آفٹر شیو کی خوشبو پورے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ نیا ڈاکٹر آنے والا تھا۔

فیصل بغیر اکبر علی سے ملے سیدھا ملیحہ کے کمرے میں چلا گیا۔ کانچ توڑ کر ہاتھوں کو زخمی کر دینے کے بعد سے اسے کل شام ہی سلا دیا گیا تھا۔ آتی ہوئی سردیوں کی خوشگوار دھوپ اس کے بازو پر پڑ رہی تھی جس کے پٹی بندھے ہاتھ کی ساری انگلیاں سوجی ہوئی تھیں۔ دوسرا ہاتھ اس نے سر کے نیچے رکھا تھا جس کی زخمی ہتھیلی سر کے بوجھ سے دوبارہ خون آلود ہو گئی تھی......اور سفید پٹی لگی انگلیوں کے پوروں پر تازہ سرخی نظر آ رہی تھی......فیصل نے اس کا ہاتھ سر کے نیچے سے نکال کر سیدھا کیا......وہ بے خبر سوئی رہی۔ نرس نے اُس کے دو چوٹیاں گوندھی تھیں جو ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ آنکھیں حلقوں میں دھنسی چلی گئی تھیں۔ ناک کی لونگ شاید کہیں گر گئی تھی۔ چہرہ

دبلا ہو گیا تھا۔ فیصل اس کو کئی پل دیکھتا رہا...... نرس اس کے ہاتھ کی پٹّی بدل کر چلی گئی۔

فیصل نے ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھ دیا۔ وہ آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔

"آپ...... آپ......" وہ اس کے کان کے پاس سر جھکا کر اداسی سے بولا۔

"مت کیجئے اس طرح......"

اُس کی آواز بھرّا گئی۔

وہ اس کا سر سہلانے لگا۔

"میں بہت بڑا...... Studio بنواؤں گا...... ہر قسم کا پتھر...... دنیا کے ہر کونے سے......"

فیصل نے ماتھا اس کی مسہری کے کنارے ٹکا دیا۔

"......آپ اچھی ہو جائیں......"

وہ سوتی رہی...... وہ آنکھیں بند کیے روتا رہا......

اُس نے سر اُٹھا کر الٹے ہاتھ سے اپنی آنکھیں پونچھیں تو اس کی نظر دروازے کی طرف اُٹھ گئی جہاں اکبر علی، نرس اور دماغی ہسپتال کا باوردی ڈاکٹر کھڑے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اکبر علی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔

"نہیں...... مت لے جایئے۔ پاگل خانے......" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں...... میں اپنے گھر لے جاؤں گا...... وہیں علاج کرواؤں گا۔"

اُس نے ٹھہر ٹھہر کر مضبوطی سے کہا۔

"نہیں...... مجھے دے دیجیے......" وہ اکبر علی کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ جس پر قطعی کسی تاثر کی جھلک نہیں تھی اور وہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔

............●●●............

● ...... دیپک کنول

دُردانہ

[1]

گلمرگ کی گل پوش وادی سے پرے مغرب کی جانب جہاں گھنے جنگل ہیں اونچی اونچی پہاڑیاں ہیں اوران پہاڑوں کے تلیٹی میں پھول ہیں، پودے ہیں، ہری ہری گھاس ہے اوراس گھاس پرلرزتے شبنم کے وہ قطرے ہیں جورات نے اپنی سرگیں آنکھوں سے بہادیئے ہیں جب سورج کی پہلی روپہلی کرن ان پراپنا پرتو ڈالتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے قدرت نے اس دھرتی پر دودو ہاتھوں سے موتیوں کے خزانے لٹادیئے ہوں۔

یہاں سے جب ہم چہار سو نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایک لامتناہی کوہستانی سلسلہ نظر آتا ہے۔ چوٹیوں پر برف کی کلغیاں سجائے، بدن کو چیڑ اور صنوبر کے پیڑوں سے ڈھکے، اپنے تھنوں سے دودھیا پانی کی دھارائیں بہاتے، یہ پہاڑ چوکس سنتریوں کی طرح کھڑے نظر آتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ اگر ہم ان کے چنگل میں پھنس گئے تو یہاں سے بچ نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

شیرخان کے لئے یہ بندشیں، یہ بلندیاں کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔ وہ ایک آزاد پنچھی تھا جسے نہ ان گھنے جنگلوں سے ڈر لگتا تھا اور نہ ہی یہ پربت، یہ پہاڑ اُس کی راہ میں حائل ہوتے تھے۔ یہ جنگل اُس کا دوست تھا اور یہ پہاڑ اُس کے ہمراز تھے۔ وہ اس جنگل کے چپے چپے سے

واقف تھا۔وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گلمرگ کے غربی علاقے میں جو ندی بہتی ہے اُس ندی کے کنارے اُس کا کوٹھا ہے اور اُس پار کا جو علاقہ ہے وہ دشمن کا علاقہ ہے جہاں وہ نہیں جا سکتا۔

شیر خان ستائیس اٹھائیس سال کا ایک گبرو جوان تھا جس کے چہرے پر ایک ہلکی سی داڑھی بڑی بھلی لگتی تھی۔وہ ذات سے گوجر تھا۔وہ بڑا کم گو اور لاپرواہ قسم کا نوجوان تھا۔اُسے نہ ملکی سیاست میں کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی گھر کے معاملوں سے کوئی واسطہ۔اُس کا بوڑھا باپ شاہ باز خان اور اُس کی بوڑھی ماں ایک تنگ و تاریک کوٹھہار میں رہتے تھے۔کوٹھہار کے سامنے اُن کے مکئی کے کئی کھیت تھے اور کھیت کے پاس ہی کھونٹے سے بندھی دو بکریاں تھیں۔وہ ان بکریوں کو اپنی اولاد کی طرح پیار کرتے تھے۔کیونکہ وہ ان کے دودھ پر ہی گزارہ کرتے تھے۔ماں باپ کو یہ غم گھن کی طرح اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا کہ اُن کے بیٹے کا کیا ہوگا۔شیر خان غلط لوگوں کی سنگت میں پڑ چکا تھا۔وہ کئی طرح کے نشے کرتا تھا۔چرس اور گانجے کی ایسی لت پڑ چکی تھی کہ وہ اس نشہ کی خاطر کچھ بھی کر سکتا تھا۔گھر کے مالی حالات ایسے نہ تھے جو وہ آسانی سے اپنی اس لت کو پورا کر پاتا۔گھر کی حالت ایسی تھی کہ پانی پینے کے لئے روز کنواں کھودنا پڑتا تھا۔ایسے میں شیر خان نے اس کا آسان حل نکالا تھا۔پہلے پہل وہ چھوٹی موٹی چوریاں کرتا تھا۔اب تو وہ عادی چور بن چکا تھا۔

(۲)

جاڑے کی آمد میں اگر چہ ابھی وقت تھا مگر بکروالوں نے جاڑے سے پہلے ہی گرم علاقوں کی طرف کوچ کرنا شروع کر دیا تھا۔یہ اُٹھاؤ چولہے ایک جگہ ٹکتے نہیں۔سردیوں میں پیر پنچال کی پہاڑیوں کو پار کر کے جموں کے گرم علاقے کی طرف کوچ کرتے ہیں اور بسنت آتے ہی کشمیر کی پہاڑیوں کا رخ کرتے ہیں۔سینکڑوں میلوں کی مسافت،دشوار گزار راستے،قدم قدم پر خطرے،صبح سفر،شام سفر،جہاں رات ہوئی وہیں بسیرا کر لیا۔اس سفر میں اُن کا سچا ساتھی اور رہبر اُن کے کتے ہوا کرتے ہیں جو نہ صرف اُنہیں ہر خطرے سے آگاہ کرتے ہیں بلکہ اُن کے مال و مویشی کی حفاظت بھی کرتے ہیں۔

کالے خان بکروال نے جب دیکھا کہ رات کی سیاہی شام کے شفق زاروں پر سیاہی تھوپنے لگی تو اُس نے اپنے منتشر گلے کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور ایک خیمہ گاڑ کر اُس نے شیر خان کے کوٹھہار کے بالکل قریب ہی ڈیرہ ڈال دیا۔ بیوی روٹی پکانے میں لگ گئی جب کہ بچے خیمے میں جا کر دبک گئے۔ کالے خان نے کلہاڑی اُٹھا کر لکڑی اکٹھی کی اور خیمے کے باہر ایک الاؤ جلایا۔ اس الاؤ کے دوہرے فائدے ہیں۔ یہ جہاں گرمی پہنچاتا ہے وہیں جنگلی جانوروں کو گلے سے دور رکھتا ہے۔

رات نے اپنے سیاہ گیسو پوری طرح کھول لئے تھے۔ جنگل کا علاقہ تھا، ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سب لوگوں نے کھانا کھالیا۔ چونکہ وہ بہت تھک چکے تھے اس لئے کھانا کھاتے ہی اُنہیں جلدی نیند آ گئی۔ کالے خان بھی سو گیا۔ الاؤ اب بھی روشن تھا اور اُن کا کتا خیمے کے باہر پہرہ دے رہا تھا۔ بھیڑ بکریاں الاؤ کے اگل بغل بیٹھی ٹانگوں میں سر ڈالے بے فکری سے سو رہی تھیں۔ اچانک گھاس میں سرسراہٹ ہونے لگی۔ کتے کے کان کھڑے ہو گئے۔ اُس نے بھونکنا شروع کیا۔ کالے خان اتنا تھکا ہوا تھا کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کی آغوش میں سما چکا تھا۔ اس سے پہلے کتا شیر خان پر جھپٹ پڑے اور اُس کی تکا بوٹی کر کے رکھ دے، اُس نے ٹاٹ کی بوری کا منہ کھول دیا۔ جونہی کتے نے اُس پر حملہ کر دیا تو وہ بوری میں بند ہو گیا۔ وہ بدحواس ہو کر چھٹپٹانے لگا۔ شیر خان نے سرعت کے ساتھ ایک بھیڑ کو پکڑ کر کاندھے پر اُٹھا لیا اور پھر اندھیرے میں گم ہو گیا۔ جب تک کالے خان اٹھ کر باہر آ گیا۔ شیر خان بہت دور نکل چکا تھا۔ کالے خان نے کتے کو بوری سے آزاد کر دیا اور پھر وہ چور چور چلاتے ہوئے ادھر اُدھر بھاگنے لگا۔ ریوڑ میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ شور سن کر اُس کی بیوی بھی باہر آ گئی۔ وہ بھی اندھیرے میں چور کو تلاش کرنے لگی۔ چور اُن سے بھی زیادہ تیز رفتار اور چالاک نکلا۔

(۳)

گلمرگ کے بازار میں یوسف قصائی کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ صبح کا وقت تھا۔ یوسف دکان پر بیٹھا قیمہ کاٹ رہا تھا۔ اتنے میں شیر خان اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

جس طرح چابک دیکھ کے گھوڑا اپنے کان کھڑے کرتا ہے اسی طرح یوسف قصائی کے بھی کان کھڑے ہوگئے۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر جیب سے دو سو کے نوٹ نکال کر شیر خان کی طرف بڑھا لئے۔ شیر خان نے حیران ہو کے پوچھا۔

''اتنے موٹے بھیڑ کے صرف دو سو روپے؟''

''تو کیا دو لاکھ دے دوں۔ خود تو اپنی عاقبت بگاڑ ہی چکے ہو ساتھ میں میری آخرت بھی بگاڑ رہے ہو۔ چوری کے مال کے دام نہیں ہوتے۔ جو ملا اسے غنیمت سمجھو۔ اگر میں پکڑا گیا تو کیا تم چھڑانے آجاؤ گے۔ اب یہ پیسے جیب میں ڈال اور چپ چاپ یہاں سے نکل جا۔ کسی نے تمہیں میری دکان میں دیکھ لیا نا تو تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا لیکن میں رگڑے میں ضرور آجاؤں گا۔''

شیر خان نے بڑی بے دلی سے دو سو روپے لے کر جیب میں ٹھونس لئے اور چپ چاپ وہاں سے چلا گیا۔

(۴)

شاہ باز خان اور زیتون سوگواروں کی طرح کوٹھار کے باہر بیٹھے تھے۔ اُن کا بیٹا رات بھر سے غائب تھا۔ جب وہ گھر لوٹا تو اُس کے ہاتھ میں کچھ سامان تھا۔ جب زیتون نے اُسے دیکھا تو بجائے خوش ہونے کے وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح بپھر کر کھڑی ہوگئی اور اُس کا راستہ روک کر بولی۔

''رات بھر کہاں تھا تو؟ میں پوچھتی ہوں کمبخت کہاں مرنے چلا گیا تھا۔ کیوں ہاتھ دھو کر ہماری جان کے پیچھے پڑے ہو۔ آخر کیا بگاڑا ہے ہم نے تمہارا؟ چین سے تو جینے نہیں دیا، اب آرام سے مرنے بھی نہیں دو گے کیا؟ آخر یہ چوری چکاری کا دھندہ تم کب چھوڑو گے۔ اگر ہمارا جینا تمہیں پسند نہیں تو پھر ایک کرم کر ہم پر، گھونٹ دے ہمارا گلا۔ مار ڈال ہمیں۔ ایسے جینے سے مر جانا ہی اچھا ہے''

زیتون یہ کہہ کر روتے ہوئے دیوار کی طرف بڑھی اور دیوار سے سر پھوڑنے لگی۔ شاہ باز خان بت بنا بیٹھا تھا۔ جب زیتون سر پھوڑ کر اپنے آپ کو لہولہان کرنے لگی تو شیر خان کے

ہاتھ سے سارا سامان چھوٹ کر بکھر گیا۔ وہ پتھر تو نہیں تھا۔ ماں کی حالت دیکھ کر وہ ایک دم پگھل گیا۔ وہ ماں کی طرف لپکا اور اُسے روک کر اور پھر اُس کے گلے سے لگ کر روتے ہوئے بولا۔

''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں اماں، آج کے بعد میں کبھی چوری نہیں کروں گا''

شاہ باز خان جو ایک زندہ لاش کی طرح بے بسی سے یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا، اب کے اُس سے رہا نہ گیا اور وہ کسی قدر برہمی سے بولا:۔

''بس بس رہنے دے۔ بہت ہو گئے تمہارے وعدے۔ ایسے وعدے تو تم پہلے بھی ہم سے کر چکے ہو۔ پھر وہ قسمیں وہ وعدے کہاں گئے۔ کب تک تم ہمیں ان جھوٹے وعدوں سے بہلاتے رہو گے؟ کب تک؟''

''اس بار میرا یقین کر و ابو، یہ میرا آخری وعدہ ہے۔ آج کے بعد اگر میں نے کہیں چوری کی تو تم کلہاڑی سے میری گردن کاٹ ڈالنا۔ اب کے میرا یقین کرو ابو'' وہ باپ کے سامنے گڑ گڑاتے ہوئے بولا۔

شاہ باز خان کو لگا کہ بیٹے پر کلہاڑی چلانے سے پہلے ہی جیسے اُس کا جگر کٹ کٹ کے گر رہا ہو۔ بیٹے کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہتے دیکھ کر اُس کا کلیجہ چھلنی ہونے لگا۔ اُس نے شیر خان کو گلے لگایا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا:۔

''میرے بچے میں تمہیں نہیں، تمہارے اندر چھپے شیطان کی گردن کاٹ دینا چاہتا ہوں جس نے میرے بھولے بھالے بچے کو بدی اور بے ایمانی کے راستے پر ڈال دیا۔ دیکھ میرے بیٹے، اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ تو چاہے تو اب بھی سدھر سکتا ہے۔ بس تھوڑی بہت ہمت اور خود اعتمادی کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے تم ایسا کر سکتے ہو۔''

''ہاں ابو میں ایسا کر سکتا ہوں اور میں ایسا ہی کروں گا۔''

شاہ باز خان کو لگا جیسے شیر خان نے اپنے بدن سے گناہوں کا سارا میل اور بدکاری کا سارا کیچڑ جھٹک دیا ہو اور اب وہ صاف و شفاف ہو کے اُس کے سامنے آ کے کھڑا ہوا۔ شاہ باز نے بیٹے کی پیشانی چوم لی اور پھر جوش اور اعتماد کے ساتھ اُس سے گویا ہوا:۔

''مجھے پورا یقین ہے میرے بچے، تو ایسا کر سکتا ہے اور تو ایسا ہی کرے گا۔''

زیتون کی بجھی بجھی آنکھوں میں اُمید کے دیئے جگمگا اُٹھے۔

(۵)

دلنواز خان اس بستی کا مقدم تھا۔ دلنواز خان ساٹھے پاٹھے میں تھا۔ بڑا رنگین مزاج آدمی تھا وہ۔ وہ ساری دنیا کی خوبصورتی کو اپنے دل میں سما دینا چاہتا تھا۔ پیٹھ پیچھے لوگ اُس کی برائی کرتے رہتے تھے مگر منہ لگتی کوئی نہیں کہتا تھا۔ دلنواز خان نے بستی میں ایسا داب بٹھا کے رکھا تھا کہ اس کی اجازت کے بنا پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ بستی میں کوئی قضیہ ہو تو سلجھانے کے لئے دلنواز خان موجود تھا۔ چوری چکاری یا بدکاری کا کوئی واقعہ ہو، معاملہ دلنواز خان کی عدالت میں جاتا تھا۔ وہی منصف بھی ہوتا تھا اور جلاد بھی۔

دلنواز خان کی عدالت گھر کے چوبارے میں ہی لگتی تھی۔ ایک تو نذر و نیاز کی تشہیر نہیں ہوتی تھی۔ دوم یہ کہ دلنواز خان کا دبدبہ دیکھ کر اُس کی دونوں بیگمات بھی مرعوب ہو جاتی تھیں۔

اُس دن اسلم خان ایک پیڑ کے ساتھ بندھا تھا۔ اُس پر یہ الزام تھا کہ اُس نے شاہنواز خان کی بیٹی گلنار پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس دن بستی کے سارے گوجر صبح سے ہی دلنواز خان کے گھر پر آ کر جمع ہو گئے تھے۔ یہ بھولے بھالے گوجر دلنواز خان کو اپنے مسیحا سمجھتے تھے اور اُس کے ہر فیصلے پہ لبیک کہتے تھے۔

جمعہ خان جو کہ دلنواز خان کا خاص اور معتبر آدمی تھا۔ یوں کہیئے وہ اُس کا داہنا ہاتھ تھا، وہ ہمیشہ دلنواز خان کے ساتھ رہتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ دلنواز خان کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ بس عقل ذرا کمزور تھی۔ جمعہ خان عملی طور ایک مشیر کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ جہاں دلنواز خان کوئی احمقانہ فیصلہ سنانے کی کوشش کرتا جمعہ خان اُسے سنبھالتا تھا اور اُسے غلطیاں کرنے سے باز رکھتا تھا۔ ساتھ ہی وہ دلنواز خان کی بیگموں کا انتخاب بھی کیا کرتا تھا۔

دلنواز خان نے جب اسلم خان سے اپنا گناہ قبول کرنے کے لئے کہا تو وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس نے اپنے اوپر لگائے گئے سارے الزامات کو

بنیاد اور فرضی بتا دیا۔ دلنواز خان، اسلم خان کے بیان سے بہک سکتا تھا مگر جمعہ خان کہاں چوکنے والا تھا۔ اُس نے اسلم خان کو آڑے ہاتھوں لے کر کہا:۔

''اسلم خان جس الزام کو تم جھوٹ کہہ رہے ہو، اگر یہ جھوٹ ہے تو بہت ہی تکلیف دہ جھوٹ ہے۔ کیونکہ ایک بدنصیب لڑکی اگر اپنی عزت و عصمت، اپنے نام و ناموس کو انصاف کی سولی پر چڑھاتی ہے۔ اپنی فریاد پنچوں کی چوکھٹ تک لاتی ہے تو سوچو یہ جھوٹ، کتنا حقیقت آمیز ہوتا ہے۔ اسلم خان جھوٹ گلنار نے نہیں بولا ہے بلکہ جھوٹ تم بول رہے ہو۔ کیونکہ جب سچ تکلیف دہ بن جاتا ہے تو ہر مجرم اسے جھوٹ کے لبادے میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ تم بھی ایک تکلیف دہ سچ کو جھوٹ کے لبادے میں چھپانے کی کوشش کرر ہے ہو''

دلنواز خان کو لگا کہ ساری واہ واہی جمعہ خان لے جائے گا اس کی وہ اُس کی بات کاٹ کر بولا۔

''اسلم خان ہم سمجھ سکتے ہیں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ ہم یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ جوانی میں انسان سے ایسی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، کیونکہ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ مگر یہ سب کچھ جان کر بھی ہم تمہارے ساتھ کوئی نرمی نہیں برتیں گے کیونکہ اس بستی کی یہ روایت رہی ہے کہ کانٹا اگر دامن سے اُلجھ جائے تو دامن کو کھینچو مت، کانٹے کو نکال دو۔

ہم تمہیں سزا دیں گے۔ کل صبح اسی چوپال میں تمہیں کوڑوں سے پیٹا جائے گا اور تب تک تم پر کوڑے برستے رہیں گے جب تک تم ان کوڑوں کی مار سہنے کے قابل رہو گے۔ یہ دلنواز خان کا فیصلہ ہے''

لوگوں کی آنکھیں اس فیصلے سے چمک اُٹھیں۔ کئی لوگوں نے جوش میں آ کر تالیاں بجائیں۔ اس سارے شور و غل میں اسلم خان کی آہ و فغاں دب کر رہ گئی۔

(۶)

اگلی صبح بڑی ہی سہانی اور خوشگوار تھی مگر اسلم خان کے لئے یہ صبح بڑی ہی منحوس اور تکلیف دہ تھی۔ اُسے ایک بار پھر لکڑی کے کھمبے سے باندھ دیا گیا تھا اور اردگرد بہت سارے لوگ بیٹھے تھے۔ شیر خان پاس کے کھیتوں میں اپنے باپ کے ساتھ بیٹھا یہ سارا تماشہ دیکھ رہا

تھا۔ایک گرانڈیل سا گوجر ہاتھ میں کوڑا لئے اسلم خان کے قریب کھڑا تھا۔اسلم خان سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔اُس کا چہرہ زرد پڑا تھا۔دلنواز خان کا اشارہ پاتے ہی جونہی اُس پر پہلا کوڑا پڑا تو اُسے لگا جیسے کسی نے آگ میں لال کیا چمٹا اُس کے ننگے بدن پر رکھ دیا ہو۔جب دوسرا کوڑا پڑا تو وہ درد کے مارے چلانے لگا۔وہ جتنا تڑپتا اور چلاتا جا رہا تھا،لوگ اُس کے تڑپنے پر اُتنا ہی مزہ لے رہے تھے۔انسانی جبلت بھی حیوانی جبلت سے کچھ کم نہیں ہوتی ہے۔شیر جب ہرنوں کے جھنڈ پر حملہ کر دیتا ہے اور ایک ہرن کو اُٹھا کر لے جاتا ہے تو دوسرے ہرن بھاگ جاتے ہیں۔جب شیر اُس کی تکا بوٹی کرنے لگتا ہے تو یہی ہرن پاس میں ہی گھاس سے اٹھکیلیاں کرنے لگتے ہیں،یا دور کھڑے تماشہ دیکھنے لگتے ہیں۔

''بیچارا اسلم خان'' شیر خان ایک آہ بھر کر بولا۔

''بیچارا کاہے کا؟'' شاہ باز خان غصے سے بولا ''میں کہتا ہوں اس کمینے کو کتوں سے نچوانا چاہیئے تھا۔ایسے بدکار کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں''

شیر خان باپ کے ساتھ حجت نہ کر سکا۔وہ ملزم کی حمایت میں بہت کچھ بولنا چاہتا تھا پر باپ کی ایک غراہٹ سے اُس کی زبان پر تالا پڑ گیا۔وہ ایک گناہ گار تھا چاہے گناہ کی نوعیت جدا کیوں نہ ہو،جرم بہر حال جرم ہے۔وہ چپ چاپ اُٹھ کر گھر کی جانب چل دیا۔

(۷)

دن گزرتے گئے۔ایک دن دلنواز خان شام کے وقت اپنے کمرے کے دروازے میں اندر سے کنڈی لگا کر لکڑی کے صندوق میں رکھے گئے روپے پیسے گننے لگا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔دلنواز خان کے اوسان خطا ہو گئے۔بدحواسی میں اُس نے ہبڑ دبڑ صندوق میں روپیہ واپس ڈال کر اسے بند کر لیا اور پھر لپک کر دروازہ کھولنے لگا۔دروازہ کھلا تو سامنے دوسری بیگم کھڑی تھی۔دلنواز خان کے اوسان ابھی تک بحال نہیں ہوئے تھے۔بیگم کو دیکھا تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔

''کون سی آفت پڑی تم پر۔کوئی چور لٹیرا تمہارے پیچھے لگا ہے کیا جو تم نے اس طرح

دروازہ ٹھوک لیا۔ بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے دروازہ پیٹنے کا؟'

''مجھے کیوں ڈانٹ رہے ہو جی'' بیگم روہانسی ہو کر بولی۔ ''میں سمجھی کوئی چور ڈاکو کمرے میں گھس آیا ہے''

''کس چور کے برے دن آئے ہیں جو دلنواز خان کے گھر میں گھس کر چوری کرے۔ تمہیں نہیں معلوم دلنواز خان کس بلا کا نام ہے۔ دلنواز جہاں رہتا ہے وہاں فرشتے بھی آنے سے ڈرتے ہیں''

بیگم جواب تک قدرے بیزاری کے موڈ میں کھڑی تھی، دلنواز خان کی باتیں سن کر اپنی ہنسی روک نہیں پائی۔ وہ بڑے شوخیانہ انداز میں بولی:۔

''اللہ کرے کسی دن اس گھر میں چور گھس جائیں۔ پھر میں دیکھوں آپ اُن کا کیا بگاڑ لوگے۔''

''چور آئیں گے تو وہ مجھے نہیں تمہیں اُٹھا کر لے جائیں گے'' دلنواز خان جل کر بولا۔

بیگم سہم کر دلنواز خان کے سینے سے لگ کر بولی:۔

''ہٹو جی۔ ایسی باتیں کیوں کرتے ہو۔ مجھے ڈر لگتا ہے''

دلنواز خان اُسے اپنے آپ سے الگ کر کے نیچے چلا گیا۔ بیگم کسمسا کے رہ گئی۔

(۸)

''نہ جانے ایک انجانا سا ڈر میرے دل کو کیوں کھائے جا رہا ہے'' شاہ باز خان کے پہلو میں لیٹی زیتون نے اپنے شوہر سے فکر مند لہجے میں کہا:۔

''اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے لگتا ہے شیر و بدی سے نیکی کی طرف لوٹ آیا ہے۔ دیکھو نا پچھلے کچھ دن سے وہ کتنا بدل چکا ہے''

بہت دیر تک وہ شیر خان کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ شیر خان جو اُن کے بغل میں ہی لیٹا تھا، بڑے دھیان سے اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ بڑی دیر سے سونے کی کوشش کر رہا تھا مگر ہزار جتن کے باوجود نیند اُس کے قریب آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ آج کتنے دنوں سے

اُس نے چرس کا ایک کش نہیں لگایا تھا۔ آج کتنے دنوں سے وہ اپنے گھر میں ایک بندی کی طرح رہ رہا تھا۔ زبان کھال کی مانند بے سواد ہو کر رہ گئی تھی۔ صبح و شام وہی مکئی کی روٹیاں۔ وہی ایک ٹکڑا پیاز۔ کہاں وہ خان ہوٹل کے کباب، بھوک کو شہہ دینے والا دھنیا قورمہ، وہ لال لال رنگ میں ڈوبا جیسا روغن جوش جس کو دیکھتے ہی منہ میں پانی آجائے۔ زندگی پیسے کے بنا کتنی اپاہج اور بے رس لگتی ہے۔ اس کا احساس شیر خان کو ہو رہا تھا جس کی جیبیں مکئی کے اُن کھیتوں کی طرح ہو گئی تھیں جن کی فصل کٹ چکی ہو اور اب بس ڈنٹھ ہی ڈنٹھ رہ گئے ہوں جن پر ننگے پاؤں چلو تو پاؤں لہولہان ہو جاتے ہیں۔ بنا فصل کے کھیت اور بنا پیسے کی جیب۔ دونوں میں کتنی یکسانیت ہے۔

ایک طرف چرس کی طلب اور دوسری طرف منہ کا چسکا۔ دونوں مل کر اُس کو چوری کرنے کے لئے اُکسا رہے تھے۔ ایک طرف ماں باپ کو دیا ہوا وعدہ اور دوسری طرف نشے کی طلب۔ عجب جنگ چھڑی ہوئی تھی اُس کے دل و دماغ میں۔ یہ جنگ جذبات اور احساسات کی تھی۔ جنگ میں جیت ہمیشہ طاقتور کی ہوتی ہے۔ چرس کی للک اُس پر اس قدر حاوی ہو چکی تھی کہ اُس کے تمام تر جذبات زیر و زبر ہو کے رہ گئے۔

شاہ باز خان اور زیتون گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شیر خان کے دل و دماغ پر نشے کی طلب پوری طرح حاوی ہو چکی تھی۔ جذبات پر خود غرضی کی کائی جم گئی تھی۔ اُس کے اندر کا مجرم آج ایک لمبی نیند کے بعد جاگا تھا۔ وہ یہ سوچ کر اٹھا کہ وہ آج بہت بڑا ہاتھ مار کے آئے گا تاکہ اُسے پھر چوری کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ آج اُس کا شکار دلنواز خان تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ دلنواز خان جیسا صاحبِ ثروت آدمی اس بستی میں دوسرا کوئی نہیں۔

(۹)

دلنواز خان اور اُس کی دونوں بیگمیں گھوڑے بیچ کر سوئے تھے۔ گہری اندھیری رات۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس سنسان رات میں اگر کچھ گونج رہا تھا تو وہ پاس میں بہتی ندی کا سنگیت۔ یہ سنگیت اپنی لے تال میں مست تھا۔ آسمان پر چمک رہے لاکھوں کروڑوں ستارے، جیسے لاکھوں کروڑوں ننھے منے بچے اس سنگیت کو بڑے انہماک اور لگن سے

سن رہے تھے اور محظوظ اور مسرور ہو رہے تھے۔

شیر خان اس اندھیرے میں اپنے من کی آنکھوں سے راستہ ٹٹولتا ہوا دلنواز خان کے گھر تک پہنچ گیا۔ پسِ منظر میں ندی کا سنگیت بج رہا تھا اور اس سنگیت کے شور میں وہ ساری آوازیں دب کر رہ گئیں جو شیر خان کے دلنواز خان کے گھر میں گھستے ہوئے پیدا ہوئی تھیں۔ وہ اُس صندوق تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جس میں دلنواز خان کا خزانہ چھپا تھا۔ جونہی اُس نے صندوق کے تالے کو ٹٹولنا شروع کیا، شومیٔ نصیب اُس کا ہاتھ لالٹین سے ٹکرا گیا جو کہ صندوق کے اوپر رکھا پڑا تھا۔ لالٹین کے گرنے سے چھناکے کی آواز اُبھری جو بہروں کو بھی جگانے کے لئے کافی تھی۔

گھر کے سبھی لوگ جاگ گئے۔ دلنواز خان نوکر چاکر اور اُن کی بیگمیں۔ شیر خان پکڑا گیا۔ سب نے مل کر مار مار کر اُس کا پلیتھن نکال کر رکھ دیا۔ شیر خان چار چوٹ کی مار کھانے کے بعد غش کھا کے گر پڑا۔ دلنواز خان کے دل میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ اُس نے پڑے پڑے اُسے دو تین ٹھوکریں مار دیں اور اپنے نوکروں سے کہا کہ وہاں سے اُٹھا کر کمرے میں بند کر دیں۔ وہ اُس کو اُٹھا کر ایک تاریک کوٹھری میں پھینک کر آئے اور باہر سے کوٹھری کو تالا لگا دیا۔ اُس کا یہاں سے نکلنا ناممکن تھا۔

آج کی سزا رسمی تھی۔ اصل سزا تو اُسے کل بھگتنی تھی۔ وہی ننگے بدن پر کوڑے۔

(۱۰)

زیتون مرغے کی بانگ سے پہلے ہی ہڑبڑا کر اُٹھی جیسے کسی زہریلے ناگ نے اُسے ڈنک مارا ہو۔ اُس نے جونہی شیر خان کا بستر خالی دیکھا تو اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اُس نے حواس باختہ ہو کر شاہ باز خان کو اُٹھا لیا۔ شاہ باز ہڑبڑا کر اُٹھا اور بدحواسی کے عالم میں اُس نے زیتون سے پوچھا۔

''کیا ہوا۔ کون سی آفت آ گئی؟''

''شیرو گھر میں نہیں ہے''

شاہ باز خان کا دل بھی دھک سے رہ گیا۔ مری ہوئی آواز میں اُس نے زیتون سے کہا:۔

''تمہارا لاڈلا آج گیا ہے کسی گھر میں سیندھ لگانے۔ صبح ہوتے ہی وہ اپنی حرام کی کمائی کے ساتھ لوٹ کر آئے گا اور پھر تمہارے قدموں میں گر کر روئے گا، گڑگڑائے گا۔ لاکھ قسمیں کھائے گا کہ اب وہ کبھی چوری نہیں کرے گا۔ اس بدکاری اور بدقماشی کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے توبہ کرے گا۔ تم اُس کی باتوں میں آجاؤ گی اور اُس کو معاف کرو گی۔''

زیتون رونے لگی۔ شاہ باز خان اُسے ایک بچے کی طرح پچکارتے ہوئے بولا۔ ''رو مت زیتون۔ رو مت۔ تمہارے رونے سے ہمارا بیٹا لوٹ کر نہیں آئے گا۔ جانے ہمارے پیار میں ایسی کیا کمی رہ گئی جو وہ ہم سے اتنا دور چلا گیا جو ہماری آہیں اور آنسوؤں کا اُس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے۔ وہ تو ہمارے لئے اب ایک ایسی پرچھائی بن گیا ہے جس کے پیچھے کتنا بھی بھاگو ہم اس پرچھائی کو پکڑ نہیں پائیں گے''

کہتے کہتے شاہ باز خان کا گلا بھی رندھ گیا۔ زیتون بہت دیر تک ایک ہی کروٹ بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ اُس کی آنکھوں کے چشمے سوکھنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ یہ آنسو تبھی تھم گئے جب اُن کے ایک پڑوسی اکبر خان نے اُنہیں یہ دلخراش خبر سنائی کہ شیر خان دلنواز خان کے گھر میں چوری کرتے پکڑا گیا۔ انہوں نے اُسے بہت مارا پیٹا ہے اور وہ ندی کے پاس خون میں لت پت بے ہوشی کے عالم میں پڑا ہے۔ یہ خبر سن کر شاہ باز خان کے سر پر گویا بجلی گری۔ زیتون اپنی چھاتی پیٹنے لگی۔ دونوں ننگے پاؤں ندی کی طرف بے تحاشہ بھاگنے لگے۔

(۱۱)

شیر خان خون میں لت پت، بے سدھ ندی کنارے پڑا تھا۔ زیتون نے جب اپنے بیٹے کو اس حال میں دیکھا تو وہ تیورا کے اُس پر گری اور پھر اُس سے لپٹ کر چلا چلا کر رونے لگی۔ شاہ باز خان بھی اپنے سینے میں باپ کا دل رکھتا تھا۔ شیرو کی حالت دیکھ کر اُس کا کلیجہ پھٹ پڑا۔ وہ بھی رو پڑا۔ زیتون کھڑی ہو کر چھاتی پیٹنے لگی اور پھر سیاپا کرتے ہوئے چلانے لگی۔

''دیکھو تو ان ظالموں نے میرے بچے کا کیا حال کر دیا ہے۔ ہائے ان کے بدن میں کیڑے پڑ جائیں جنہوں نے میرے بچے کو اتنی بے دردی سے مارا پیٹا ہے لوکے لگ جائیں

انہیں۔اللہ انہیں دوزخ کی آگ میں جلادے۔''

''دوسروں کو کیوں کوس رہی ہو زیتون۔ جب اپنے ہی دام کھوٹے ہوں تو پرکھنے والے کا کیا دوش۔ یہ بدکار نہ ہوتا۔ برے کام نہ کرتا تو کوئی اُسے پیٹتا کیوں۔ کتنی بار اسے سمجھایا کہ بیٹا برے کام مت کر۔ برے کا انجام برا ہوتا ہے۔ یہ میری بات مانتا تو آج اس حال میں یہاں پڑا نہ ہوتا۔''

''تم تو ہمیشہ دوسروں کی ہی وکالت کرتے رہو گے۔ میں کہتی ہوں درس دینے کے لئے ساری زندگی پڑی ہے۔ اس کی حالت دیکھ رہے ہو۔ اسے فوراً حکیم صاحب کے پاس لے کے جانا پڑے گا۔ اگر اسے کچھ ہوگیا تو میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔ پہلے اسے یہاں سے اُٹھا کر کوٹھے پر تو لے چلو۔''

''میں اکیلے اسے کہاں اُٹھا پاؤں گا۔ ایک منٹ رک میں کسی کو بلا کر لاتا ہوں''

وہ بھاگ کر گیا اور اپنی ہی برادری کے ایک دو گوجروں کو بلا کر لے آیا۔ ان تینوں نے مل کر شیر خان کو اُٹھا لیا۔ زیتون پیچھے پیچھے نوحہ کرتے ہوئے نڈھال قدموں کے ساتھ چلتی رہی۔

(۱۲)

بستی میں دلنواز خان کی بہادری کے چرچے ہر زبان پر تھے۔ اُس نے بستی میں یہ خبر پھیلا دی تھی کہ اُس نے اکیلے ہی شیر خان کو پکڑ لیا تھا۔ وہ یہ خبر پھیلا کر ایسے اکڑ رہا تھا جیسے اُس نے شیر خان کو نہیں بلکہ چنگیز خان کے لاؤ لشکر کو زیر کر دیا ہو۔ جمعہ خان جو کہ ایک نمبر کا خوشامد پرست تھا، دلنواز خان کی شان میں ایران توران کرنے میں ایسا جٹ گیا تھا جیسے دلنواز خان نے بہت بڑا معرکہ سر کیا ہو۔ دلنواز خان کا مزاج اپنی تعریفیں سن کر ساتویں آسمان پر پہنچ چکا تھا۔ جمعہ خان چہک رہا تھا۔ ''سردار، تم نے شیر خان جیسے نامی چور کو کیا دھر لیا، اس کارنامے سے تم نے یہاں کی حسیناؤں کے دل میں گھر کر لیا ہے۔ جس کو دیکھو وہی بے چین ہے تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لئے۔ شاہنواز خان کی بیٹی گلنار تو کچھ زیادہ ہی بے قرار ہے تم سے ملنے کے لئے۔ ایک تو اُس مردود اسلم خان کی جو تم نے جم کر پٹائی کروادی، اوپر سے یہ جو اپنی بہادری کی

دھاک بٹھا دی۔ کہو تو کل ہی گلنار کے باپ سے تمہارے نکاح کی بات چلا لوں''

''مگر وہ مردود اسلم خان پھول کو جو باسی کر گیا ہے'' دلنواز خان نے اسلم خان کا ذکر ایسے کیا جیسے شیرینی کے ساتھ اُس کے منہ میں مکھی چلی گئی ہو۔

''وہ مردود پھول تک تو پہنچا ہی نہیں۔ بس کانٹوں میں ہی اپنا دامن اُلجھا بیٹھا۔ میں دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ تم ایک نظر گلنار کو دیکھو گے نا تو اللہ کی بندگی چھوڑ کر اُس کی بندگی کرنے لگو گے۔ لاکھوں میں ایک ہے ظالم۔ ہائے کیا حسن دیا ہے اوپر والے نے اُس سے۔''

''ہائے'' دلنواز خان کا جی مچلنے لگا۔ ''گلنار کی اتنی تعریفیں سن کر میرا انگ انگ پھڑکنے لگا ہے۔ جاؤ جمعہ خان جا کر بات چلاو۔ میں اس دوسری بیگم سے اوبنے لگا ہوں۔

اُس دن ہم ظاہری چال ڈھال سے فریب کھا گئے۔ ارے یہ ہماری دوسری بیگم کمبخت باسی گوبھی کا پھول ہے۔ نہ خوشبو نہ مٹھاس، نہ کشش نہ نزاکت''

''اجی جمعہ خان کس مرض کی دوا ہے۔ ایک بار گلنار کو اپنے عقد میں لو پھر دیکھو نزاکت، نفاست کسے کہتے ہیں۔ پر کمبخت.........!''

''کمبخت کیا؟''

''کمبخت یہ جیب۔ جب دیکھو بانجھ کی بانجھ ہی رہتی ہے''

دلنواز خان ایسے موقعوں پر حاتم کو بھی مات دیتا تھا۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ کرارے نوٹ نکال کر جمعہ خان کی طرف بڑھائے۔ جمعہ خان نوٹوں پر ایسے جھپٹ پڑا جیسے بلی کبوتر پر۔

''اب تیری جیب بھر گئی نا؟''

''ارے جس کے پیچھے تم جیسا حاتم طائی کھڑا ہو اُس کو کس چیز کی پرواہ۔''

وہ نوٹ جیب میں ڈال کر دلنواز خان کو رنگین دنیا کی وادیوں میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔

(۱۳)

شیر خان کئی دن بستر پر پڑا رہا۔ اُس کی ماں کہاں کہاں سے اُس کے لئے مرہم لے

کے نہ آئی۔ دھیرے دھیرے مرہم کام کرنے لگے اور اُس کے گھاؤ بھرنے لگے۔ وہ جب تک گھر میں پڑا رہا ممتا کی ماری ماں اُس پر اپنا سارا پیار لٹانے لگی۔ وہ اُسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتی۔ وہ بھی ایک نٹ کھٹ بچے کی طرح کبھی ایک بات کے لئے مچلتا تھا تو کبھی دوسری بات کے لئے۔ شاہ باز خان کو لگ رہا تھا جیسے شیر خان اندھیرے سے نکل کر اُجالے کی طرف بڑھ رہا ہو۔

ایک مہینے کے اندر وہ بالکل تندرست ہو گیا۔ باپ نے چاہا کہ وہ کھیتی باڑی میں اُس کا ہاتھ بٹائے۔ شیر خان کو ایسے کاموں میں نہ تب دلچسپی تھی نہ اب۔ وہ تو بس کھیت کی منڈھیر پر بیٹھ کر کنکر جمع کرتا تھا اور پھر ان کنکروں کے ساتھ کھیلنے لگتا تھا۔ اس کھیل سے دل بھر جاتا تھا تو اُٹھ کر بہت دور نکل جاتا تھا۔ تھک کر چور ہوتا تھا تو کسی پتھر کو سرہانہ بنا کر گھاس کے فرش پر سو جاتا تھا۔

ایک دن وہ ایسے ہی گھومتے گھومتے گلمرگ کی طرف نکل گیا۔ جیب خالی تھی اور سامنے للچانے کے لئے ڈھیر ساری چیزیں تھیں۔ وہ من کو مار کر آگے بڑھتا گیا۔ وہ کہاں جا رہا تھا اُسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ چلتے چلتے وہ دوست محمد سے ٹکرایا۔ دوست محمد کا کام شیر خان کو بکر والوں کی نقل و حرکت سے باخبر رکھنا ہوتا تھا۔ اس کام کے عوض شیر خان چوری کی رقم میں سے دوست محمد کو کچھ نہ کچھ دے جایا کرتا تھا۔

آج بھی دوست محمد اُس کے لئے ایک پھڑکتی ہوئی خبر لے کر آیا تھا۔ بکر والوں کی ایک ٹولی نے کھلن مرگ کے جنگلوں میں ڈیرہ ڈال کے رکھا تھا۔ شیر خان کی آنکھیں اس خبر سے چمک اُٹھیں۔

(۱۴)

فتح محمد بکروال کی دو بھیڑیں چوری ہو گئی تھیں۔ اُس نے گلمرگ کا پولیس تھانہ سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا:۔

"جناب ہم تو لٹ گئیو۔ مارو دو بھیڑ و چوری ہو گئیو۔ مہارے نال انصاف کرو جناب۔ منے ماری بھیڑ و واپس دلا دو صاحبو"

انسپکٹر فتح محمد کے نالہ فریاد سے جب عاجز آ گیا تو اُس نے اُسے ڈانٹ دیا۔

''تم کیا سمجھتے ہو کہ پولیس اسٹیشن سر پر اُٹھا لینے سے تمہاری بھیڑیں تمہیں مل جائیں گی۔ہمارے پاس الہٰ دین کا کوئی چراغ نہیں ہے کہ جسے رگڑا تو جن حاطر ہو گیا اور وہ جن ہمیں تمہاری بھیڑیں لا کر دے گا۔اس علاقے کے جتنے بھی نقب زن، بدمعاش ہیں میں نے اُن سب کو تھانے میں طلب کیا ہے۔ہم پوری سرگرمی سے اس معاملے کی تفتیش کرر ہے ہیں۔جونہی ہمارے ہاتھ کوئی سراغ لگے گا ہم تمہیں خبر کردیں گے۔''

''مارو مال منے مل جاوے، تھاری وڑی مہر ہو گی۔''

''دیکھ فتح محمد ہم تمہیں تمہاری کھوئی ہوئی بھیڑیں واپس دلانے کی پوری کوشش کریں گے۔مجھے ایک دودن کی مہلت دے دو۔دودن میں انشااللہ تمہاری بھیڑیں تمہیں واپس مل جائیں گی۔اب جاو میرا دماغ مت چاٹو''

فتح محمد تھانیدار کو دعائیں دے کر نکل گیا۔تھانیدار مظفر علی نیا نیا تھانیدار بنا تھا اس لئے وہ اپنی دھاک جمانے اور اس علاقے کے ایم۔ایل۔اے سے اپنی قابلیت منوانے کے لئے چوری چکاری کے یہ معاملے حل کرنے میں بہت زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ فتح محمد کی رپورٹ درج کراتے ہی اُس نے حوالدار حاکم دین کو حکم دیا کہ علاقے کے سارے بدمعاشوں کو لائن میں حاضر کرادے۔شیر خان بھی ان بدمعاشوں میں شامل تھا۔

(۱۵)

علاقے کے سارے بدمعاش ہاتھ باندھے لائن میں کھڑے تھے۔مظفر علی ایک ایک کی پٹائی کرتا چلا جا رہا تھا لیکن کوئی جرم قبول نہیں کرر ہا تھا۔تھانیدار جانتا تھا کہ بھیڑیں ان ہی بدمعاشوں میں کسی ایک نے چرائی ہیں مگر وہ کون ہے اُس کا پتا لگانے کی کوشش جاری تھی۔پولیس والے دیگر معاملوں میں بھلے ہی زیرو ہوں مگر چہرے پڑھنے میں وہ بڑے ماہر ہوتے ہیں۔مظفر علی نے ایک ایک بدمعاش کو غور سے دیکھا۔تین کو چھوڑ کر باقی سب کو جانے دیا گیا۔ان تینوں میں ایک شیر خان تھا۔مار کے آگے بھوت بھی ناچنے لگتے ہیں۔شیر خان پر جب مظفر علی کے ڈنڈے برسنے لگے تو اُس نے فوراً اپنے جرم کا اقبال کیا۔

چوری کا مال یوسف قصائی سے برامد ہوا۔ پولیس نے اُسے بھی چوری کا مال چھپانے کے جرم میں دھر لیا۔ دونوں کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ باقی دو کو رہا کیا گیا۔ یوسف قصائی جس نے آج تک پولیس تھانے کا منہ نہیں دیکھا تھا آج حوالات میں بند تھا۔ وہ شیر خان کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی کوس رہا تھا۔

(۱۶)

تفتیش مکمل ہونے کے بعد کیس عدالت میں چلا گیا۔ عدالت نے شیر خان کو تین مہینے کی اور یوسف قصائی کو ایک مہینے کی سزا سنائی۔ شیر خان کے لئے پولیس تھانہ، جیل خانہ سب دیکھی ہوئی چیزیں تھیں۔ وہ تو اندر باہر ہوتا ہی رہتا تھا لیکن یوسف قصائی کے لئے جیل جانا کسی صدمے سے کم نہ تھا۔ وہ سزا سن کر بچے کی طرح پھوٹ کر رو پڑا۔ اُس کے لئے تو یہ دوہری مار تھی۔ ایک تو اُس کی ساکھ کو بٹا لگا تھا، اوپر سے بدنامی اور جگ ہنسائی۔

شاہ باز خان اور زیتون کو جب شیرو کے جیل جانے کی منحوس خبر ملی تو اُن پر گویا بجلی ٹوٹ پڑی۔ شاہ باز خان تو اس صدمے سے نڈھال ہو گیا جب کہ زیتون دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اس دکھ اور صدمے کے عالم میں شاہ باز خان اپنی بیوی سے اتنا ہی کہہ پایا:۔

"آج سے سمجھ لے کہ ہمارا بیٹا جیتے جی ہی ہمارے لئے مر گیا۔"

زیتون کچھ سن نہ سکی۔ آنسوؤں اور آہوں کا سیلاب اُسے دکھ کی ایسی کھائی تک بہا کے لے گیا تھا کہ اگر وہ اپنے آپ کو نہ سنبھالتی تو یہ صدمہ اُس کی جان ہی لے لیتا۔ وہ بہت دیر تک بیٹھی سیاپا کرتی رہی۔

(۱۷)

دلنواز خان اپنی دوسری بیگم کو طلاق دے کر اس کی جگہ گلنار کو بیوی بنا کر لے آیا تھا۔ گلنار اب اُس کی زندگی میں بہار بن کر آ گئی تھی۔ دلنواز خان گلنار کے آنے سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ جمعہ خان نے سچ ہی کہا تھا۔ وہ لاکھوں میں ایک تھی۔ واقعی بلا کی خوبصورت۔ دلنواز خان سے کہیں زیادہ جمعہ خان اتراتا پھر رہا تھا۔ اتراتا بھی کیوں نہیں، بستی میں جتنے ہیرے نگینے

تھے وہ ایک ایک کر کے دلنواز خان کی جھولی میں ڈالتا جا رہا تھا۔ اس نمک حلالی کا فیض بھی وہ بخوبی اُٹھالیتا تھا۔ بہانے بہانے سے وہ دلنواز خان سے پیسہ اینٹھتا رہتا تھا۔ دلنواز خان کی مجبوری تھی کہ جمعہ خان کو ہر طرح سے خوش رکھے۔ اُس کا یہ دبدبہ جمعہ خان کے دم سے ہی قائم تھا۔ اصل میں وہ مہاموورکھ تھا مگر نصیب کا کیا کیجئے گا۔ جسے دیتا ہے چھپر پھاڑ کے دیتا ہے۔ ایسے خوش نصیبوں میں ایک دلنواز خان بھی تھا۔

(۱۸)

وقت پنکھ لگا کر اُڑتا رہا۔ دن مہینوں میں ڈھل گئے۔ تین مہینے پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔ ان تین مہینوں میں موسم بدل گیا۔ جاڑا گزر گیا تھا۔ بہار نے وادی میں دستک دی تھی۔ گلمرگ کا رنگ وروپ ہی بدل گیا تھا۔ ہر طرف سبزے کی چادر بچھ گئی تھی اور اس چادر پر صناع کارنے بھانت بھانت کے پھول سجائے تھے۔ ہر طرف ہریالی تھی، شادابی تھی۔ ہوائیں جھوم رہی تھیں۔ ندی نالے گنگنا رہے تھے۔ برف پگھل پگھل کر دودھ کی دھارائیں بن کر کھیتوں کو سیراب کرنے، انسانوں کا میل دھونے کے لئے ندی نالوں میں جا کر ضم ہو رہی تھیں۔

یہ خبر شاہ باز خان تک پہنچ چکی تھی کہ شیر خان آج جیل سے رہا ہونے والا ہے۔ یہ خبر سن کر زیتون کی آنکھوں کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ صبح سے کوٹھے کے باہر بیٹھی بیٹے کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ان تین مہینوں میں بیٹے کی صورت دیکھنے کے لئے اُس کی آنکھیں ترس گئیں تھیں۔ شاہ باز لاکھ کوشش کے باوجود اپنے جذبات کو روک نہیں پایا۔ جب اُس نے شیرو کو دیکھا تو مارے خوشی کے وہ بھی رو پڑا۔

شیر خان کی رہائی کی خبر پا کر پڑوسی شاہ باز خان کو مبارک باد دینے چلے آئے۔ گھر پر جشن کا سا ماحول تھا۔ مبارک باد دینے والوں میں کچھ خیر خواہ بھی تھے اور کچھ کینہ رکھنے والے بھی۔ شاہ باز کو لگ رہا تھا کہ وہ مبارک باد کی آڑ میں اُسے گالیاں دے رہے ہیں۔ بلا اس میں ان کی کیا خطا۔ کانے کو تو لوگ کانا ہی کہیں گے نا۔ سب سے آخر میں اللہ بخش آیا۔ اللہ بخش ایک نیک، تجربہ کار اور سلجھا ہوا آدمی تھا۔ اُس نے کافی دنیا دیکھی تھی۔ وہ شاہ باز خان کے دل کے در

کو بخوبی سمجھتا تھا۔ اُس نے جب شاہ باز خان کو بیٹے کی رہائی کی مبارک باد دی تو شاہ باز خان سے رہا نہ گیا، بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''پنجرے کے پنچھی کی قید کیا اور رہائی کیا۔ میں تو کہتا ہوں کہ شیرو جیل سے نہ چھوٹتا تو اچھا تھا۔ شاید جیل میں رہ کر وہ سدھر جاتا۔ یہ میرے لئے ایک ایسا ناسور بن چکا ہے کہ میں نہ اس پر نشتر چلا سکتا ہوں اور نا ہی اس پر مرہم لگا سکتا ہوں۔ اس نے ہم دونوں کا جینا مشکل کر دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کا کیا کروں'' کہہ کر وہ سکنے لگا۔ اللہ بخش اُسے تسلی دیتے ہوئے ''میں تمہارا دکھ سمجھ سکتا ہوں شاہ باز خان مگر اس طرح ہمت ہارنے اور آنسو بہانے سے تمہارا بیٹا سدھر نہیں سکتا۔ بیٹے کو سدھارنا چاہتے ہو تو جتنی جلدی ہو سکے اُس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دو۔ میرا مطلب ہے کہ اس کی شادی کر ڈالو۔ پاؤں میں گھر گرہستی کی بیڑیاں پڑ جائیں گی تو ہوش خود بخود ٹھکانے آجائیں گے۔''

''ساری دنیا میرے بیٹے کی کرتوت جانتی ہے۔ کون ایسا بے رحم باپ ہوگا جو اپنی بیٹی کو اندھے کنویں میں دھکیل دے گا۔ آدمی غلطی سے مکھی نگلے تو نگلے آنکھوں دیکھی مکھی کوئی نہیں نگلتا''

''میں تمہاری بات سے سو فیصدی اتفاق رکھتا ہوں۔ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ کل صبح ہی کوئی ایسا گھرانہ ڈھونڈنے کی کوشش کرو جنہیں اس رشتے پر کوئی عذر نہ ہو۔''

''لیکن ایسا گھرانہ ملے گا کہاں سے؟''

''ڈھونڈنے سے۔ کہتے ہیں ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے''

اللہ بخش تو چلا گیا مگر شاہ باز خان کے دل میں اُمید کی ایک رمق ڈال کے چلا گیا۔ اُس کی باتیں بہت دیر تک اُس کے ذہن میں گونجتی رہیں۔ جب اُس نے اس بات کا ذکر زیتون سے کیا تو وہ بھی بلیوں اُچھل پڑی۔ اُس نے نہ صرف اللہ بخش کی باتوں کی تائید و حمایت کی بلکہ وہ شاہ باز کے سر پڑ گئی کہ وہ کل صبح ہی اس نیک کام کے لئے نکل جائے اور لڑکی والوں کے سامنے جھولی پھیلا دے۔ آخر کون ماں باپ نہیں چاہیں گے کہ اُن کے جیتے جی ہی اُن کے بیٹے کے سر پر سہرا

بند ھے۔

(۱۹)

شاہ باز خان ایک کوٹھار سے دوسرے کوٹھار۔ایک بستی سے دوسری بستی رشتے کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔وہ جہاں جہاں بھی گیا لوگوں نے اُسے ذلیل وخوار کر کے نکال دیا۔زندگی میں پہلی بار اُسے اتنی ذلت اور بے عزتی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔گلے میں بیٹے کی چاہت کا پھندا نہ پڑا ہوتا تو وہ اس دنیا پر لعنت بھیجتا۔ایک نہیں سو بار۔کتنی کم ظرف ہے یہ دنیا۔گرتے کو تو اُٹھا نہیں سکتی لیکن اُس کا ہاتھ تھامنے کی بجائے اُس کو اور نیچے گرا دیتی ہے یہ دنیا۔

زیتون جو رات دن شیرو کی شادی کے خواب دیکھنے لگی تھی، شام کو جب شاہ باز خان منہ لٹکائے چلا آتا تھا تو اُس کے خواب ریزہ ریزہ ہو کر رہ جاتے تھے۔ایک دن جب وہ جلدی گھر لوٹا تو زیتون نے دھڑکتے دل سے پوچھا:۔

''کیا خدا بخش نے بھی انکار کر دیا؟''

''انکار ہی نہیں سب کے سامنے ذلیل وخوار کر دیا مجھے۔'' وہ اپنی ذلت کے احساس سے رو پڑا۔وہ روتے روتے زیتون سے بولا:۔

''زیتون تمہارا بیٹا کبھی دولہا نہیں بنے گا۔اُس کے سر پر کبھی شادی کا سہرا نہیں بندھے گا۔وہ اکیلا آیا تھا اور اکیلا ہی اس دنیا سے چلا جائے گا۔اُس کا گھر کبھی نہیں بس پائے گا۔وہ سدا کنوارا ہی رہے گا اور کنوارا ہی مرے گا۔''

''ایسا مت کہو شیرو کے ابو۔ایسا مت کہو۔میرا بیٹا کنورا نہیں رہے گا۔آخر کیا کمی ہے اس میں۔شکل وصورت میں یوسف ثانی سے کم ہے کیا۔بس ایک ہی خرابی ہے اس میں۔یہ بدکاری کا راستہ نہ اپناتا تو آج دو بچوں کا باپ بن گیا ہوتا۔اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔اُس کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔میرا دل کہتا ہے کوئی حور پری آئے گی جو میرے بیٹے کی دنیا بسائے گی۔دیکھ لینا تم ایک دن کوئی حور پری آئے گی جو میرے شیرو کی زندگی سنوارے گی۔''

کہتے کہتے وہ اپنے تخیل میں پریوں کی صورتیں تراشنے لگی۔شاہ باز خان بت بنا اپنی

ذلت کا سوگ مناتا رہا۔

(۲۰)

گلمرگ کے قریب ہندوپاک سرحد پر بھور کے وقت اچانک ہلچل مچ گئی۔ گشت کر رہے بی۔ ایس۔ ایف کے ایک سنتری کو لگا کہ کوئی پاکستانی سرحد پار کر کے اُن کے علاقے میں داخل ہوا۔ اُس نے سبھی سپاہیوں کو چوکنا کر دیا۔ سپاہیوں کے ہاتھ اُن کے مشین گنوں کے ٹریگر پر چلے گئے۔ وہ اُسے لمبی لمبی گھاس میں تلاش کرنے لگے۔ ایک آدمی واقعی اُس پار سے چوری چھپے سرحد پار کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بی۔ ایس۔ ایف کے سپاہیوں کے ہاتھ جب کچھ نہیں لگا تو اُنہوں نے مقامی پولیس کو خبردار کیا۔ وائرلیس سے پیغام ہر طرف پھیل گیا۔

وہ ایک عورت تھی جس نے اپنا منہ پوری طرح سے ڈھک لیا تھا۔ وہ بے تحاشہ گلمرگ کی طرف بھاگ رہی تھی۔ تنگنائے سے ہوتے ہوئے وہ سپاہیوں کی نظر سے بہت دور چلی آئی تھی۔ ایک مصیبت سے اُسے راحت تو ملی تھی مگر دوسری مصیبت اُس کے سرہانے آ کے کھڑی ہوئی تھی۔ مقامی پولیس نے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی تھی۔

وہ گھنے جنگل میں بے تحاشہ بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ اُس کے پاوں میں جیسے بجلی بھر گئی تھی۔ وہ اُس سہمی ہوئی ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی ایک نامعلوم منزل کی طرف اس طرح بھاگ رہی تھی جیسے اُس کے پیچھے شیر لگا ہو۔ غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنا کتنا جان جھوکھم کا کام ہے اس کا احساس اب اُس کو ہو رہا تھا۔ وہ سچ مچ اپنی جان پر کھیل گئی تھی۔ اگر کسی سپاہی نے اُسے دیکھ لیا ہوتا تو اُس کی جان چلی گئی ہوتی۔ وہ اُسے گولی سے اُڑا دیتے۔ موت کے احساس سے اُس کا بدن کانپنے لگا۔ وہ ایک پل کے لئے دم سادھنے کی غرض سے ایک صنوبر کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گئی۔ اُس کا دل دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ سپاہیوں کی ہیبت اب تک اُس پر طاری تھی۔ وہ بار بار پلٹ کر دیکھتی کہ کہیں کوئی اُس کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔ جب اُس سے اطمینان ہو جاتا تھا کہ وہ سپاہیوں کی پہنچ سے بہت دور نکل چکی ہے تو وہ پھر سے اُٹھ کر آگے بڑھنے لگی۔ حدِ نظر تک پھیلا ہوا جنگل تھا۔ اس جنگل میں راستہ تلاش کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہ جہاں جہاں پاؤں کے

نشان دیکھتی تھی اُسی سمت میں آگے بڑھتی تھی۔

(۲۱)

کہتے ہیں کہ چور چوری سے جائے گا ہیرا پھیری سے نہیں جائے گا۔ شیر خان ہزار توبہ کرنے کے باوجود چوری کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔ دوست محمد کے کہنے پر وہ گھات لگائے ایک کھڈ میں بیٹھا تھا۔ اُس سے یہ خبر ملی تھی کی تھوڑی دیر میں یہاں سے بکروال گزرنے والے ہیں۔ بہت دنوں سے اُس نے کوئی شکار نہیں کیا تھا۔ اُس کی خالی جیب بار بار اُس کا منہ چڑا رہی تھی۔ آج وہ یہ طے کر کے بیٹھا تھا کہ کچھ بھی ہو وہ ایک آدھ بھیڑ اُڑا کر لے جائے گا۔ اُس نے اس کا پختہ انتظام بھی کیا تھا۔ وہ ایسے گہرے کھڈ میں چھپا تھا جہاں سے وہ کسی کو نظر نہیں آرہا تھا۔ سامنے ایک پگڈنڈی تھی جہاں سے گلہ گزرنے والا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھ ایک ٹاٹ کی بوری رکھی تھی۔ وہ جونہی کسی بھیڑ یا بکری کو اس کھڈ میں کھینچ کر لاتا تو اُس کا منہ ٹاٹ کی بوری سے بند کرتا اور پھر اُس سے بوری میں ڈال کر یوں لے کر جاتا جیسے کوئی سامان لے کر جا رہا ہو۔

شیر خان انتظار کرتے کرتے اوب گیا تھا۔ پو پھٹنے کے ساتھ ہی وہ اس کھڈ میں آکر چھپ گیا تھا۔ اب دوپہر بھی ڈھلنے لگی تھی۔ بکروالوں کا کوئی اتا پتا ہی نہیں تھا۔ اُسے رہ رہ کے دوست محمد پر غصہ آرہا تھا جس نے اُسے منہ اندھیرے ہی یہاں بھیج دیا تھا۔ کبھی کبھی دوست محمد بھی بکروالوں کی ذہانت سے مار کھا جاتا تھا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے یہ بکروال کسی امکانی خطرے کو ٹالنے کے لئے اپنے راستے بدل دیتے تھے اور ایسے راستوں سے اپنے گلے نکال کر لے جاتے تھے جو کسی کے گمان میں نہیں ہوتے تھے۔

آج بھی ویسا ہی ہوا تھا۔ شیر خان بکروالوں کی چالاکی سمجھ گیا تھا پھر بھی دل میں ایک موہوم اُمید لئے بیٹھا رہا کہ دفعتاً گولی کی آواز گونجی۔ شیر خان کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ حواس باختہ ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ابھی وہ اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کسی کے قدموں کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس سے پہلے کہ وہ اُٹھ کر حالات کا جائزہ لے کوئی پہاڑی سے پھسل کر اسی کھڈ میں آکے گرا جس میں وہ چھپا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ اتنی سرعت میں ہوا

کہ ایک پل کے لئے اُس کی سانس ہی رک گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اُس پر جھپٹ پڑے وہ چیخی۔ یہ وہی نقاب پوش عورت تھی جو پولیس سے بچ بچا کر یہاں تک پہنچ چکی تھی۔ شیر خان بدحواسی کے عالم میں کبھی اس نقاب پوش عورت کو اور کبھی ٹیلے پر بندوق بردار سپاہیوں کو چھپ کے دیکھنے لگا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُسے لگا کہ وہ کسی آفت میں پڑنے والا ہے۔ اُس نے اُس عورت سے ہمت کر کے پوچھا:۔

''کون ہو تم؟''

''پہلے بتاؤ تم کون ہو اور یہاں کیوں چھپ کے بیٹھے ہو؟''

شیر خان کو لگا جیسے اُس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ پھر بھی ہمت کر کے اُس نے اُس سے کہا۔

''یہ میرا علاقہ ہے۔ میں جہاں چاہوں وہاں بیٹھوں۔ جو چاہے کروں۔ تم سوال کرنے والی کون ہوتی ہو؟''

جواب میں وہ رونے لگی۔ اب کے شیر خان اُس سے روتے دیکھ کر پریشان ہونے لگا۔ اُس نے اُس سے پوچھا:۔

''تم رو کیوں رہی ہو؟''

''روؤں نہیں تو اور کیا کروں۔ میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔ میں اُن کے ہاتھ لگی تو وہ مجھے گولی سے اُڑا دیں گے۔ میں بڑی مشکل سے اُن سے اپنی جان بچا کر یہاں تک پہنچی ہوں۔ یہاں سے آگے کہاں جاؤں یہی سوچ کر رو رہی ہوں''

شیر خان کا ماتھا ٹھنکا۔ اُسے لگا یہ عورت یا تو کوئی اسمگلر ہے یا جاسوس، نہیں تو پولیس خونخواہ اس کے پیچھے کیوں پڑ جائے۔ اُس نے سوچا کہ اگر اُس نے اس عورت کی کوئی مدد کی تو وہ خود بہت بڑی آفت میں پھنس جائے گا۔ اُس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اس لڑکی کو پکڑوا دے گا۔ ہو سکتا ہے اس کام کے بدلے اُسے فوج سے اچھا خاصا انعام بھی مل جائے۔ یہی سوچ کر اُس نے لڑکی کو کریدنا شروع کیا۔

''سچ سچ بتاؤ تم ہو کون اور پولیس تمہارا پیچھا کیوں کر رہی ہے۔؟''

''میرا نام دردانہ ہے۔ میں مظفر آباد کی رہنے والی ہوں۔ میں یہاں اپنے چاچا خدا بخش سے ملنے آئی ہوں'' کہہ کر اُس نے اپنے چہرے سے جونہی نقاب ہٹا لیا تو شیر خان کو لگا جیسے اُس کے سامنے بجلی کا ایک کوندا لپکا جس نے اُس کی آنکھوں کو خیرہ کر ڈالا۔ وہ بلا کی خوبصورت تھی۔ اُس کو دیکھ کے ایسا لگتا تھا جیسے قدرت نے اُسے فرصت میں بنایا ہو۔ ایسا جیتا جاگتا حسن کا پیکر شیر خان نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔

''تم میری مدد کرو گے نا؟'' اُس نے رحم طلب نظروں سے شیر خان کی طرف دیکھ کے پوچھا۔

شیر خان کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ وہ کسی اور دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ دردانہ نے ایک ہی نظر میں اُس پر ایسا سحر کر دیا تھا کہ وہ ساری منطق، زندگی کی ساری فلاسفی، فرض کی ادائیگی، انعام واکرام کی ہوس، یہ سب چیزیں وہ ایک پل میں بھول گیا تھا۔

''تمہارے چاچا کا پتہ کیا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم''

''تو پھر تم کہاں جاؤ گی''

''مجھے یہ بھی نہیں معلوم''

''میرے گھر چلو گی؟''

وہ پس و پیش میں پڑ گئی۔ اُسے تردد میں پڑے دیکھ کر شیر خان نے کہا:۔

''ڈرو مت۔ میں اکیلے نہیں رہتا۔ میرے ساتھ میرے ماں باپ بھی رہتے ہیں۔ تم میری ماں سے مل کر بہت خوش ہو جاؤ گی۔ وہ بھی تم سے مل کر بہت خوش ہو جائے گی۔ اب بولو چلو گی میرے ساتھ؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ شیر خان نے ندی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''وہ جو کوٹھا دیکھ رہی ہو نا وہی میرا گھر ہے۔ وہاں تک چل پاؤ گی؟''

''ہاں'' وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''تو چلو'' اُس نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر آگے کھینچ لیا۔

وہ جونہی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ڈھلان سے اُترنے لگے، گشت لگاتے ایک سپاہی نے اُنہیں دیکھ لیا۔ وہ وہیں سے چلایا۔

''رک جاؤ نہیں تو گولی مار دوں گا''

دونوں دھک سے رہ گئے۔ اُن کے سروں پر موت منڈ ھلا رہی تھی۔ سوچنے کا وقت اُن کے پاس نہیں تھا۔ وہ اُسے ایک جھٹکا دے کر چلایا۔

''پیچھے مت دیکھ۔ میرے پیچھے چل۔''

وہ دونوں بھاگے۔ اپنی جان ہتھیلی پر لے کر بھاگے۔ تبھی اوپر سے ایک فائر ہوا۔ گولی شیر خان کے بازو کو چھو کر نکل گئی۔ وہ دونوں لڑھکتے ہوئے بہت نیچے چلے گئے۔ شیر خان کے بازو سے خون رسنے لگا۔ دردانہ کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔

''تم زخمی ہو چکے ہو''

''اس وقت تم میری فکر مت کر۔ اپنی پوری طاقت لگا کر میرے پیچھے چل۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی مت۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا''

وہ دونوں پوری طاقت کے ساتھ بھاگنے لگے۔ زندگی اور موت کی کشمکش جاری تھی۔

(۲۲)

زیتون کوٹھے کے باہر بیٹھی شیر خان کا انتظار کر رہی تھی۔ سویرے سویرے گھر سے نکلا تھا ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا جب کہ اب شام ہونے کو آئی تھی۔ اُس کے من میں طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے آ رہے تھے۔ یہ سوچ کر اُس کا جی بیٹھا جانے لگتا تھا کہ پھر کہیں وہ چوری کرتے ہوئے پکڑا نہ گیا ہو۔ اتنے میں شاہ باز خان کوٹھے سے باہر آ گیا۔ اُس نے زیتون سے پوچھا:۔

''یہاں کیوں بیٹھی ہو؟''

''اُس پگلے کا انتظار کر رہی ہوں۔ شام ہونے کو آئی ابھی تک اُس کا کوئی پتہ ٹھکانہ

نہیں۔ نہ جانے کہاں نکل گیا۔ تمہیں کچھ پتہ ہے؟'' ''میں اُس کا چوکیدار ہوں جو چوبیس گھنٹے اُس کی رکھوالی کرتا پھروں'' شاہ باز خان جل کر بولا'' وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ جہاں مرضی ہوئی چلا گیا ہوگا۔ جب مرضی ہوگی لوٹ کر آئے گا۔ تمہیں اپنے لاڈلے کی زیادہ فکر ہو رہی ہے تو جا کر اُسے ڈھونڈ۔ کیا پتہ پھر کسی جیل خانے میں پہنچ گیا ہو''

زیتون کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سوچنے لگی کہ آخر اُس نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے کہ ہر بار اُسے ہی جلی کٹی سننی پڑتی ہے۔ اُس نے شیرو کو کوکھ سے مجرم بنا کر پیدا نہیں کیا تھا، پھر اُس کے گناہوں کی سزا اُس کو ہی بار بار کیوں بھگتنی پڑتی ہے۔ وہ سوچ بھی رہی تھی اور رو بھی رہی تھی۔ تبھی شیر خان دردانہ کو لے کر اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ شاہ باز خان اور زیتون چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ شاہ باز خان کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دردانہ کی طرف دیکھنے لگا۔ زیتون بھی بت بنی بیٹھی تھی۔ شیرو نے باپ سے مخاطب ہو کے کہا:۔

''ابو ایسی مشکوک نظروں سے مجھے مت دیکھو۔ میں اس لڑکی کو کہیں سے بھگا کر نہیں لایا ہوں بلکہ یہ اپنی مرضی سے میرے ساتھ چلی آئی ہے۔''

''لیکن یہ ہے کون اور یہ تمہارے ساتھ یہاں کیوں آئی ہے؟''

''میں بتاتی ہوں چاچا۔ میرا نام دردانہ ہے۔ میں مظفر آباد کی رہنے والی ہوں۔ میں یہاں اپنے چچا جان سے ملنے آئی ہوں''

دفعتاً زیتون کی نظر شیر خان کے بازو پر پڑی جس سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور اُس کی طرف لپک کر اُس کے بازو کو دیکھنے لگی۔ ''یہ کیا غضب کر کے آئے ہو؟''

''ارے ذرا سی لگی ہے اماں۔ تم بھی ایک دم گھبرا جاتی ہو۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم دردانہ سے باتیں کرو میں ذرا کپڑے بدل کے آتا ہوں''

وہ کپڑے بدلنے اندر چلا گیا۔ شاہ باز خان زیتون سے بولا:۔

''تم مہمان کو لے کر اندر چلی جاؤ۔ اس کے لئے چائے بناؤ۔ میں علی خان سے روٹی

لے کر آتا ہوں"

شاہ باز خان یہ کہہ کر نکل گیا۔ زیتون بیٹے کے زخم کو بھول کر دردانہ میں کھو گئی۔ اُس سے لگا کہ کہیں اللہ نے اُس کے بیٹے کے لئے پری تو نہیں بھیج دی۔ دردانہ سچ مچ کسی پری سے کم نہ تھی۔ وہ اُس سے کوٹھار کے اندر لے کر گئی۔

(۲۳)

سپاہی خون کے دھبوں کا تعاقب کرتے ہوئے شاہ باز خان کے کوٹھے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شاہ باز خان نے جب پولیس کو دیکھا تو اُس کی سٹی پٹی گم ہوگئی وہ سمجھ گیا کہ یہ لوگ اُسی لڑکی کی تلاش میں اُس کے کوٹھار کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اُسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اگر لڑکی اُن کے کوٹھے سے پکڑی گئی تو وہ بھی قانون کے رگڑے میں آجائیں گے۔ اُسے اس بات کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ لڑکی چوری چھپے سرحد پار کر کے آئی ہے اس لئے پولیس اُس کی تلاش میں ہے۔ وہ بیچ راستے سے ہی واپس مڑا اور ایک گھوڑے کی رفتار سے گھر کی طرف بھاگنے لگا۔

گھر پہنچ کر جونہی وہ کوٹھے کے اندر داخل ہوا تو زیتون دردانہ کو اپنی بپتا سنا رہی تھی۔ شاہ باز خان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑتے دیکھ کر زیتون نے شاہ باز سے پوچھا:۔

"لے آئے روٹی۔ کیا بات ہے۔ تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اُڑ رہی ہیں؟"

شاہ باز خان اُکھڑی اُکھڑی سانسوں میں زیتون سے بولا۔

"غضب ہوگیا زیتون۔ پولیس اس کی تلاش میں اسی طرف آرہی ہے"

یہ خبر سن کر سب کے منہ فق ہوگئے۔ دردانہ کا تو یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس کوٹھار میں دردانہ کو چھپائیں تو چھپائیں کہاں۔ کسی کو کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ شیر خان پر تو جیسے سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ شاہ باز خان نے اپنے حواس یکجا کئے اور اُس نے زیتون اور شیر خان کو سمجھاتے ہوئے کہا:۔

"میں باہر بیٹھ کے پولیس کا انتظار کروں گا۔ تم لوگ گھبراؤ مت۔ اللہ سبب ساز ہے۔

کوئی نہ کوئی سبیل نکال لے گا۔ ہم اس معصوم کو پولیس کے ہتھے چڑھنے نہیں دیں گے۔ بیٹا تم گھبرانا مت۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

کمرے میں موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ شاہ باز خان کوٹھے سے باہر نکل گیا۔

(۲۴)

پانچ پولیس والوں کا دستہ تھا جس کی رہنمائی تھانیدار ارشاد علی کر رہا تھا۔ وہ صحیح سمت میں جا رہے تھے۔ جوں جوں وہ شاہ باز خان کے قریب بڑھتے چلے جا رہے تھے اُس کے دل کی دھڑکنیں اُتنی ہی تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ جونہی ارشاد علی اپنے سپاہیوں کے ہمراہ اُس کے صحن میں داخل ہوا۔ شاہ باز کی روح قبض ہوگئی۔ ارشاد علی نے ایک چبھتی ہوئی نگاہ شاہ باز خان پر ڈال دی اور تحکمانہ انداز میں اُس سے پوچھا:۔

''تمہارا بیٹا شیر خان کہاں ہے۔''

شاہ باز خان کے حلق سے آواز نکل نہیں پا رہی تھی۔ اُس نے کوٹھار کی طرف اشارہ کیا۔ ارشاد علی نے اپنی گرجدار آواز میں شیر خان کو آواز لگائی۔

''شیر خان باہر آجاؤ''

شیر خان لرزتی ٹانگوں کے ساتھ باہر آ گیا۔ اپنی کمزوری کو چھپا کر اُس نے تھانیدار سے پوچھا:۔

''کیا بات ہے صاحب۔''

''ہمیں یہ خبر ملی ہے کہ تم نے ایک پاکستانی جاسوس کو اپنے گھر میں پناہ دی ہے۔ اس جاسوس کو فوراً ہمارے حوالے کر دو''

''ہمارے گھر میں کوئی جاسوس نہیں ہے صاحب۔ ہم کسی جاسوس کو اپنے گھر میں کیوں پناہ دیں۔ ضرور آپ کو کسی نے غلط خبر دی ہے''

''ابھی پتہ چل جائے گا۔ اس کے کوٹھار کی تلاشی لو''

سارے سپاہی اُس کے کوٹھار میں گھس گئے۔ شاہ باز خان کا دل بیٹھا جانے لگا۔ شیر

خان حالانکہ بڑا انڈر اور بے خوف نوجوان تھا مگر اس وقت کے حالات کچھ ایسے تھے کہ اُس کی ٹانگیں بھی کانپ رہی تھیں۔ دل اس شدت سے دھڑک رہا تھا کہ دھڑکن کی آواز اُسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ شاہ باز خان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ پیش آئندہ طوفان کے تصور سے لرز رہا تھا کہ جب یہ لوگ دردانہ کو برآمد کر کے باہر لے آئیں گے تو پھر اس کے خاندان پر کیسا قہر ٹوٹ پڑے گا۔ سبھوں کو جیل جانا پڑے گا۔

سپاہیوں نے پورے کوٹھار کی تلاشی لی۔ دردانہ نہیں ملی۔ جب وہ خالی ہاتھ باہر آ گئے تو شیر خان کا دل خوشی سے اُچھل پڑا جب کہ شاہ باز خان کے مردہ شریر میں پھر سے جان آ گئی۔

"اندر ہمیں کوئی جاسوس نہیں ملا صاحب۔ اندر اکیلی شیر خان کی ماں ہے۔"

"تم نے ہر کونے کھدرے میں دیکھا نا۔"

"صاحب ہم نے کوٹھے کا چپہ چپہ چھان مارا۔ ہمیں اس کے ماں کے سوا دوسرا کوئی نہیں ملا۔"

ارشاد علی سپاہیوں کے بیان پر یقین کر کے جونہی جانے کے لئے مڑا تو اچانک اُس کی نظر شیر خان کے بازو پر پڑی جس پر اُس نے پٹی باندھی تھی پھر بھی زخم سے خون چھلک کر باہر آ گیا تھا۔ ارشاد علی نے بڑھ کر اپنے بے رحم ہاتھوں سے اُس کی آستین نوچ لی اور دو چار گھونسے مار کر اُسے زمین پر گرا دیا اور پھر اُس کے سینے پر پاؤں رکھ کر غرایا۔

"سالے ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتا ہے۔ بتا کہاں چھپایا ہے اُس جاسوس کو؟"

"صاحب میں نے کسی جاسوس کو نہیں دیکھا۔ کوئی ہوتا تو آپ کو مل جاتا نا۔"

"تم نے اگر اُسے نہیں دیکھا تو پھر یہ زخم کیسا؟"

"صاحب میں پیڑ پر چڑھ گیا تھا کہ میرا ہاتھ پھسلا اور بازو میں چوٹ آ گئی"

"سالے، مجھے بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے سات گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ تم لوگوں کی نس نس کو میں سمجھتا ہوں۔ یہ یوں نہیں بولے گا۔ اسے تھانے لے چلو۔"

سپاہی اُسے اُٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ شاہ باز خان ابھی تک بت بنا بیٹھا تھا۔ اُس

کی سمجھ میں یہ گورکھ دھندہ ابھی تک نہیں آ رہا تھا کہ لڑکی اندر تھی پھر بھی وہ پولیس والوں کو نہیں ملی۔ آخر ایسا کیا جادو کر دیا زیتون نے جو سپاہیوں کی آنکھوں پر پٹی بندھ گئی اور اُنہیں لڑکی نظر نہ آئی۔ اُسے اس بات کا غم نہ تھا کہ پولیس اُس کے بیٹے کو پکڑ کر لے گئی۔ اُسے اس بات کو جاننے کا تجسس تھا کہ آخر زیتون نے سپاہیوں کی آنکھوں میں کیسے دھول جھونکی۔

وہ جب کوٹھار کے اندر چلا گیا تو زیتون بے صبری سے اُس کے اندر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس نے سرگوشی کے انداز میں شوہر سے پوچھا:۔

''پولیس چلی گئی کیا؟''

''شیرو کہاں ہے؟''

''وہ اُسے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئی۔ اُس کی چھوڑو۔ وہ کل ہی چھوٹ کر آئے گا۔ یہ بتا تم نے دردانہ کو کہاں چھپا لیا۔''

زیتون نے مکئی کے مٹکے سے ٹاٹ کی بوری ہٹا لی۔ اُس نے دردانہ سے کہا:۔

''بیٹی خطرہ ٹل گیا۔ اب تم باہر آجاؤ۔''

دردانہ باہر آگئی۔ باہر آتے ہی سب سے پہلا سوال اُس نے شاہ باز خان سے کیا۔

''شیرو کہاں ہے؟''

''اُسے پولیس پکڑ کر لے گئی''

''میری وجہ سے اُسے پولیس نے پکڑ لیا۔ میں اُسے اُن کی حراست میں رہنے نہیں دوں گی۔ میں خود تھانے میں اپنے آپ کو پیش کروں گی۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا''

''کیسی پاگل پن کی باتیں کر رہی ہو بیٹی۔ تم اگر پولیس کے ہتھے چڑھ گئی نا تو وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔''

''میں یہ بھی نہیں چاہوں گی کہ جس مہربان نے میری خاطر اتنا بڑا خطرہ مول لیا وہ میری وجہ سے تکلیف اُٹھائے۔ نہیں، میں یہ ظلم اُس پر ہونے نہیں دوں گی''

''بیٹی شیر خان کا اللہ نگہبان ہے۔ اُس کا بال بھی بانکا نہیں ہوگا۔ وہ شیر کی اولاد ہے۔

وہ پولیس کی مار سے ٹوٹنے والا نہیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ آج نہیں تو کل وہ چھوٹ کر آئے گا۔ اُس نے کوئی قتل کیا ہے کیا۔ شبہ میں پولیس لے کر گئی ہے نا اُسے۔ زیادہ سے زیادہ پوچھ تاچھ کریں گے۔ خدا نہ کرے پھانسی تھوڑے ہی لگا دیں گے"

دردانہ کچھ نہ بولی۔ وہ شیر خان کے خیالوں میں کھو گئی۔

(۲۵)

شیر خان حوالات میں بند تھا۔ چار پولیس والے اُسے جانوروں کی طرح پیٹ رہے تھے۔ اُس سے ان پولیس والوں نے اُتو اُتو کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ بار بار کرید کرید کے ایک ہی سوال پوچھ رہے تھے۔

"بول سالے کہاں چھپا کر رکھا ہے اُس جاسوس کو؟"

وہ مار کھائے جا رہا تھا پھر بھی دردانہ کے بارے میں کچھ نہیں بتا رہا تھا۔ وہ اُس سے ڈنڈوں اور بیلٹوں سے پیٹتے جا رہے تھے۔

"بول کمینے بول۔ کہاں ہے وہ جاسوس؟"

"مجھے نہیں معلوم" اُس کا بس ایک ہی جواب ہوتا تھا۔

مار کی سختی اب اُس کی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کا پورا بدن ٹوٹ چکا تھا۔ اُس کے منہ سے خون رس رہا تھا۔ پولیس والوں نے اُس کا پلیتھن نکال کے رکھ دیا تھا۔ اتنی ساری جسمانی اذیتیں سہنے کے باوجود وہ دردانہ کے بارے میں کچھ بھی بتانے کے لئے تیار نہ تھا۔ یہ دردانہ کی نگاہوں کا سحر تھا یا اُس کی جادو جگاتی شخصیت کا اثر جو وہ اتنی جسمانی اذیتوں کے باوجود ٹوٹنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اُس کے دل کے نہاں خانوں میں محبت کے کسی ایسے جذبے نے جنم لیا تھا جو اُس کو موت سے لڑنے کی قوت بخش رہا تھا اور جو اُس کے ٹوٹنے کے عمل کو روک رہا تھا۔

حوالدار اسلام دین نے تھانیدار ارشاد علی کو ایک کونے میں لے جا کر کہا۔

"صاحب مجھے لگتا ہے کہ یہ واقعی بے گناہ ہے۔ اس سالے کو میں برسوں سے جانتا ہوں۔ اس میں اتنا دم نہیں کہ اتنی مار کھانے کے باوجود یہ سچائی نہ اُگلے۔ یہ تو دو تھپڑ کھانے پر سب

کچھ اُگل دیتا ہے۔ آج جب کہ ہم نے اسے جانوروں کی طرح پیٹا پھر بھی ہم اس سے کچھ نہیں اُگلوا سکے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ پاکستانی جاسوس واپس بھاگ گیا ہے۔ یہاں ہوتا تو یوں زمین دوز نہیں ہوتا۔ کہیں نہ کہیں اُس کی بو باس مل ہی جاتی"

"وہ جاسوس واپس نہیں گیا ہے بلکہ یہیں کہیں چھپا ہے۔ اسے ابھی جانے دو مگر اس پر کڑی نظر رکھو۔"

"جیسا حکم جناب"

سلام دین نے شیر خان کو رہا کر دیا۔ وہ بڑی مشکل سے کھڑا ہوا اور پھر لڑکھڑاتے ہوئے حوالات سے باہر آ گیا۔ اُس کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر دھیرے دھیرے پولیس تھانے سے باہر نکل گیا۔

(۲۶)

دردانہ شیرو کی یاد میں آنسو بہائے جا رہی تھی۔ زیتون اُس کو حوصلہ دیتی۔ اُس کے آنسو پونچھتی اور اُسے یقین دلانے کی کوشش کرتی کہ شیر خان آج نہیں تو کل پولیس سے چھوٹ کر آئے گا۔ دراصل وہ اپنے آپ کو خطاوار سمجھ رہی تھی کہ اُس کی وجہ سے اُس کو پولیس پکڑ کر لے گئی اور اُس پر پولیس کا قہر ٹوٹا ہوگا۔

وہ اٹھارہ گھنٹے پولیس حراست میں رہا۔ یہ اٹھارہ گھنٹے دردانہ کے لئے اٹھارہ صدیوں سے کم نہ تھے۔ وہ اپنے محسن کو قید و بند کے عذاب سے آزاد دیکھنا چاہتی تھی، لیکن وہ کتنی بے بس، کتنی لاچار، مجبور اور بے دست و پا تھی۔ وہ چاہ کر بھی اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ بے بسی کا یہی احساس اُس کے دل و دماغ کو کچوکے لگا رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے آپ سے یہ سوال کرتی تھی کہ یہ اللہ کا کیسا انصاف ہے کہ جو نیکی کرے وہی مار کھائے۔

وہ یہی سوچ رہی تھی کہ شیر خان لڑکھڑاتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ زیتون ایک چیخ مار کر اُس کی طرف لپکی۔ وہ اُس کی بانہوں میں گر گیا۔ زیتون سیاپا کرنے لگی۔

"ہائے ہائے دیکھو تو اُن ظالموں نے میرے بچے کا کیا حال کر دیا ہے۔"

شیر خان کی حالت دیکھ کر دردانہ کا کلیجہ پھٹا جانے لگا۔ وہ بھی اُس کی طرف بڑھی اور روتے ہوئے بولی:۔

''میں جانتی تھی کہ وہ ظالم تمہارا یہ حال کر دیں گے''

''وہ جتنا مار سکتے تھے اُس سے کہیں زیادہ مارا پیٹا پھر بھی میں نے تمہارے بارے میں اُنہیں کچھ نہیں بتا دیا۔''

''کیوں نہیں بتایا تم نے۔ارے بتایا ہوتا تو کم سے کم اس مار سے بچ جاتے۔آخر تم نے میری خاطر اپنے ساتھ اتنا ظلم کیوں کیا؟''

''دردانہ اگر ایک پیڑ سوچے کہ میں تیز دھوپ میں اپنے پھول پتے کیوں جلاؤں تو پھر ٹھنڈی چھاؤں کیسے ملے گی۔تھکے ماندے مسافر کہاں بیٹھ کر ستا لیں گے۔ دوسرے کو چھاؤں دینے کے لئے ایک کو تو جلنا ہی پڑے گا۔یہی تو دنیا کا دستور ہے''

''میں اس دستور کو نہیں مانتی۔آخر یہ کیسا انصاف ہے کہ جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو وہ سزا پائے اور جس نے جرم کیا ہو وہ بچ کے نکل جائے۔''

اب کے زیتون اُسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

''بیٹی نیکی اور بدی میں تو یہی فرق ہے کہ نیکی ظلم سہتی ہے جب کی بدی ظلم ڈھاتی ہے۔اگر نیکی بھی ظلم کرنے لگے تو پھر وہ کیسی نیکی''

''نیکی کی سزا اتنی سنگین ہوتی ہے یہ میں نے آج جانا ہے۔''

وہ شیر کے گھاؤ دیکھنے لگی۔ وہ ان گھاؤں کو اپنی نگاہوں سے، اپنے احساس سے اور اپنی روح سے سہلانے لگی۔

(۲۷)

رات کا وقت تھا۔صاف وشفاف آسمان پر چاند اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔پوری وادی نقرئی چاندنی میں نہلا رہی تھی۔اس لہراتی چاندنی رات کو گلمرگ میں بہنے والے چھوٹے بڑے ندی نالے اپنے سنگیت سے پُر کیف اور رومان خیز بنا رہے تھے۔شیر خان

اور وردانہ کوٹھار کے پچھواڑے میں کھلے آسمان کے نیچے اس پُر کیف چاندنی رات میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی ہی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ وردانہ اُس کے زخموں کو اپنے ملائم ہاتھوں سے سہلا رہی تھی۔ شیر خان کو لگ رہا تھا کہ جہاں جہاں وردانہ کے ہاتھ اُس کے بدن کو چھوتے تھے، درد چھومنتر ہو جاتا تھا۔

''درد تو نہیں ہو رہا ہے؟''

''سچ کہوں، جہاں جہاں تم ہاتھ لگاتی ہو، درد خود بخود غائب ہو جاتا ہے''

''بنا رہے ہو مجھے''

''بنانے والے کو کوئی کیا بنا سکتا ہے۔''

''اچھا ایک بات بتاؤ۔ تم نے میرے لئے اتنی تکلیف کیوں اُٹھائی؟''

''تم تکلیف کی بات کرتی ہو۔ اگر وہ مجھے دار پر بھی چڑھا لیتے تب بھی میں اُنہیں تم تک پہنچنے نہیں دیتا''

''وہ کیوں؟''

''اس کیوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ شاید اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ دیکھو میری نیت پر کوئی شک مت کرنا۔ تم میرے پاس ایک امانت کی طرح ہو۔ مجھے ٹھیک ہونے دو۔ میں ٹھیک ہوتے ہی تمہارے چچا جان کا پتہ لگا لوں گا اور تمہیں اُس تک پہنچاؤں گا''

وردانہ اچانک اُداس ہو گئی۔ شیر خان اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔

(۲۸)

''کیا سوچنے لگی؟'' شاہ باز خان نے لیٹے لیٹے ہی زیتون سے پوچھا۔

''سوچ رہی ہوں کہ جو کچھ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں، یہ خواب ہے یا حقیقت؟''

''مجھے تو اب بھی سب کچھ خواب ہی لگ رہا ہے''

''ہم چاہیں تو یہ خواب حقیقت میں بدل سکتا ہے۔ دیکھو وردانہ شیرو کے ماضی کے

بارے میں کچھ نہیں جانتی ہے۔وہ دل ہی دل میں شیرو کو چاہنے لگی ہے۔کیا تم ایسا نہیں مانتے کہ اللہ نے دردانہ کو شیرو کے لئے اس گھر میں بھیج دیا ہے؟"

"ہاں میں اسے اللہ کی دین ہی سمجھتا ہوں۔بس مجھے ایک ہی ڈر کھائے جارہا ہے کہ کہیں دردانہ کا چاچا خدا بخش اس رشتے میں کوئی اڑچن نہ ڈال دے۔اپنا سکہ کھوٹا جو ٹھہرا۔"

"چاہت کے بازار میں کھرا کھوٹا سب چلتا ہے۔وہ کہتے ہیں نا جہاں میاں بیوی راضی ہوں تو وہاں قاضی کی نہیں چلتی ہے۔میں کہتی ہوں تم دس کام چھوڑ کے پہلے خدا بخش کو کہیں سے ڈھونڈ نکالو۔دردانہ کہتی ہے کہ وہ کہیں پرنگ میں رہتا ہے۔ایک بار وہ مل گیا نا تو میری آدھی مراد پوری ہو جائے گی۔باقی کی مراد تب پوری ہوگی جب میں اپنے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھوں گی۔میں بیٹے کے سر پر سہرا دیکھے بنا مرجانا نہیں چاہتی۔"

"مجھے دو تین دن کی مہلت دو۔میں خدا بخش کو پاتال سے ڈھونڈ نکالوں گا۔اب رات بہت ہوگئی۔اب سو جاؤ"

زیتون کے لئے آج کی رات بڑی سہانی، بڑی خوش کن رات تھی۔آج کتنے برسوں کے بعد اپنے آپ کو مسرور پا رہی تھی۔وہ دل میں کتنے ہی خواب سجائے بیٹھی تھی۔دل میں ست رنگی خوابوں کے جھالر سجائے، جب وہ تخیل کی نظروں سے دردانہ کو دیکھ رہی تھی تو اُسے وہ قوس قزح کی طرح تخیل کے اُفق پر اپنی تمام تر دلکشی کے ساتھ نظر آرہی تھی۔

(۲۹)

دردانہ کے آنے سے شیر خان کی زندگی کا ڈھرا ہی بدل گیا۔دردانہ کے آنے سے پہلے وہ کتنی بے مطلب، بے کیف اور بے مصرف زندگی گزار رہا تھا۔دردانہ کے آنے سے سب کچھ بدل گیا تھا۔زندگی کو جیسے نئے معنی اور مفہوم مل گئے تھے۔سنگیت کو جیسے نئے سُر مل گئے تھے۔رنگ وہی تھے، صرف رنگوں کا انتخاب بدل گیا تھا۔دلوں میں سلگتی محبت کی چنگاری اب دھیرے دھیرے شعلے کی صورت اختیار کر چکی تھی۔محبت نئی اُمنگوں اور نئے ترنگوں کو جگا گئی تھی۔خوابوں کے آئینے میں اُنہیں اپنی خوش آئندہ زندگی کے خدوخال صاف دکھائی دے رہے تھے۔

دن لمحے بن کر رہ گئے تھے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب شیر خان کا ایک ایک دن کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ اب دن ایسے اُڑ رہے تھے جیسے وقت کے پر لگے ہوں۔ شیر خان دردانہ کو ایک پل بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل ہونے نہیں دیتا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ اُسے اپنے آپ میں ضم کر لیتا۔ اُسے اپنے اندر جذب کر لیتا۔ کبھی کبھی دردانہ اُس کے اس والہانہ پن کو دیکھ کر اُس سے چڑاتی بھی تھی۔

''تم تو صبح سے شام تک سایئے کی طرح میرے ساتھ ساتھ پھرتے ہو کہ کہیں میں کسی اور کے ساتھ نہ بھاگ جاؤں۔''

''ایک بار بھاگ کے تو دکھاؤ۔ قسم خدا کی پہلے اُس کمینے کو ماروں گا پھر خود مر جاؤں گا۔''

دردانہ اُس کی اس دیوانگی کو دیکھ کر مسرور ہو جاتی تھی۔ وہ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اُس کے کاندھے پر سر رکھتی اور پھر جذباتی ہو کر کہتی:۔

''ہمیں اب موت بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتی''

''تو پھر ایسی باتیں کیوں کرتی ہو؟''

''تمہیں چڑانے کے لئے''

چڑانا تو محض ایک بہانہ تھا۔ دراصل ہر عورت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُس کا محبوب اُسے سب سے زیادہ پیار کرے۔ مرد جب عورت کے سامنے اپنی محبت کا اقرار کرتا ہے تو وہ بہت خوش ہو جاتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ مرد ہمیشہ اُس کی خوبصورتی کی تعریف کرے۔ دردانہ بھی اُسی قبیل کی عورت تھی۔

ایک دن وہ کھیتوں کی منڈھیر پر بیٹھے تھے کہ جمعہ خان وہاں سے گزرا۔ جمعہ خان کو دیکھ کر شیر خان کا ماتھا ٹھنکا۔ سانپ چوہے کا بل دیکھ چکا تھا۔ جمعہ خان نے جب دردانہ کو دیکھا تو حیرت کے مارے اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اتنی خوبصورت لڑکی اس بدکار کے ساتھ۔ یہ گورکھ دھندہ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ وہاں سے کھسک کر سیدھے گھر کی طرف ہو لیا۔

جمعہ خان کی عورت دلشاد بھی کافی خوبصورت تھی مگر کہاں ہیرا اور کہاں کانچ کا ٹکڑا۔ ویسے بھی انسانی فطرت ایسی ہے کہ بیوی کتنی ہی خوبصورت ہو، اُس کی خوبصورتی نظر نہیں آتی جب کہ دوسرے کی سڑی گلی بیوی بھی پر کشش اور خوبصورت لگتی ہے۔

جمعہ خان جب گھر پہنچا تو اُس پر عجب سا نشہ اور بے خودی طاری تھی۔ اُس کی بیوی، اُس کی حالت دیکھ کر سمجھ گئی کہ شاید وہ نشہ کر کے آیا ہے۔ اُس نے قدرے بیزاری سے پوچھا:۔

''کیوں جی آج گانجا پی کر آگئے ہو کیا؟''

''بیگم آج ہم نے گانجے کا نہیں خوبصورتی کا نشہ کیا ہے۔ آج ہم نے ایک آسمانی حور کو اس زمین پر دیکھا ہے۔ واللہ ہم تو ایک ہی نظر میں ڈھیر ہو گئے۔ دلنواز خان اس حسین بلا کو دیکھے گا تو دیکھتے ہی اپنا دل و جان اُس کے قدموں میں رکھ دے گا۔ میں ابھی دلنواز خان کو خبر کر کے آتا ہوں۔''

وہ جونہی گھر سے باہر آگیا تو باہر شیر خان کھڑا تھا۔ شیر خان کو دیکھ کر اُس کی گھگھی بندھ گئی۔ شیر خان نے طنزیہ انداز میں پوچھا:۔

''دلنواز خان کے پاس جا رہے ہو نا۔ جاؤ جاؤ جلدی جاؤ۔ دلنواز خان تمہارا منہ موتیوں سے بھر دے گا''

''میں کہتا ہوں تم بھی میرے ساتھ چلو۔ وہ تمہیں بھی مالا مال کر دے گا۔''

''ہٹ۔ میں چور ضرور ہوں مگر تمہاری طرح بھڑوا نہیں ہوں۔'' وہ غصے سے چلایا۔ ''ویسے تمہاری بیوی کا بھی کوئی جواب نہیں۔ اپنی بیوی کو دلنواز خان کے پاس کیوں نہیں لے جاتے۔ بہت خوش ہو گا وہ۔''

جمعہ خان پانی کے بلبلے کی طرح ٹھسے سے نیچے بیٹھ گیا۔ پھر بھی وہ ہمت کر کے غرایا۔

''میری غیرت کو مت للکارو۔''

''غیرت عزت داروں کی ہوتی ہے، بھڑوے اور دلالوں کی نہیں۔ تم ایک بے غیرت اور بے حیا انسان ہو۔ تمہارے اندر کا انسان مر چکا ہے۔ تم عورتوں کی دلالی کرتے ہو پھر بھی

غیرت کی بات کرتے ہو۔ شرم آنی چاہیئے تمہیں۔"

"شیر خان" وہ غصے سے چلایا۔

"چلاؤ مت جمعہ خان۔ چلانے سے غیرت نہیں جاگتی۔ اگر اپنی عزت کا ذرا بھر پاس ہے تو مجھے چھیڑنے کی کوشش مت کرو۔ یہ مت بھولو کہ شیش محل میں رہنے والے دوسروں پر پتھر نہیں پھینکا کرتے۔ اگر تم نے دردانہ کے بارے میں دلنواز خان کو کچھ بتایا تو میں بھی تمہاری بیوی کے بارے میں دلنواز خان سے بات کروں گا"

جمعہ خان کو جیسے سانپ سنگھ گیا۔ شیر خان اُسے دھمکا کے چلا گیا۔ وہ ابھی تک بت بنا کھڑا تھا۔

(۳۱)

دلنواز خان نے سیمابی طبعیت پائی تھی۔ جس طرح پارہ تاپ سے اُچھلنے لگتا ہے اسی طرح دلنواز خان بھی عورتوں کو دیکھ کر اُچھلنے لگتا تھا۔ عورت اُس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ اُس کے پاس تھا پھر بھی اُس کی بھوک مٹ نہیں پا رہی تھی۔ وہ دولت کے بل پر ہر حسین لڑکی کو خریدنا چاہتا تھا اور اُس کو اپنی حرم کی زینت بنانا چاہتا تھا۔

جمعہ خان اب کے یہ طے کر کے آیا تھا کہ وہ دلنواز خان سے دوٹوک لہجے میں کہہ دے گا کہ آج سے وہ اُس کے لئے عورتوں کی دلالی نہیں کرے گا۔ آج شیر خان جیسے چور نے اُس کی عزت کی ایسی تیسی کر کے رکھ دی۔ یہ تو اُس کی تقدیر اچھی تھی کہ اُس وقت وہاں سے کوئی نہیں گزرا، نہیں تو اُس کی عزت دو کوڑی کی بھی نہ رہ جاتی۔

"بڑے تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ کیا بات ہے جمعہ خان۔ گھر میں بیوی سے جھگڑا کر کے آئے ہو کیا۔"

"اجی اللہ نے ایسی جوڑی ملا دی کہ ایک نظر دیکھتے ہیں تو چالیس کی رفتار پکڑ کر گھر سے بھاگ جاتے ہیں۔ جب تھک کے چور ہو جاتے ہیں تو تمہارے دیوان خانے کا رخ کر لیتے ہیں۔ اللہ ایسی بد صورت بیوی کسی کو نہ دے۔"

"لیکن ہم نے تو سنا ہے کہ تمہاری بے حد خوبصورت ہے۔"

"سنانے والا ضرور کوئی بد ذوق اور بدصورت ہوگا، جسے میری بھدی اور بے ڈول بیوی میں خوبصورتی نظر آئی۔ اس بستی میں جو دو چار نگینے تھے وہ تمہارے حرم کی زینت بن چکی ہیں۔ باقی جو بھی کنکر پتھر بچے ہیں اُن سے ہم جیسے لوگ ماتھا پھوڑ لیتے ہیں۔"

دلنواز خان جمعہ خان کی باتیں سن کر قدرے مایوسی سے بولا۔

"اس کا مطلب یہ کہ اب ہمارے گلدان میں کوئی نیا پھول سجے گا نہیں"؟

"سجے گا، ضرور سجے گا۔ بہار کو آنے دو۔ کلیوں کو کھلنے دو۔"

"مجھے تمہاری وفاداری اور نمک حلالی پر بڑا ناز ہے جمعہ خان"

"ہم بھی تم سے ہی ناز کرتے ہیں۔ تم خوش رہو گے تو ہم بھی خوش رہیں گے"

"واہ کیا بات کہی تم نے۔ جیو میرے جمعہ خان۔ جیو"

جمعہ خان کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی ہنسی اُبھری۔ اندر سے شیر خان کی باتیں اُسے کچوکے مار رہی تھیں۔

(۳۲)

زیتون دردانہ کی چوٹی بنا رہی تھی جب کہ بغل میں بیٹھا شیر خان خرمستیوں میں مصروف تھا۔ کبھی وہ چپکے سے دردانہ کی چوٹی کاٹتا۔ کبھی اُسے گدگداتا۔ وہ کبھی درد کو چپ چاپ سہہ لیتی تھی تو کبھی ہنسی کو ہونٹوں میں دبا لیتی تھی۔ اس عمل میں وہ کبھی کسمسانے لگتی تھی تو کبھی اُچھلنے لگتی تھی۔ زیتون اس ساری چھیڑ چھاڑ سے بے خبر تھی۔ جب وہ زیادہ ہلنے لگی تو زیتون نے اُسے پیار سے ڈانٹتے ہوئے کہا:۔

"اتنا نازک بدن بھی تم سے سنبھالا نہیں جاتا۔ جب دیکھو ہلتی ڈھلتی رہتی ہو"

دردانہ مارے شرم کے زمین میں گڑھ کر رہ گئی۔ اُس نے ترش نظروں سے شیر خان کی طرف دیکھا۔ شیر خان پر اُس کی تیکھی نظر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اُس کی ہر ادا سے محظوظ ہوتا رہا۔ وہ اپنی شوخیوں اور شرارتوں میں مصروف تھے کہ اچانک کوٹھار کا دروازہ کھلا۔ سب کی نگاہیں

دروازے کی طرف مرکوز ہو گئیں۔شاہ باز خان اپنے کاندھے سے لوئی اور سر سے پگڑی اُتار کر ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔شاہ باز خان آج خلافِ توقع خوش نظر آ رہا تھا۔

''کیا بات ہے آج بڑے خوش دکھائی دے رہے ہو۔؟''

''ہاں بھائی بات ہی خوشی کی ہے۔میں دردانہ کے لئے خوش خبری لے کر آیا ہوں۔ اُس کے چچا خدا بخش کا پتہ مل گیا''

اس خبر سے دردانہ کو خوش ہونا چاہیئے مگر ہوا اُلٹ۔وہ یہ خبر سن کر سکتے میں رہ گئی جب کہ شیر خان بت بنا بیٹھا تھا۔اُنہیں لگ رہا تھا کہ شاہ باز خان نے جیسے خوش خبری کی آڑ میں موت کا فرمان سنا دیا ہو۔زیتوں دردانہ کی اُداسی اور افسردگی کو اُس کے چہرے سے پہچان گئی۔اُس نے اُسے پچکارتے ہوئے کہا:۔

''اُداس نہ ہو جا بیٹی۔ہم بہت جلد تمہارے چچا کے سامنے جھولی پھیلا کر تمہیں اپنے شیرو کے لئے مانگیں گے۔مجھے پورا یقین ہے وہ کبھی انکار نہیں کریں گے''

''بیٹی تم ڈولی میں بیٹھ کر اس گھر میں دلہن بن کر آؤ گی تو کسی کو اُنگلی اُٹھانے کا موقع نہیں ملے گا۔ہمیں اپنی عزت سے تمہاری عزت زیادہ پیاری ہے۔اب خوشی خوشی اُٹھ اور جلدی سے تیار ہو جا۔'' شاہ باز خان شیر خان کی طرف مڑ کر بولا۔''تم بیٹھے بیٹھے میرا منہ کیا تک رہے ہو۔دردانہ کو چھوڑنے نہیں جاو گے۔جا جلدی سے تیار ہو جا۔لمبا سفر طے کرنا ہے۔جا۔''

شیر خان بادلِ نخواستہ اُٹھا اور تیار ہونے لگا۔دونوں چند منٹوں میں تیار ہو گئے۔شاہ باز خان نے شیر خان کو زادِ راہ دے کر سمجھاتے ہوئے کہا۔

''پرنگ میں کسی سے بھی خدا بخش کا نام پوچھ لینا۔وہ تمہیں اُس کے گھر تک پہنچا دے گا۔راستے میں علی نانبائی کی دکان سے دو روپے کی روٹی لے کر جانا۔سفر میں کام آئے گی اور ہاں میری بچی کو پھول کی طرح لے کر جانا۔اُسے راستے میں کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔''

شیر خان چپ چاپ باپ کی نصیحتوں کو سنتا رہا۔دردانہ زیتون کے گلے سے مل کر رو رہی تھی۔زیتون بھی اپنے آنسو روک نہیں پائی۔وہ بھی رو پڑی۔شاہ باز خان نے بھی دردانہ کو

پیار کیا اور پھر ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ دونوں کو رخصت کیا۔

(۳۴)

جدائی کا احساس دونوں کے دل و دماغ کو گرماتا جا رہا تھا۔ تقدیر آگے کیا کھیل کھیلے گی یہ دونوں نہیں جانتے تھے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ آئندہ وہ پھر مل بھی پائیں گے یا نہیں۔ وہ بوجھل قدموں کے ساتھ آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ اسی طرح جیسے کسی کے جنازے میں شریک ہونے جا رہے ہوں۔ شیر خان آگے آگے چل رہا تھا اور دردانہ اُس کے پیچھے پیچھے۔ دونوں دل پہ درد و کرب کا بوجھ لئے چل رہے تھے۔ آنکھوں سے اشکوں کی بارش ہو رہی تھی۔ شیر خان تو کچھ زیادہ ہی دکھی تھا۔ پہلی بار اُس کے دل پر کسی حسینہ نے دستک دی تھی۔ پہلی بار وہ پیار کے لطیف احساس سے آشنا ہوا تھا۔ پہلی بار اُسے لگا تھا کہ اُسکی بے رنگ و بے کیف زندگی میں بہار آگئی پہلی بار اُسے لگا کہ اُس کی ویران زندگی میں جیسے پھول ہی پھول کھلے۔

وہ روتے بھی جا رہے تھے اور خراماں خراماں چلتے بھی جا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے اپنے کاندھے پر اپنے ہی لاشے لے کر چل رہے ہیں۔ اچانک دردانہ کو لگا کہ شیر خان کی آنکھوں سے آنسو کی پھوار برس رہی ہے اور وہ بیچ بیچ میں سسکیاں بھر رہا ہے۔ وہ آگے بڑھ کر اُس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اُس کے آنسو دیکھ کر اُس کا کلیجہ شق ہوا۔ اُس نے تڑپ کر شیر و سے کہا۔

"تم ایسا کرو گے تو میرا کیا ہوگا۔ کیوں مجھے اپنے ان آنسو و غم کے طوفان میں بہا دینا چاہتے ہو؟"

شیر خان نے جھٹ سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں اور پھر رقت بھری آواز میں بولا۔

"مجھے یہ ڈر کھائے جا رہا ہے دردانہ کہ کہیں یہ ملاقات ہماری آخری ملاقات نہ ہو"

"ایسا کیوں سوچتے ہو تم؟"

"قسمت نے کبھی میرے ساتھ یاوری نہ کی۔ میں نے جس چیز کو پانے کی زندگی میں تمنا کی وہ تمنا کبھی پوری نہ ہوئی۔ آج بھی مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ کہیں یہ ملاقات ہماری آخری ملاقات نہ بن جائے۔"

''تمہیں اپنے پیار پر بھروسہ ہے نا؟''

''ہاں''

''تو پھر یہ نااُمیدی کیوں؟''

''جب تم میرے ساتھ ہو تو پھر ڈر کس بات کا۔ یقین رکھو اب میں ایک بھی آنسو نہیں بہاؤں گا۔''

کہہ کر وہ پہلی بار دردانہ سے لپٹ گیا اور اُس کے ماتھے کا ایک بوسہ لیا۔ دردانہ کو لگا جیسے اس منظر کو دیکھ کر سارا ماحول جھوم اُٹھا ہو۔ وہ ایک بار پھر اپنی منزل کی جانب چل پڑے۔

(۳۴)

خدا بخش پرنگ کے علاقے میں ایک چھوٹے سے مکان میں اکیلے رہتا تھا۔ برسوں پہلے اُس کی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ ایک لڑکا تھا جسے خدا بخش نے پڑھایا لکھایا۔ پڑھ لکھ کے اُسے ماسٹر کی نوکری مل گئی۔ نوکری ملتے ہی خدا بخش نے اُس کی شادی شہر کی ایک لڑکی سے کردی۔ اب وہ سری نگر میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔

خدا بخش کے بیٹے نور الٰہی کو یہ پہاڑی زندگی پسند نہ تھی۔ اُس نے کئی بار باپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس پہاڑی دنیا سے نکل کر اُن کے ساتھ شہر میں آکر رہے مگر بیٹے کے پیہم اصرار کے باوجود اس گاؤں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ یہ جنگل، یہ خاموشی، یہ ہوائیں، یہ ندی اور آبشار، یہ پھول اور سبزہ زار۔ وہ ان سب سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔

وہ اکیلا تھا اُسے اپنے اکیلے پن پہ کوئی افسوس نہ تھا۔ ہر کوئی اس دنیا میں اکیلے ہی آتا ہے اور اکیلے ہی چلا جاتا ہے۔ بیچ میں کچھ ہم سفر مل جاتے ہیں۔ زندگی کا کچھ سفر وہ ساتھ ساتھ طے کرتے ہیں اور پھر ایک ایک کر کے وہ بچھڑ جاتے ہیں۔ خدا بخش بے شک اکیلا تھا مگر یہاں کے قدرتی حسن نے کبھی اکیلے پن کا احساس ہونے نہیں دیا۔ وہ صبح فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد بہت دور نکل جاتا تھا اور پھر مرغزاروں میں بہت دیر تک بیٹھ کر قدرت کے صناع ہاتھوں کی کاریگری دیکھنے میں کھو جاتا تھا۔

اُس دن بھی وہ گھر کے برآمدے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔شام کا وقت تھا۔سورج کی کرنیں سنہری کرنوں میں تبدیل ہو چکی تھیں اور دھیرے دھیرے اُفق کے کنارے دردانہ کے گالوں کی طرح شفق زار سے لال ہوتے جا رہے تھے۔خدا بخش حقے کے کش لگا رہا تھا تبھی شیر خان دردانہ کو لے کر اندر آ گیا۔خدا بخش پہلے تو چونکا پھر وہ دردانہ کے چہرے کو ٹٹولنے لگا۔اُسے دردانہ کا چہرہ کچھ کچھ جانا پہچانا سا لگا۔وہ اپنے حافظے پر زور ڈالنے لگا مگر وہ اُسے پہچان نہیں پایا۔
شیر خان نے آہستگی کے ساتھ خدا بخش سے پوچھا:۔

"آپ ہی خدا بخش چاچا ہیں نا؟"

"جی ہاں میں ہی خدا بخش ہوں لیکن تم لوگ کون ہو؟"

اتنے میں دردانہ آگے بڑھی اور خدا بخش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"مجھے نہیں پہچانا چچا جان؟"

خدا بخش عجب گومگو کی حالت میں تھا۔وہ دماغ پر پورا زور ڈال رہا تھا پھر بھی وہ دردانہ کو پہچان نہیں پا رہا تھا۔

"چچا جان میں دردانہ ہوں۔تمہاری بھتیجی"

دردانہ کا نام سن کر بوڑھے خدا بخش کی محبت جوش مار گئی۔وہ آگے بڑھ گیا اور دردانہ کو اپنی بانہوں میں بھر کر کسی قدر جذباتی لہجے میں بولا:۔

"میری بچی، میری جان تو کہاں تھی۔ایک بار بھی تمہیں اپنے اس بوڑھے چچا کی یاد نہیں آئی۔برسوں سے میری یہ آنکھیں تم لوگوں کا انتظار کرتے کرتے پتھرا گئیں۔
روز لگتا تھا کہ آج کوئی نہ کوئی آئے گا، لیکن برسوں بیتے میری آس ٹوٹتی چلی گئی۔آج تم آ گئی ہو تو ایسا لگتا ہے جیسے میری ساری مرادیں ایک ساتھ پوری ہو گئیں۔"

"مجھے تمہاری یاد ہی یہاں تک کھینچ کر لائی ہے چچا جان۔" وہ اُس سے لپٹتے ہوئے رو کر بولی۔

بہت دیر تک وہ گلے مل مل کر روتے رہے۔جب یہ رونے دھونے کا عمل پورا ہوا تو وہ

سب گھر کے اندر چلے گئے۔ خدا بخش نے فٹافٹ اپنے ہاتھوں سے چائے تیار کی۔ دردانہ چائے خود بنانا چاہتی تھی مگر خدا بخش نے خدا کا واسطہ دے کر اُسے شیر خان کے پاس بیٹھنے پر مجبور کیا۔ اب وہ تینوں بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے خدا بخش نے دردانہ سے پوچھا:۔

''اب یہ بتا بیٹی کہ تم مظفر آباد سے کب اور کیسے یہاں تک پہنچ گئی اور یہ بتا تمہاری ماں کا کیا حال ہے؟''

''اُس کا نام میرے سامنے مت لو چچا جان۔ وہ ماں نہیں ڈائن ہے ڈائن۔ ابو کے مرنے کے بعد اُس نے ایک بوڑھے بکروال کے ساتھ دوسرا نکاح کیا۔ اُس بڈھے نے میری ماں پر کیا جادو کر دیا کہ وہ میری شادی اُس کے لنگڑے بھائی کے ساتھ کرنے کے لئے راضی ہو گئی۔ مجھے وہ لنگڑا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ مجبوراً ایک رات میں سر پر کفن باندھ کر گھر سے نکل پڑی اور سرحد پار کرنے میں کامیاب تو ہوگئی مگر آگے جو کچھ ہوا، تم پوری کہانی سنو گے تو تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ میرے سر پر موت کی تلوار لٹک رہی تھی۔ اگر یہ فرشتہ مجھے نہ ملتا تو میں اس وقت یا تو قبر میں ہوتی یا جیل خانے میں۔''

''مگر یہ نوجوان تمہیں کہاں ملا؟''

''گلمرگ میں۔ یہ مجھے پولیس والوں کی نظروں سے بچ بچا کر اپنے گھر لے آیا۔ اس نے مجھے اپنے گھر میں چھپا لیا۔ پولیس والے اسے پکڑ کے لے گئے اور کرید کرید کے میرے بارے میں پوچھتے رہے۔ اس نے چار دِن تک مار سہی مگر میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں ان کی احسان مند ہوں چچا جان۔ انہوں نے مجھے نئی زندگی دی ہے''

''احسان مند تو مجھے ہونا چاہیئے کہ انہوں نے میرے مرحوم بھائی کی آخری نشانی سے مجھے ملا دیا۔ کیا نام ہے تمہارا بیٹا؟''

''شیر خان، چچا جان''

''تم واقعی شیر ہو بیٹے۔ تم نے بڑی ہمت کا کام کیا ہے۔ اللہ تمہیں اور تمہارے والدین

کو اس کا اجر ضرور دے گا"

"بھائی نور الٰہی کہاں ہے۔ دکھائی نہیں دے رہا ہے؟"

"وہ آج کل اپنی ماسٹرنی بیوی کے ساتھ سری نگر میں رہتا ہے۔ دونوں بڑے مزے میں ہیں۔ سال چھ مہینے میں کبھی فرصت ملی تو ایک آدھ دن کے لئے مجھ سے ملنے چلے آتے ہیں۔ خیر اپنی اپنی قسمت" وہ ایک آہ بھر کر برتن سمیٹنے لگا۔ دردانہ نے اُس کے ہاتھ سے برتن چھینتے ہوئے کہا:۔

"جب تک میں یہاں ہوں، تم بھول سے بھی رسوئی کی طرف نہیں جاؤ گے۔"

"ابھی سے اپنے چچا جان پر حکم چلانے لگی" کہہ کر خدا بخش نے ایک زور کا ٹھہاکہ لگایا۔ شیر خان بھی مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔

(۳۵)

رات آدھی ادھر اور آدھی اُدھر تھی پھر بھی زیتون اور شاہ باز خان ابھی تک جاگ رہے تھے۔ کمرے میں الاو جل رہا تھا جس کی مدھم سی روشنی میں اُن کے چہرے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر پھیلی بے چینی اور بے قراری صاف جھلک رہی تھی۔

"نیند نہیں آرہی ہے کیا؟" شاہ باز خان نے ایک انگڑائی لے کر زیتون سے پوچھا۔

"تم بھی تو جاگ رہے ہو۔ مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو؟"

"کہیں اس بے قراری کی وجہ دردانہ تو نہیں؟" شاہ باز خان نے پوچھا۔

"ہاں! مجھے اُس کی یاد بری طرح ستا رہی ہے"

"یاد تو مجھے بھی ستا رہی ہے مگر کروں کیا۔ من کو پنچھی بنا کر اُس کے پیچھے تو نہیں بھیج سکتا۔"

"تم نے اُسے بھیجنے میں بہت جلد بازی کی۔ کچھ دن اُسے اور روک لیتے۔"

"جلد بازی نہیں کرتا تو کل خدانخواستہ اگر کچھ اونچ نیچ ہو جاتی تو تم ہی کوستی مجھے۔ ارے آج نہیں تو کل اُسے یہاں سے جانا ہی تھا۔ آج گئی تو تکلیف کم ہوئی۔ اور کچھ دن یہاں رک کے جاتی تو پھر اُس کی جدائی کا غم ہمیں بہت درد دے کے جاتا"

''ہاں تکلیف تو بہت ہوتی مگر اس تکلیف کے عوض کچھ دن اور مل جاتے اُس کے ساتھ گزارنے کو''

''اب بس چند دنوں کی ہی بات تو ہے۔ میں اُس کے چاچا کے پاس جاؤں گا۔ اُس کے سامنے جھولی پھیلا کر اُس سے شیرو کے لئے مانگ کر لے آؤں گا۔''

''اللہ کرے وہ دن جلدی آجائیں جب میری لاڈو میرے پاس ہوگی، ہمیشہ کے لئے'' ''انشااللہ وہ دن ضرور آئیں گے''

''آمین'' وہ دونوں دردانہ کے خیالوں میں کھو گئے۔

(۳۶)

شیر خان ایک رات پرنگ میں رکا۔ اگلی صبح اُس نے اپنا پوٹلا باندھ کر جانے کی تیاری کی۔ سچ بات تو یہ تھی کہ دردانہ کو چھوڑ کر اُس کا من جانے کو نہیں کر رہا تھا مگر رکنے کا کوئی جواز تھا ہی نہیں۔ اُس تو بہر حال اس گھر سے جانا ہی تھا۔ وہ تو ایک مہمان تھا اور مہمان کو ہر حال میں جانا ہی پڑتا ہے۔ وہ جب جانے کے لئے تیار ہوا تو دردانہ بھاگ کر آئی اور دھڑکتے دل سے اُس سے پوچھا۔

''تم جا رہے ہو کیا؟''

''ہاں''

''ایک دن اور نہیں رک سکتے؟''

''رک جاؤں گا تو کل کی جدائی کا درد آج کے درد سے کچھ زیادہ تکلیف دہ ہوگا''

اتنے میں خدا بخش بھی آ گیا۔ دردانہ نے ملتجانہ نظروں سے چچا جان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''چچا جان، شیرو جا رہا ہے۔ اسے آج کی رات رکنے کے لئے کہو نا''

''بیٹی یہ اگر یہاں رک گیا تو وہاں اس کے گھر والے اس کے لئے پریشان ہو جائیں گے۔ یہ لو بیٹے میں کچھ کھانے پینے کا سامان لے کر آیا ہوں۔ سفر لمبا ہے، راستے میں کام آئے گا۔''

شیر خان نے سامان لے کر اپنی پوٹلی میں ڈال دیا۔ وہ جانے لگا تو دردانہ پیچھے سے بولی۔

''ابو اور اماں کو میرا اسلام کہنا''

''کہہ دوں گا''

''اپنے گھاؤ پر مرہم لگانا نہ بھولنا''

''نہیں بھولوں گا''

''پہنچتے ہی کسی آنے والے کے ہاتھوں اپنی خیریت کی خبر بھیج دینا''

''جی''

''راستے میں سنبھل کر جانا''

''اچھا۔ اب میں چلوں چچا جان''

''اللہ تمہیں بہ خیر و عافیت اپنی منزل تک پہنچا دے۔ جا اللہ تیرا نگہبان ہے۔''

اُس نے دردانہ کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ دیکھ لیتا تو وہ اپنے آپ کو روک نہیں پاتا۔ جذبات کے دھارے میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتا۔ وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔ وہ ضبط کر کے اُنہیں روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس نے پلٹ کے ایک بار جو دیکھا تو دردانہ دروازے پر کھڑی رو رہی تھی۔ وہ اُس کے پاس چلا گیا اور اپنے آنسو پیتے ہوئے اُس سے بولا:۔

''اگر تم نے مجھے ان آنسو کے ساتھ وداع کیا تو میں شاید گھر تک نہیں پہنچ پاؤں گا۔ راستے میں ہی جذبات کا دھارا مجھے اپنے ساتھ موت کی وادی کی طرف بہا کر لے جائے گا۔''

اُس نے تڑپ کر اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''اس کے آگے کچھ مت بولنا۔ تمہیں میری قسم'' اُس نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا۔ ''اگلے ہفتے ابو کو یہاں بھیج دینا۔ اپنی صحت کا خاص خیال رکھنا۔''

''تم بھی اپنی صحت کا خاص خیال رکھنا۔''

کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے وہاں سے نکل گیا۔ اُس نے پلٹ کے دیکھا

بھی نہیں ۔ دیکھتا تو شاید اپنے آپ کو روک نہیں پاتا۔ دردانہ بہت دیر تک دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی رہی اور قطرہ قطرہ جدائی کے اس زہرِ ہلاہل کو پیتی رہی جو بڑا ہی جان لیوا تھا۔

(۳۷)

زیتون اور شاہ باز خان بڑی بے صبری سے شیر خان کا انتظار کر رہے تھے۔ جب شیرو گھر میں داخل ہوا تو زیتون کا چہرہ کھل اُٹھا مگر جونہی اُس نے اُس کا مغموم اور افسردہ چہرہ دیکھا تو وہ اپنا من مسوس کر رہ گئی۔ اُس کے چہرے سے مترشح تھا کہ وہ دردانہ کی جدائی کے غم سے نڈھال ہے۔

''دردانہ خیریت سے اپنے چاچا کے گھر پہنچ گئی نا؟''

''ہاں پہنچ گئی'' اُس نے بڑی بے دلی سے جواب دیا۔

''خدا بخش تم سے اچھی طرح ملا نا؟''

''بہت پیار اور عزت دی مجھے۔''

''آدمی تو ٹھیک ٹھاک ہے نا؟۔''

''مجھے تو ٹھیک ٹھاک ہی ذکر لگا۔''

''دردانہ نے ہمیں یاد کیا کہ نہیں'' زیتون نے بڑی بے صبری سے پوچھا۔

''وہ تو بس تمہارا اور ابو کا ہی بار بار کر کرتی رہی''

''میرے خیال میں مجھے کل ہی وہاں جانا چاہیئے۔ اسی بہانے دردانہ کو بھی ایک بار دیکھ کے آوں گا لیکن سوچتا ہوں کہ یہ آج ہی وہاں سے آیا اور میں کل چلا جاؤں۔ کہیں میرا آنا اُس کے چاچا کو ناگوار نہ گزرے؟۔''

''تو پھر دو دن بعد چلے جانا۔'' زیتون نے اپنی رائے پیش کی۔

''نہیں دو دن تو بہت ہیں۔ میں دردانہ کو ایک نظر دیکھ کے آنا چاہتا ہوں۔ اُس کے چاچا کو اچھا لگے یا برا میں کل ہی ملنے چلا جاوں گا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

''شیرو سے بھی پوچھ لینا؟''

''جب یہاں سے بھیجا تھا تب مجھ سے پوچھ لیا تھا کیا، جواب پوچھنے کا خیال آیا۔''

کہہ کر وہ غصے سے اُٹھ کر چلا گیا۔ زیتون اور شاہ باز خان ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔

(۳۸)

دردانہ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے شیرو کے خیالوں میں کھوئی رہتی تھی۔ آج بھی وہ جب مرغیوں کو دانہ کھلا رہی تھی اُس کے تصور میں شیر خان تھا۔ چچا خدا بخش پاس ہی بیٹھا حقہ پی رہا تھا، وہ دردانہ کی حرکتوں کا خاموشی سے جائزہ لے رہا تھا۔ اُس کی ہر حرکت اس بات کی غماز تھی کہ وہ کر کچھ رہی تھی اور سوچ کچھ رہی تھی۔ دردانہ اپنے آپ سے باتیں کئے جا رہی تھی۔

''یہ شیرو بھی کمال کا آدمی ہے۔ جب سے وہ گیا ہے نہ کوئی خیر خبر، نہ کوئی پیغام''

دردانہ کی اس دیوانگی پر خدا بخش ہنسے بنا نہ رہ سکا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''بیٹی وہ کل ہی یہاں سے گیا ہے۔ کوئی ایک مہینے پہلے نہیں گیا ہے جو تم اُس کے لئے اتنی فکر مند ہو رہی ہو'' وہ سٹپٹا کر بولی۔

''میں تو سمجھی تھی کہ اُس سے یہاں سے گئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں''

''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ زندگی میں ایسا مقام بھی آتا ہے جب لمحے صدیوں کی طرح لگتے ہیں۔'' خدا بخش نے اُسے پیار کی منطق بڑی سادگی سے سمجھا دی۔

دردانہ کو اس فلاسفی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ یہ جاننے کے لئے بے چین تھی کہ شیر خان خیریت سے اپنے گھر پہنچا کہ نہیں۔

''چچا جان کل تم نے شیرو کو روٹیوں کے ساتھ تھوڑا بہت شکر بھی باندھ کر دیا تھا نا؟''

''ہاں بیٹی میں نے اُسے شکر بھی دیا تھا اور گڑ بھی۔''

''وہ کل ہی گھر پہنچ گیا ہو گا نا؟''

''اب میں کوئی نجومی نہیں ہوں کہ میں یہ بتا پاؤں کہ وہ کل پہنچ گیا کہ نہیں پہنچا۔ پہنچا تو کتنے بجے پہنچا''

''تم شیرو کے ابو اور اماں سے ملے نہیں نا۔ ایک بار تم اُن سے ملو گے نا تو بار بار اُن سے ملنے کا تمہارا دل کرے گا۔ اتنے پیارے اور نیک لوگ ہیں وہ''

وہ انہی کی باتیں کر رہے تھے کہ عین اُسی وقت شاہ باز خان سامنے آکے کھڑا ہو گیا۔ دردانہ کی جونہی شاہ باز خان پر نظر پڑی تو وہ خوشی سے چلا پڑی اور بے تحاشہ اُس کی طرف لپکی اور اُس سے جا کر لپٹ گئی۔

''ابو تم؟''

''کیسی ہو میری بچی؟''

''میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں۔ شیرو کل خیریت سے گھر پہنچ گیا نا؟''

''ہاں بیٹی وہ خیریت سے پہنچ گیا۔''

''اماں کیسی ہے؟''

''جب سے تم گئی ہو ہر پل تمہیں یاد کرتی رہتی ہے۔''

دردانہ خدا بخش کی طرف مڑی اور شاہ باز خان کو آگے لاتے ہوئے اُس سے بولی۔

''چچا جان یہ ہے شیرو کے ابو۔ یہ میرے چچا جان ہیں''

''اسلام علیکم خان برادر''

''وعلیکم سلام بھائی'' اُس نے بڑھ کر اُس سے ہاتھ ملایا اور پھر اُس سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ شاہ باز خان خدا بخش کے پہلو میں جا کر بیٹھ گیا۔ خدا بخش دردانہ سے بولا۔

''ارے تم کھڑی میرا منہ کیا تک رہی ہو۔ گھر میں مہمان آیا ہے۔ چائے پانی کا کچھ انتظام تو کرو۔''

''تم ابو سے باتیں کرتے رہو۔ میں ابھی چائے لے کر آتی ہوں۔''

وہ سرعت سے اندر گئی۔ خدا بخش نے حقے کی نے شاہ باز خان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں تم سب کا احسان مند ہوں کہ تم لوگوں نے میری بچی کو مجھ تک پہنچانے میں اپنی جان جوکھم میں ڈال کر اُس کی مدد کی۔''

''احسان مند تو ہم لوگ ہیں چودھری خدا بخش کہ تمہاری بھتیجی نے چند دنوں میں

ہمارے دل میں گھر کر لیا اور ہمیں چاہت کی ایسی ڈور میں باندھ لیا کہ اس کے بنا ایک پل کاٹنا بھی ہمارے لئے دشوار ہو رہا ہے۔ اُس نے ہمیں کچھ نئے خواب دیئے۔ کچھ نئی اُمنگیں ہمارے دل میں جگائیں۔ وہ چند روز ہی ہمارے گھر میں رہی مگر ہمیں تو ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ صدیوں سے ہمارے دل میں بسی ہوئی ہے۔ ایک احسان کر دو ہم پر۔ یہ ہیرا اس غریب کی جھولی میں ڈال دو۔ ہم جب تک زندہ ہیں تمہیں دعائیں دیتے رہیں گے"

"مجھے سوچنے کا موقع دو شاہ باز خان برادر" وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ دردانہ پہلے سے ہی اس بارے میں فیصلہ کر چکی ہے پھر بھی ایک بزرگ کے ناطے اُس نے اپنا فرض نبھایا۔

"دیکھو برادر اس زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ آج مرے تو کل دوسرا دن۔ میری بیوی کو بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کا بڑا ارمان ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ یہ ارمان دل میں لے کر ہی اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔ اسلئے میرے بھائی ہم غریبوں پر یہ احسان کر دو۔ میں تم سے بھیک مانگ رہا ہوں۔ تم چاہو تو ہمارے بارے میں پوری جانچ پڑتال کر لو۔ ہم غریب ضرور ہیں مگر خودداری سے جیتے ہیں۔"

"دیکھو شاہ باز خان برادر، جانچ پڑتال کی بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ میری بچی بڑی معصوم اور بھولی بھالی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر اس کے ساتھ کوئی دھوکہ ہوا نا تو یہ پگلی اپنی جان دے دے گی"

"دردانہ ہماری جان ہے اور اپنی جان کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں کر سکتا۔ اب رہی سگائی اور شادی کی بات۔ میں چاہتا ہوں کہ اسی ہفتے سگائی ہو اور اگلے ہفتے نکاح۔"

"اتنی جلدی؟" خدا بخش شش و پنج میں پڑ گیا۔

"تمہیں جلدی نہ ہو پر مجھے ہے چودھری۔ ہم اس بچی کے بنا اب ایک پل بھی نہیں رہ سکتے"

اتنے میں دردانہ چائے لے کر آ گئی۔ شاہ باز خان کی مراد پوری ہونے جا رہی تھی۔ وہ اندر سے بڑا خوش تھا۔ وہ دردانہ کی طرف والہانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ دردانہ پیالیوں میں چائے

انڈیل رہی تھی۔

(۳۹)

آخر کار شیر خان کی بیل منڈھے چڑھ گئی۔ وہ دردانہ کو دلہن بنا کر اپنے گھر پر لے آیا۔ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا معاملہ تھا۔ یہ سب دردانہ کی رضامندی کے باعث ہوا تھا۔ وہ شیر خان کو ٹوٹ کر چاہنے لگی تھی اس لئے اُس نے اپنے چچا جان کو مجبور کیا اس رشتے پر فوری مہر لگانے کے لئے۔ زیتون کے دل کی مراد پوری ہوئی تھی۔ وہ کوٹھار جہاں ہمیشہ نحوست چھائی رہتی تھی آج اپنی قسمت پر ناز کر رہا تھا۔ بستی کی ساری گوجر عورتیں لہک لہک کے ناچ رہی تھیں۔ شاہ باز خان کے پاؤں مارے خوشی کے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اُس کی مری ہوئی آرزوئیں جی اُٹھیں تھیں۔ اس کے ارمان پورے ہوئے تھے۔

شیر خان ایک پری کو بیاہ کر لایا تھا۔ جن لوگوں نے شاہ باز خان کی بے عزتی کی تھی آج وہی لوگ دلہن کو دیکھ کر شرمسار ہو کے کھڑے تھے۔ آخر یہ چمتکار ہی تو تھا کہ جس کے رشتے کی بات سن کر بستی کے لوگ برافروختہ ہو کے رہ جاتے تھے وہی لوگ یہ دیکھ کے حیران تھے کہ آخر شاہ باز خان نے ایسا کیا جادو کر دیا جو اپنے بیٹے کے لئے حور پری جیسی بیوی لے کر آ گیا۔

رات گئے تک شاہ باز خان کے گھر پر خوشی کی یہ محفل جمی رہی۔ شاہ باز خان نے مہمانوں کے لئے طعام کا انتظام کر کے رکھا تھا۔ سب لوگ کھانا کھا کر اپنے اپنے گھروں کی طرف چل پڑے۔ دردانہ اور شیر خان بھی کافی تھک چکے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ شاہ باز خان کوٹھار کے باہر بیٹھا ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر خدا کا شکر ادا کرنے لگا جس نے اُس کے بیٹے کی جھولی خوشیوں سے بھر دی تھی۔

(۴۰)

پہلی رات۔ دردانہ اپنے بستر پر ایک بند گٹھری کی طرح سہمی سکڑی سی بیٹھی تھی۔ شیر خان نے جب اُس کے چہرے سے گھونگھٹ ہٹا لیا تو وہ اور زیادہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ شیر خان نے

اُس کی ٹھوڑی اوپر اُٹھائی تو اُس نے اپنی آنکھیں نہیں کھولیں ۔شیر خان اس تبدیلی پر حیران تھا۔کل تک تو وہ بے دھڑک ایک دوسرے کو چھیڑا کرتے تھے۔آج یہ اجنبیت، یہ لاج، شرم کہاں سے در آئی تھی۔

''دردانہ'' اُس نے بڑے پیار اور آہستگی سے اُسے پکارا۔

''ہوں''

''آج تم مجھ سے اس طرح شرما کیوں رہی ہو؟''

''میں کیا جانوں''

''تم نہیں جانتی تو کون جانتا ہے؟''

''اپنے آپ سے پوچھنا؟''

''اپنے آپ سے کیا پوچھوں۔ مجھے تو تم آج ایک اجنبی کی طرح لگ رہی ہو۔تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟''

وہ کچھ نہ بولی۔شیر خان سمجھ گیا کہ اس اجنبیت کی دیوار کو اب ختم کرنا ہی پڑے گا۔وہ اُسے بانہوں میں بھر کر بولا۔

''دیکھ آج کا یہ دن میری زندگی میں کافی منتوں اور مرادوں کے بعد آیا ہے۔آج ہر فاصلے، ہر دوری کو ختم کر دو اور اس طرح مجھ میں ضم ہو جاؤ جس طرح ایک دھارا، دریا میں ضم ہو جاتی ہے۔مجھ میں اس طرح سما جاؤ کہ کہ میں میں نہ رہوں اور تم تم نہ رہو۔ہم ایک ہو جائیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔''

دردانہ کچھ نہ بولی۔ شیر خان نے طاق پر رکھا دیا پھونک مار کر بجھا دیا اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے میں اس طرح سما گئے جس طرح کئی رنگ ایک کرن میں سما جاتے ہیں۔

(۴۱)

اگلے روز شاہ باز خان کوٹھار کے باہر چٹائی بچھا کر بیٹھا تھا۔ آج وہ اس شہنشاہ کی طرح تمکنت اور سرشاری کے عالم میں بیٹھا تھا جس کا شہزادہ بہت بڑی سلطنت جیت کر آیا ہو۔ اس

پاس کے گوجر اُسے مبارک باد دینے چلے آرہے تھے اور وہ تھا کہ مارے خوشی کے پھونہیں سما جا رہا تھا۔ شاہ باز خان اپنے مہمانوں کی خوب خاطر تواضع کر رہا تھا۔ جو بھی آتا تھا اُسے گرم گرم قہوہ پلایا جاتا تھا اور کھانے کے لئے باقر خوانی۔ جو بھی دلہن سے ملتا تھا وہی شیر خان کی قسمت پر رشک کرنے لگتا تھا۔

مقدم دلنواز خان بھی مبارک باد دینے آیا۔ اُس کے ساتھ اُس کا گرگہ جمعہ خان تھا۔ شاہ باز خان نے مقدم کو بڑی عزت دی۔ دلنواز خان نے شاہ باز خان سے دلہن کے ہاتھوں قہوہ پینے کی فرمائش کی۔ وہ دلہن کا منہ بھی دیکھنا چاہتا تھا اور ساتھ اُسے شگون کے طور پر کچھ دینا چاہتا تھا۔ شاہ باز خان نے دلنواز خان کے حکم کی فوری تعمیل کی۔ اُس نے زیتون سے کہا کہ وہ دردانہ کے ہاتھوں مقدم کے لئے قہوہ بھیج دے۔ جب دردانہ قہوہ لے کر دلنواز خان کے سامنے آگئی تو دلنواز خان سحر زدہ ہو کے رہ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دردانہ کو دیکھنے لگا کیونکہ اُسے اب بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ شیر خان ایسی اپسرا کو بیاہ کر لایا ہے۔

دلنواز خان نے قہوہ کی پیالی تو لی مگر اُس کا سارا دھیان دردانہ کی طرف تھا۔ وہ ایک ہی نظر میں اُسے مسحور کر کے گئی تھی۔ وہ زیادہ دیر تک وہاں بیٹھ نہیں پایا۔ اُس نے ایک سوایک نکال کر دلہن کی منہ دکھائی کے لئے اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور پھر وہ جمعہ خان کے ساتھ نکل گیا۔

اُس کے اس طرح چلے جانے پر وہاں بیٹھے مہمان آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ دلنواز خان کا آندھی کی طرح آنا اور بگولے کی طرح چلے جانا، کافی مطلب رکھتا تھا۔ دردانہ بھی چند لمحوں کے لئے سوچ میں پڑ گئی۔

(۴۲)

دردانہ کو دیکھنے کے بعد دلنواز خان غصے سے پاگل ہوئے جا رہا تھا۔ جمعہ خان اُس کے سامنے ایک مجرم کی طرح کھڑا تھا۔ اُس نے کھا جانے والی نظروں سے جمعہ خان کی طرف دیکھ کر اُس سے پوچھا۔

"تم تو کہتے تھے کہ اس بستی میں اب کوئی حسین چہرہ دیکھنے کو نہیں مل رہا ہے تو پھر یہ حور

کہاں سے نکل آئی؟ آسمان سے اُتری یا زمین سے پھوٹ پڑی"

"میں اس لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا سردار" وہ اپنے اندر کے جھوٹ کو چھپانے کے لئے اپنی آنکھیں نیچے کر کے بولا۔

"جو لڑکی ایک ہی نظر میں میرا صبر و قرار لوٹ کر چلی گئی وہ تمہاری عقابی نظروں سے اب تک اوجھل کیسے رہی؟ ضرور تم نے میرے ساتھ بے وفائی کی ہے۔لنگور کے ہاتھ حور یہ کیسے ممکن ہے۔شیر خان جیسے بد بخت اور بدکار آدمی کے ہاتھ ایسا ہیرا لگے اور مجھ جیسا جوہری کنکر پتھر لے کے بیٹھ جائے۔یہ سب کیسے ہو گیا۔اس بندر کے گلے میں موتیوں کی مالا ڈالنے کے عوض تمہیں کتنے پیسے ملے؟"

"سردار، تم میری وفاداری اور نمک حلالی پر شک کر رہے ہو۔یہ تو میری وفاداری اور جان نثاری کی توہین ہے۔میں شیر خان جیسے بدقماش کے منہ پر تھوکنا بھی پسند نہیں کروں گا۔میں نے برسوں سے تمہارا نمک کھایا اور تمہاری ہی نمک حلالی کرتا رہوں گا"

"اگر یہ بات ہے تو غور سے سن لو۔مجھے وہ حسینہ لا کر دے دو۔بدلے میں تم مجھ سے میرا سب کچھ لے لے۔یہ میرا وعدہ ہے تم سے"

"مگر وہ تو اب شیر خان کی منکوحہ ہے۔میں اُسے شیر خان سے الگ کیسے کر سکتا ہوں"؟

"اُسے شیر خان سے الگ کرنے کے لئے اگر تمہیں شیر خان کا خون بھی کرنا پڑے تو بے دھڑک کر لو۔میں تمہارے پیچھے کھڑا ہوں"

"سردار گرمی مت کھاؤ۔گرم کھانے سے منہ جل جائے گا۔مجھے سوچنے کی تھوڑی بہت مہلت تو دے دو۔تم بس بیٹھ کے تیل دیکھو اور تیل کی دھار دیکھو۔"

"میں بس تمہاری اُمید کے سہارے بیٹھا ہوں۔جمعہ خان! میرے پیارے جمعہ خان یہ دل بڑا بے قرار ہے۔اس دل بے قرار کو تبھی قرار ملے گا جب تم میرے لئے یہ خوش خبری لے کر آؤ گے کہ راہ کا کانٹا نکل گیا اور وہ حور اُس خبیث کے چنگل سے آزاد ہو گئی"

جمعہ خان نے جواب میں کچھ نہ کہا۔وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

(۴۳)

شاہ باز خان صبح صبح کوٹھار کے باہر بیٹھا حقہ پی رہا تھا کہ دردانہ اُس کے لئے چائے لے کر آ گئی۔ شاہ باز خان نے دردانہ سے چائے کا کپ لیا اور پھر چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولا۔

''بیٹے دن چڑھنے کو آ گیا۔ شیرو کو تو اُٹھاؤ۔''

''ابو وہ تو پو پھٹتے ہی کھیت کی جتائی کرنے چلا گیا ہے۔''

شیر خان یہ خبر سن کر ایسا چونکا جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔ وہ اپنی خوشی کو چھپا نہ سکا۔ مارے خوشی کے اُس کے ہاتھ کانپنے لگے اور وہ کھڑا ہو کر رسوئی میں بیٹھی زیتون کے پاس چلا گیا اور شدتِ جذبات سے بولا۔

''تم نے سنا۔ شیرو کھیتوں پر کام کرنے چلا گیا ہے''

''سچ کہہ رہے ہو تم؟''

''ہاں سچ کہہ رہا ہوں۔ ابھی دردانہ سے معلوم ہوا کہ وہ پو پھٹنے سے پہلے ہی کھیتوں پر چلا گیا۔ جس نے آج تک اپنے ہاتھ سے ایک تنکا نہیں چنا وہی پھاوڑا اور کدال لے کے کھیت پر کام کرنے جائے۔ اس سے بڑی کایا پلٹ اور کیا ہو سکتی ہے۔ آخر یہ کایا پلٹ ہوئی کیسے؟''

''یہ دردانہ کے پیار کا اثر ہے جو ہمارا بچہ صحیح راستے پر آ گیا۔''

شاہ باز خان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔ وہ دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا کر بولا۔

''اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تم نے بھٹکے کو راستہ دکھا دیا۔ اب مجھے کوئی غم نہیں۔ اب میں بے سہارا نہیں ہوں۔ اب وہ میرے بڑھاپے کی لاٹھی بن کر مجھے آخری دم تک سہارا دے گا''

''اب اپنے جذبات کو قابو میں رکھو۔ بہو اندر آ رہی ہے۔ اسے اگر شیرو کے ماضی کے بارے میں ذرا سی بھی بھنک لگ گئی تو سب کچھ چوپٹ ہو جائے گا۔''

''تم صحیح کہہ رہی ہو۔ میں باہر جا رہا ہوں''

کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ باہر دردانہ برآمدے میں جھاڑو لگا رہی تھی۔

(۴۴)

شیر خان پھاوڑے سے اپنا کھیت کھود رہا تھا کہ جمعہ خان اپنے دو تین ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے گزرا۔ وہ کیل کانٹے سے پوری طرح لیس تھے۔ دراصل وہ شیر خان کو خوفزدہ کرنے کے ارادے سے آئے تھے۔ شیر خان گبرو جوان تھا۔ اُس میں ان سے زیادہ دم خم تھا اس لئے ان لوگوں کو دیکھ کر نہ اُسے کوئی اچنبھا ہوا اور نہ ہی کوئی گھبراہٹ۔ وہ شیر کی طرح سینہ تان کے کھڑا ہو گیا۔ جمعہ خان کا خون اُسے دیکھ کر اُبلنے لگا۔ وہ غصے سے دانت پیس کر بولا۔

''یاد ہے کمینے جب پرسوں تم نے میرے گھر پر آکر مجھے گالیاں دی تھیں؟''

''لگتا ہے کم دیں اس لئے تم مزید گالیاں کھانے کے لئے ان نامردوں کو لے کر آئے ہو۔''

''کون مرد ہے اور کون نامرد ابھی پتہ چل جائے گا۔ وہ ایک لحیم شحیم گوجر کی طرف مڑا اور اُسے ڈانٹتے ہوئے بولا۔

''کھڑے کھڑے گونگے کی طرح میرا منہ کیا تک رہے ہو پہلوان۔ اس لونڈے کو ذرا اپنے داؤ پیچ تو دکھاؤ'' وہ شیرو کی طرف مڑا اور اُس سے تہدیدی انداز میں بولا۔

''یہ کالو پہلوان ہے۔ اب تک دو خون کر چکا ہے۔ تیسرا تمہارا کرنے والا ہے۔ میں چاہوں تو اسے تمہارا خون کرنے سے روک سکتا ہوں بشرطیکہ تم دردانہ سے دستبردار ہو جاؤ۔ دلنواز خان کو دردانہ ملے گی اور تمہیں زندگی۔''

''جمعہ خان'' وہ آبگولا ہو کے چلایا۔ ''شیر خان موت سے نہ کبھی ڈرا ہے نہ ڈرے گا۔ رہی دردانہ کی بات تو کان کھول کے سن لو۔ جو میری دردانہ کی پرچھائی کو بھی چھونے کی کوشش کرے گا میں اُسے جلا کر راکھ کر دوں گا''

''اس وقت اپنی جان کی خیر منا کیونکہ تم چند لمحوں کے مہمان ہو۔ ابے او مشٹنڈو دیکھ کیا رہے ہو۔ ٹوٹ پڑو اس خبیث پر۔ زندہ گاڑ دو اسے زمین میں۔ مجھے اس سالے سے اُس دن کی بے عزتی کا بدلہ تو لینا ہے۔''

جونہی اُنہوں نے اپنی لاٹھیاں گھمائیں، شیر خان کی گرفت اپنے پھاوڑے پر مضبوط ہو گئی۔ اُس نے پھاوڑے سے اپنے دشمنوں پر تابڑ توڑ وار کر دیئے۔ اُس کے بدن پر پے در پے

لاٹھیاں پڑ رہی تھیں مگر وہ بھی سخت جان تھا، اُس نے چاروں کو بری طرح گھائل کر دیا۔ تین تو بھاگ گئے، چوتھے نے بھاگتے بھاگتے اُس کے سر پر لاٹھی برسائی۔ لاٹھی کھا کر اُس کا سر پھٹ گیا اور وہ بے ہوش ہو کے گرا۔

(۴۵)

دردانہ رسوئی میں بیٹھ کے چائے پی رہی تھی کہ دفعتاً وہ ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور اُس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ کر نیچے گری۔ زیتون جو کہ اس کے پہلو میں بیٹھی تھی، اُسے یوں ہڑبڑاتے دیکھ کر پہلے تو بھونچکی رہ گئی پھر اُس نے گھبرا کے پوچھا:۔

"کیا ہوا بیٹی۔ تم اس طرح کھڑی کیوں ہو گئی۔"

"امی میں نے شیرو کی چیخ سنی۔ وہ ضرور کسی مصیبت میں ہے۔"

"لیکن میں نے تو کوئی چیخ نہیں سنی۔"

"امی میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے شیرو کی چیخ سنی۔ وہ مجھے بلا رہا ہے۔"

وہ ننگے پاوں رسوئی سے بھاگی۔ زیتوں اور شاہ باز خان اُس کے پیچھے بھاگنے لگے۔ شاہ باز خان کو اتنا موقع بھی نہ ملا کہ وہ پوچھ پاتا کہ وہ بے تحاشہ کہاں بھاگے جا رہے ہیں۔ وہ بھی ان کے پیچھے ہولیا۔

(۴۶)

شیر خان خون میں لت پت کھیت کے بیچوں بیچ بے سدھ پڑا تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر دردانہ ایک چیخ مار کر اُس کے اوپر گری۔ زیتون اپنی چھاتی پیٹنے لگی جب کہ شاہ باز خان جامد و ساکت کھڑا تھا۔ اتنے میں بستی کے کچھ لوگ بھی چیخ و پکار سن کے آ گئے۔ وہ اُسے اُٹھا کر کوٹھار پر لے آئے۔ گھر پہنچ کر اُسے ہوش آنے لگا۔ سبھی لوگ باری باری اُس سے ایک ہی سوال کرنے لگے۔

"کس نے تمہارا یہ حال کر دیا؟"

وہ سچ بول کے دردانہ کو خوف و ہراس میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا اس لئے اُس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

''وہ کیا ہے ابو میں کھیتوں پر کام کر رہا تھا کہ ایک ریچھ جنگل سے نکل آیا اور اُس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔''

''ہائے اُس ریچھ کا ہو جائے ستیا ناس۔ کاٹنے پھاڑنے کو اُسے میرا ہی پوت ملا تھا۔ دیکھو تو کیا حال کر دیا ہے میرے بچے کا؟'' زیتون سینے پر دو ہتھڑ مارتے ہوئے بولی۔ شیر خان کا خون اُبل رہا تھا۔ وہ جمعہ خان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا تھا۔ اُسے تڑپا تڑپا کے مار دینا چاہتا تھا۔ اُس کے اندر بدلے کی آگ دہک رہی تھی۔ وہ جمعہ خان کے خون کا پیاسا تھا۔ وہ اندر کے اسی تلاطم سے لڑ رہا تھا کہ تبھی دردانہ اُس کے سرہانے آ کے بیٹھ گئی اور بڑے پیار اور والہانہ پن سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس کا معصوم اور بھولا بھالا چہرہ دیکھ کے شیر خان کے اندر لگی آگ سرد پڑ گئی اور وہ وارفتگی سے دردانہ کی طرف دیکھ کے بولا۔

''تو پریشان مت ہو جا۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میں دو تین دنوں میں پھر سے بھلا چنگا ہو جاؤں گا۔''

دردانہ نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور پھر اُس کی آنکھوں سے خود بخود آنسو ڈھلکنے لگے۔ شیر خان نے اُس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

''اگر تو نے اس طرح اپنی آنکھوں سے یہ آبدار موتی لٹا دیئے نا تو قسم خدا کی میں جیتے جی ہی مر جاؤں گا''

دردانہ نے فوراً اپنی آنکھیں پونچھ لیں اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ دردانہ کی پیار بھری نگاہوں نے شیر خان کے اندر کھولتے ہوئے نفرت اور انتقام کے لاوے کو دھیرے دھیرے ٹھنڈا کر دیا۔

(۴۷)

جمعہ خان کے سر اور بازو پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ دلنواز خان کے سامنے بیٹھا رو رہا تھا۔ دلنواز خان اُس کی ہمت بڑھاتے ہوئے بولا۔

''دیکھ میرے پیارے جمعہ خان اس طرح ہمت ہار کے بیٹھ جانے سے کام نہیں چلے

گا۔ہمیں اس سانپ کا سر کسی بھی قیمت پر کچلنا ہے۔اس کے لئے ہمیں طاقت سے نہیں تدبیر سے کام لینا ہوگا۔ایسا کچھ کرنا ہوگا کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

''آج کل میری نہ تقدیر چلتی ہے نہ تدبیر۔''

''تمہاری تقدیر چلے نہ چلے ،میری تو چلتی ہے۔میں تمہیں بتا تا ہوں کہ تدبیر کیا ہے۔اگر ہمیں دردانہ کو حاصل کرنا ہے تو ہمیں شیر خان کو اُس کی زندگی سے الگ کرنا ہوگا۔''

''یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھتے ہو سردار۔دردانہ دیوانگی کی حد تک شیر خان کو چاہتی ہے۔یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ناخن کو گوشت سے جدا کیا جائے۔''

''گوشت سے ناخن کیسے جدا ہوگا یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔اس وقت تم حکیم صاحب سے جا کر مل لو۔وہی تمہاری مرہم پٹی کر دیں گے۔''

''مرہم پٹی تو اُس حرامی نے کی ہے۔ایک ہی وار میں مجھے لولا لنگڑا بنا کے چھوڑا۔اللہ اس کمینے کے پورے خاندان کو غارت کر دے۔اچھا خاصا آدمی تھا میں۔بھوت بنا دیا مجھے۔دو دن سے بیوی نے گھر میں گھسنے نہ دیا۔کہنے لگی ،نامرد ہو مار کھا کے آئے ہو۔اتنی سنگدل ہے کہ میں باہر کھڑا اُس سے منتیں کرتا رہا کہ دروازہ کھول دے مگر وہ تو کانوں میں روئی ڈال کے بیٹھ گئی۔جب اُس نے دروازہ نہیں کھولا تو میں پاس کی مسجد میں جا کے سویا۔تمہاری وفاداری کا یہ انعام مجھے ملا۔تم تو ٹھاٹ سے جی رہے ہو میں تو گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔''

کہہ کر وہ بدر بدر کرتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔دلنواز خان جمعہ خان کو بھول کر اپنے اگلے منصوبے پر سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔

(۴۸)

شیر خان اور دردانہ اپنے کمرے میں بیٹھے تھے۔باہر گہری اندھیری رات تھی اور اندر کمرے میں ایک دیا روشن تھا جو کبھی ٹمٹمانے لگتا تھا تو کبھی بھڑکنے لگتا تھا۔شیر خان کے سر کی پٹی کھل چکی تھی۔دردانہ اپنی مخروطی اُنگلیوں سے اُس کے سر کو سہلا رہی تھی۔اُس کے نرم و نازک

ہاتھوں کے چھوتے ہی شیر خان کے بدن میں بجلیاں سی دوڑنے لگتی تھیں۔ وہ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے جذباتی انداز میں اُس سے مخاطب ہوا۔

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ جب بھی تمہارے ہاتھ میرے بدن کو چھو لیتے ہیں تو میرے بدن میں جیسے بجلیاں بھر جاتی ہیں۔ انگ انگ سے جیسے نغمے پھوٹنے لگتے ہیں ۔جی کرتا ہے کہ تمہیں اپنی بانہوں میں بھرلوں اور اپنے آپ میں ایسے جذب کرلوں جیسے تپتی دھرتی برسات کی پہلی بوند کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔'' ''میں نے اپنے وجود کو پہلے ہی تمہارے وجود میں جذب کرلیا ہے۔ ہمارے جسم بے شک دو ہیں مگر ہماری جان ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس دن جب ریچھ نے تم پر حملہ کیا تو تمہاری پہلی ہی چیخ پر میری روح ایسی تڑپ اُٹھی جیسے حملہ تم پر نہیں مجھ پر ہُوا ہو۔''

''میں جانتا ہوں دردانہ۔ میں جانتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اب ہمیں موت ہی ایک دوسرے سے جدا کرسکتی ہے۔''

''ہمیں موت بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں کرسکتی۔ہم جئیں گے ساتھ ساتھ، مریں گے ساتھ ساتھ۔''

''اب یہ جینے مرنے کی باتیں چھوڑ دو۔ یہ بتاؤ کہ میں کل شہر جارہا ہوں، تمہارے لئے شہر سے کیا لے کر آؤں؟''

''جو مانگوں لاکر دو گے مجھے؟''

''تم کہو تو میں تمہارے لئے آسمان کے تارے توڑ کر لاسکتا ہوں۔''

''مجھے آسمان کے تارے نہیں ایک سونے کی اُنگوٹھی اور ایک لال ڈوپٹہ چاہیئے۔ لاسکو گے کیا؟''

شیر خان کی آواز حلق میں جاکر اٹک گئی۔ بیوی نے پہلی بار فرمائش کی تھی۔ وہ تو اُس کے ایک اشارے پر اپنی جان نچھاور کرسکتا تھا مگر سونے کی اُنگوٹھی لانا اُس کے بوتے میں نہیں تھا۔ کیونکہ اُس کی مالی حالت اتنی مستحکم نہ تھی کہ وہ اپنی بیوی کی فرمائش پوری کرسکتا تھا۔ وہ پہلا والا شیر خان نہیں

رہا تھا۔اُس نے چوری چکاری سے توبہ کرلی تھی۔پہلے کی بات ہوتی تو وہ دس سونے کی اُنگوٹھیاں خرید سکتا تھا۔کسی جوہری کے یہاں سینڈھ لگاتا۔بیوی کو گہنوں سے لاد دیتا۔اب تو وہ بالکل بدل چکا تھا۔اپنی بیوی کا دل رکھنے کے لئے اُس نے ایک بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ دردانہ سے کہا۔

''ہاں ہاں،ضرور لے کر آئیں گے۔چلو اب سوجائیں۔رات بہت ہوگئی ہے۔''

دردانہ نے پھونک مار کر چراغ بجھادیا۔دردانہ تو سوگئی لیکن شیر خان سو نہ سکا۔وہ سونے کی انگوٹھی کے بارے میں سوچنے لگا۔کہاں سے آئے گی سونے کی اُنگوٹھی۔وہ اسی تگ ودو میں لگا رہا۔

(۴۹)

اگلی صبح وہ شہر کے لئے روانہ ہوا۔گھر والوں سے کہا کہ وہ کام کے سلسلے میں شہر جارہا ہے لیکن وہ شہر گیا نہیں بلکہ ٹنگمرگ جاکر غنی میر ٹھیکدار سے ملا۔غنی میر جنگلات کا بہت بڑا ٹھیکدار تھا۔وہ سرکار سے جنگلی لکڑی کے بڑے بڑے ٹھیکے لے لیتا تھا اور پھر صنوبر اور چیڑھ کے پرانے پیڑ کٹوا کر اُنہیں شہتیروں میں تقسیم کروادیتا تھا اور پھر مزدوران شہتیروں کو فیروز پورنالے تک لے جاتے تھے اور یہاں سے یہ پانی کے سینے پر بیٹھ کر آگے نکل جاتے تھے۔فیروز پورنالے تک ان شہتیروں کو پہنچانے کے لئے اُسے ہمیشہ مزدوروں کی ضرورت پڑتی تھی۔شیر خان کو پیسے کی ضرورت تھی اسلئے وہ بھی مزدوروں میں شامل ہوگیا۔ایک شہتیر کو نالے تک پہنچانے کے پانچ روپے مل جاتے تھے۔شیر خان ہٹا کٹا نوجوان تھا۔وہ بھی کام پر لگ گیا۔تین دن تک وہ مسلسل غنی میر کی شہتیریں ڈھوتا رہا۔ایک مزدور اگر پورے دن دس سے پندرہ شہتیریں ڈھوتا تھا،شیر خان ایک دن میں بیس سے پچیس شہتیریں ڈھوتا تھا۔

اُس کے کاندھے چھل گئے۔ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے مگر وہ نہ رکا نہ تھکا۔اُس کے اندر جو پیار کی گرمی تھی،محبت کا نشہ تھا اور اُلفت کا جو سرور بھرا ہوا تھا اُس نے اُس میں ایسی طاقت اور توانائی بھر دی جیسے وہ انسان نہ ہو ایک مشین ہو۔تین دن کے بعد جب اُس نے غنی میر سے رخصت لی تو اُس کی جیب میں بہت سارے پیسے آگئے تھے۔پیسوں کے احساس نے اُس کے لئے مرہم کا کام کردیا۔وہ شہر کی طرف نکل پڑا۔

(۵۰)

ادھر دلنواز خان شیر خان، کے خلاف اپنے ناپاک منصوبے تیار کرنے میں لگا تھا اور اُدھر شیر خان ان ساری باتوں سے بے خبر اپنی دردانہ کے لئے سونے کی اُنگوٹھی اور لال چنریا خریدنے کے لئے شہر میں بھٹک رہا تھا۔ جب یہ خبر دلنواز خان کو ملی کہ شیر خان شہر چلا گیا تو اُس کا شہر جانا اُس کے لئے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا ثابت ہوا۔ وہ تو اسی موقع کی تاک میں تھا۔ تقدیر اُس کا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ اس خبر سے بلیوں اُچھل پڑا۔ اُس نے جمعہ خان کو اپنے گھر پر فوراً طلب کیا۔ جمعہ خان تو حکم کا غلام تھا۔ دلنواز خان کا حکم پاتے ہی وہ دوڑا دوڑا چلا آیا۔ دلنواز خان نے اُسے اپنے ناپاک منصوبے سے آگاہ کیا۔ جمعہ خان جو کہ دلنواز خان کو احمق سمجھتا تھا پہلی بار اُس کی شاطر دماغی کا قائل ہوگیا۔ وہ دلنواز خان کی شان میں ایران توراں کرنے لگ گیا۔

وہ رات ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ جوں ہی رات نے وادی پر اپنا سایہ پھیلایا، دلنواز خان نے اندر والے کمرے سے کچھ زیور نکال کر جمعہ خان کو تھما دئے۔ جمعہ خان تو پہلے مارے خوشی کے اُچھل پڑا۔ اُسے لگا کہ اُس کے منہ سے اپنی تعریف سن کر دلنواز خان نے انعام واکرام سے نوازا ہے مگر جب دلنواز خان نے اُسے گہنے دے کر سمجھایا۔

''یہ کچھ سونے کے زیور ہیں۔ یہ تمہیں ابھی جا کر شیر خان کے گھر کے پچھواڑے میں چھپانے ہیں۔''

جمعہ خان کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ وہ پچھلی مار کو ابھی تک بھول نہیں پایا تھا جب شیر خان نے اُس کے انجر پنجر ڈھیلے کر کے رکھ دیئے تھے۔ وہ شاطر ضرور تھا مگر بہادر نہیں بلکہ کافی ڈرپوک قسم کا آدمی تھا۔ جس طرح بچھڑا کھونٹے کے بل پر کودتا ہے اسی طرح وہ بھی دلنواز خان کے بوتے پر اُچھلتا تھا۔ وہ تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ یہ کام وہ خود کرنے جا رہا ہے اس لئے وہ اُس کی تعریف میں آسمان زمین کے قلابے ملانے لگا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اسے ہی قربانی کا بکرا بنانے والا ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اُس نے دو آدمیوں کو اپنے ساتھ لیا اور وہ مری ہوئی چال کے ساتھ شیر خان

کے کوٹھے کی طرف بڑھنے لگے۔

کوٹھے کے پاس پہنچ کر پہلے اُنہوں نے یہ اطمینان کرلیا کہ گھر کے سبھی لوگ سوئے ہیں تبھی جمعہ خان اپنے آدمیوں کو ساتھ لے کے آگے بڑھا اور پھر اُنہوں نے پچھواڑے میں زمین کھود کر اُس میں یہ زیور چھپا لئے اور پھر اس گڈھے کو مٹی سے بند کرلیا۔ یہ کام کر کے وہ وہاں سے جلدی سے کھسک گئے۔

(۵۱)

شیر خان ڈرتے ڈرتے ایک جوہری کی دکان میں گھسا۔ اُس نے دکان کے مالک سے ایک سستی سی اُنگوٹھی دکھانے کو کہا۔ اُس کے سامنے کئی اُنگوٹھیاں رکھی گئیں

اُس کے ہاتھ بار بار اُس کی جیب کی طرف چلے جاتے تھے۔ وہ جوہری سے قیمت پوچھنے کی ہمت بھی جٹا نہیں پا رہا تھا کہ کہیں وہ اتنی قیمت بتا دے کہ اُس کے پاوں تلے سے زمین سرک جائے۔ بڑی ہمت کر کے اُس نے آخر پوچھ ہی ڈالا۔

''اس انگوٹھی کی قیمت کیا ہے؟''

''پانچ سو روپے''

شیر خان کا چہرہ لٹک گیا۔ جوہری بھی تاڑنے والی نظر رکھتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ اُنگوٹھی خریدنے کی بساط اُس کی نہیں ہے سو اُس نے خود ہی پوچھ لیا۔

''تمہیں کتنے تک کی اُنگوٹھی چاہیئے؟''

''دو ڈھائی سو روپے میں اگر کوئی انگوٹھی مل جائے تو بڑا احسان ہوگا آپ کا''

جوہری نے اُسے ایک اُنگوٹھی نکال کر دکھائی۔ اُنگوٹھی تھی تو بہت خوبصورت مگر تھی بہت ہلکی۔ شیر خان کے لئے یہ اُنگوٹھی نعمت غیر مترقبہ سے کچھ کم نہ تھی۔ اُس نے جیب سے پیسے نکالے اور جوہری کو پیسے دے کر اُنگوٹھی لے لی۔ اُنگوٹھی پا کر وہ ایسا مسرور ہوا جیسے اُسے خزانہ مل گیا ہو۔ وہ اُنگوٹھی جیب میں ڈال کر دکان سے نکل کر لال ڈوپٹا تلاش کرنے لگا۔ پاس ہی ایک ساڑھی کی دکان تھی۔ اُسے لال ڈوپٹہ بھی مِل گیا۔ نگے دام میں مل گیا۔ یہ دونوں چیزیں لے کر وہ گھر کی طرف

ایسے چل پڑا جیسے وہ ہوا کے دوش پر سوار ہو۔

(۵۲)

دلنواز خان پولیس تھانے میں بیٹھا چوری کی رپورٹ لکھوا رہا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ اُس کی دوسری بیگم کے کچھ زیور چوری ہو گئے ہیں۔ وہ صاف صاف شیر خان پر شک ظاہر کر رہا تھا۔ اُس کے ساتھ جمعہ خان بھی تھا جو اُس کی ہر بات پر ہاں سے ہاں ملاتا تھا۔ دلنواز خان نے تھانیدار کو وہ پچھلا قصہ بھی سنا ڈالا جب اُس نے شیر خان کو اکیلے اُسوقت دبوچ لیا تھا جب وہ اُس کے گھر پر چوری کرنے آیا تھا۔

تھانیدار نے بڑے انہماک سے دلنواز خان کی ہر بات سنی۔ اُس نے رپورٹ درج کر کے دلنواز خان کو اطمینان دلایا کہ وہ شیر خان کو تھانے پر طلب کرلیں گے اور اُس سے بڑی سختی سے پوچھ تاچھ کرلیں گے۔

''پوچھ تاچھ تو بعد میں ہوگی صاحب۔ پہلے اُس کی خانہ تلاشی لیجئے۔ مال تو ابھی اُس نے گھر میں ہی چھپا لیا ہوگا۔''

دلنواز خان نے تعریفی نگاہوں سے جمعہ خان کی طرف دیکھ کے کہا۔

''کیا بات کہی جمعہ خان۔ اگر مال اُس کے گھر سے برآمد ہوا تو ہمارا کیس اور بھی مضبوط بنے گا۔ وہ جائے گا تین چار سال کے لئے اندر اور ہم.........''

جمعہ خان نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔

''دلنواز خان چودھری کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مجرم کو اُس کے کئے کی سزا ملنی ہی چاہیئے۔ آپ فوراً ایک دو سپاہیوں کو خانہ تلاشی کے لئے ابھی روانہ کیجئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ چڑیا کھیت چگ جائے اور ہم یہاں پر بیٹھ کر سر پیٹتے رہیں''

''جمعہ خان گرمی مت کھاؤ۔ گرم کھانے سے منہ جل جاتا ہے۔ ہمیں کیا کرنا ہے یہ ہم تم سے بہتر جانتے ہیں۔ محض کسی پر اُنگلی اُٹھانے سے وہ شخص مجرم نہیں ہوسکتا ہے۔ ہمیں اپنی طرف سے پوری چھان بین کرنے دو۔ اگر ہمیں لگے گا کہ اس واردات میں شیر خان کا

ہاتھ ہے تو ہم اُسے بخشیں گے نہیں۔ اُس سے ضرور سزا ملے گی۔ میں ابھی دو سپاہیوں کو روانہ کرتا ہوں یہ پتا لگانے کے لئے کہ شیر خان کہاں ہے۔ اگر اُس نے یہ واردات کی ہے تو وہ قانون کی زد سے بچ نہیں پائے گا۔ عشرت علی، نواب دین، اُس نے دو سپاہیوں کو آواز دی۔ دونوں بھاگتے ہوئے آگئے۔ تھانیدار اُن سے مخاطب ہو کے بولا۔

''دلنواز خان کے یہاں چوری ہوئی ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ حرکت شیر خان نے کی ہے۔ تم لوگ یہ پتہ لگاؤ کہ پچھلے تین چار دن سے شیر خان کہاں کہاں گیا۔''

''جیسا حکم جناب''

وہ دونوں ایک ساتھ سیلوٹ مار کر نکل گئے۔ دلنواز خان کا منہ اُتر گیا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر تھانیدار سے ہاتھ ملا کر جمعہ خان کے ساتھ نکل گیا۔

(۵۳)

دردانہ شیر خان کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ جب سے شہر چلا گیا تھا دردانہ کا من کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ ہر پل اُسی کے خیالوں میں کھوئی رہتی تھی۔ وہ اُس کے انتظار میں پل پل گن رہی تھی۔ اُس کے بنا گھر سونا سونا اور ویران سا لگ رہا تھا۔ وہ ایک دن کے لئے شہر گیا تھا۔ اب تو اُسے گئے ہوئے تین دن ہو گئے تھے اور اب تک وہ نہیں لوٹا تھا۔ دردانہ سے جدائی کے یہ شب و روز کاٹے نہیں کٹتے تھے۔ کبھی کبھی تو اُس کا من رونے کے لئے بے قرار ہو اُٹھتا تھا۔

آج چوتھا دن تھا اور اُس کا دل کہہ رہا تھا کہ آج وہ ضرور گھر لوٹ کے آئے گا۔ اس لئے پو پھٹتے ہی وہ بستر سے باہر آگئی اور نہا دھو کر جلدی سے تیار ہو گئی۔ زیتون جب نیند سے جاگی تو اُسے بنے سنورے پا کر دنگ رہ گئی۔ وہ کچھ نہ بولی بس مسکرا کے مرغیوں کو دانہ ڈالنے نکل گئی۔

شاہ باز خان بھی فجر کی نماز سے فارغ ہو کر باہر آگیا۔ سب لوگ برآمدے میں بیٹھ گئے۔ اتنے میں دردانہ اُن کے لئے چائے ناشتہ لے کر آگئی۔ دردانہ کو دیکھ کے شاہ باز خان کا چار چلو خون بڑھ جاتا تھا۔ اُس کے آنے سے شاہ باز خان کو لگنے لگا تھا کہ اُس نے بہو کی ہی نہیں بیٹی کی کمی بھی پوری کی تھی۔ کتنا خیال رکھتی تھی وہ اپنے ساس سسر کا۔ اُن کی اپنی سگی بیٹی بھی ہوتی تو

شاید اُن کا اتنا خیال نہیں رکھتی۔ دردانہ جب چائے دے کر اندر چلی گئی تو شاہ باز خان نے سرگوشیانہ انداز میں زیتون سے کہا۔

"آج چوتھا دن ہے۔ یہ کمبخت کہاں ڈیرہ ڈال کے بیٹھ گیا۔ دو دن کے لئے شہر جانے کی بات کہہ کے گیا تھا۔ کہیں شہر جا کر کوئی گڑ بڑ تو نہیں کر لی؟"

"ایسے برے خیال من میں کیوں لا رہے ہو۔ کام کے سلسلے میں گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کہیں کام پر لگ گیا ہو۔"

شاہ باز خان کچھ نہیں بولا۔ بس خالی خولی نظروں سے خلا میں گھورنے لگا۔ دفعتاً زیتون مارے خوشی کے ایسے اُچھل پڑی جیسے اُس کے ہاتھ خزانہ لگا ہو۔ شیر خان سامنے کی پگڈنڈی پر خراماں خراماں چلا آ رہا تھا۔ وہ بے تحاشہ کچن کی طرف بھاگی اور خوشی سے چلاتے ہوئے بولی۔

"دردانہ تمہارا شیر و آ گیا ہے"

دردانہ کا دل مارے خوشی کے بلیوں اُچھل پڑا۔ وہ بے ساختہ باہر کی طرف بھاگی۔ شیر خان شاہ باز خان کے پاس کھڑا تھا۔ شاہ باز خان نے شکایت بھرے لہجے میں اُس سے پوچھا۔

"دو دن بول کے گئے تھے۔ چار دن کہاں رہے؟"

شیر خان نے دردانہ کی طرف شوخ نظروں سے دیکھا اور پھر مسکرا کے بولا۔

"میں کہیں سیر سپاٹے نہیں کر رہا تھا بلکہ غنی میر ٹھیکدار کے یہاں مزدوری کر رہا تھا۔ لوگوں کی فرمائشیں جو پوری کرنی تھیں۔"

دردانہ نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔

(۵۴)

دلنواز خان تک یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ شیر خان شہر سے لوٹا ہے۔ وہ جمعہ خان کو لے کر تھانے پہنچ گیا اور تھانیدار کو یہ مژدہ سنایا کہ شیر خان شہر سے لوٹا ہے۔

جمعہ خان تو بار بار اپنا ماتھا پیٹ رہا تھا۔ تھانیدار نے جب اُس سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے تو جمعہ خان نے جواب دیا۔

''جناب میں چودھری کی بربادی کا ماتم منا رہا ہوں۔ اگر کل آپ نے میری بات مانی ہوتی تو شیر خان کو ہمارا مال ٹھکانے لگانے کا موقع نہ مل جاتا۔ وہ شہر چلا گیا۔ اس چودھری کا مال بیچ کر مست ہو گیا اور ہم بس سر پیٹتے رہ گئے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہمارا چوری کا مال کہاں سے برآمد ہوگا؟''

''جمعہ خان بات گہنوں کی ہے۔ کسی سیال شے کی نہیں جو بھاپ بن کر اُڑ جائے اور ہمارے ہاتھ کچھ نہ لگے۔ تم نے سنا ہوگا کہ مار کے آگے بھوت بھی ناچتے ہیں۔ جب اُسے پولیس کے ڈنڈے پڑیں گے تو وہ سب کچھ اُگل دے گا۔ اگر اُس نے وہ زیور شہر جا کر کسی جوہری کو بیچے ہوں گے تو وہ بھی قانون کے لپیٹ میں آجائے گا۔''

''تھانیدار صاحب لوہا گرم ہے۔ بس چوٹ مارنے کی ضرورت ہے۔ ابھی آپ میری ایک صلاح مان لیں۔ آپ پولیس لے کر شیر خان کے کوٹھے پر چلو۔ ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔''

''چودھری اگر تم چاہتے ہو کہ ہم شیر خان کے کوٹھے پر دھاوا بول دیں تو چلو پھر۔''

تھانیدار اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جمعہ خان، دلنواز خان اور دو سپاہیوں کو لے کر شیر خان کے کوٹھے کی طرف چل پڑا۔ جمعہ خان دغدغہ میں تھا جب کہ دلنواز خان کو پورا یقین تھا کہ اُس کا پلان پوری طرح کامیاب ہوگا۔

(۵۵)

زیتون بیٹے سے لپٹ کر اُس کی بار بار بلائیاں لے رہی تھیں جب کہ دردانہ چھوئی موئی بنی کھڑی تھی۔ شاہ باز خان اپنے حقے کو گڑگڑا رہا تھا اور کن اکھیوں سے ماں بیٹے کے اس پیار اور دلار کے کھیل کو دیکھ رہا تھا۔ شیر خان جب ماں سے الگ ہوا تو زیتون نے اپنا سوال پھر سے دہرایا۔

''یہ بتا بیٹے تم شہر میں چار دن کہاں رہے اور کیا کرتے رہے؟''

''اصل میں، میں ایک ہی دن شہر میں رہا۔ باقی تین دن میں غنی میر ٹھیکیدار کے یہاں

شہتیریں ڈھوتا رہا؟"

"کیوں؟"

"کسی کی فرمائش پوری جو کرنی تھی" کہہ کر اُس نے دردانہ کی طرف شوخ نظروں سے دیکھا اور پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر سونے کی انگوٹھی اور لال چنریا نکال کر دردانہ کی طرف بڑھائی۔ سونے کی انگوٹھی اور لال چنریا جوں ہی دردانہ نے ہاتھوں میں لی اُس سے لگا جیسے اُس کا شوہر اُس کے لئے دنیا کا سب سے انمول تحفہ لے کر آیا ہو۔ وہ ان چیزوں کو اپنے سینے کے ساتھ لگانا چاہتی تھی مگر زیتون اور شاہ باز خان کی موجودگی کے سبب وہ ایسا نہیں کر پائی۔ وہ بار بار سونے کی انگوٹھی کو دیکھ کر پھولے نہیں سما رہی تھی۔ عین اسی وقت دلنواز خان اور جمعہ خان پولیس لے کر پہنچ گیا۔ جونہی شاہ باز خان کی نظر پولیس پر پڑی تو اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔ زیتون کے بھی ہوش وحواس اُڑ گئے۔ شیر خان اطمینان سے کھڑا تھا۔ دلنواز خان شیر خان کو دیکھ کر چلایا۔

"یہ ہے مجرم تھانیدار صاحب۔ گرفتار کر لو اسے۔"

دردانہ کی سمجھ میں ابھی تک کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ بے چین ہو کر کبھی شیر خان کو تو کبھی دلنواز خان کو دیکھتی رہی۔ سونے کی انگوٹھی ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھی۔ اچانک جمعہ خان کی نظر سونے کی انگوٹھی پر پڑی تو وہ سر پیٹتے ہوئے بولا۔

"ہائے ہائے دیکھو تو چودھری کے مال کو کیسے لٹایا جا رہا ہے۔" اُس نے بڑھ کر دردانہ کے ہاتھ سے وہ سونے کی انگوٹھی چھین لی اور اس سے تھانیدار کی طرف بڑھا کر بولا۔

"یہ دیکھ لو تھانیدار صاحب۔ یہ سونے کی انگوٹھی۔"

شیر خان جواب تک اس گورکھ دھندے کو سمجھ نہیں پایا تھا اب کے کسی قدر غصے سے بولا۔

"صاحب یہ سب کیا ہے؟"

اس سے پہلے کہ تھانیدار کچھ بول پاتا، دلنواز خان چلایا۔ "کتنا بھولا بنتا ہے کمبخت۔ ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔ میں کہتا ہوں، میری بیگم کے زیور کہاں بیچ کر آگئے ہو؟"

"کیا بک رہے ہو تم؟ تمہاری بیگم کے زیور سے میرا کیا لینا دینا"

''اس سے کیا پوچھتے ہو۔ مجھ سے پوچھنا۔ دلنواز خان نے تمہارے خلاف چوری کی رپٹ تھانے میں درج کرائی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تم نے اس کی بیگم کے زیور چرائے ہیں۔ ہم اسی سلسلے میں تمہارے گھر کی تلاشی لینے آئے ہیں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرا شوہر کوئی چور نہیں ہے جو آپ اس پر ایسا بیہودہ الزام لگا رہے ہیں''

''تمہارا شوہر کیا ہے یہ مجھ سے نہیں تھانیدار صاحب سے پوچھ لو۔ ابھی وہ اس کا سارا کچا چٹھا کھول کے رکھ دیں گے۔ تم جسے پارسا سمجھتی ہو وہ کوئی پارسا نہیں بلکہ دس نمبری بدمعاش ہے۔ تھانے میں اس کا بڑا سا فوٹو لگا ہے۔ اب تک ایک نہیں تین بار سزا کاٹ کے آیا ہے۔ میں کیا ساری بستی اس کے کرتوت جانتی ہے۔''

دردانہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ شاہ باز خان اور زیتون کے منہ فق تھے۔ دردانہ کو لگ رہا تھا کہ وہ ابھی تیورا کے گرے گی۔ وہ عجب کشمکش کی حالت میں کھڑی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس کی بات کا یقین کرے۔ اس سے پہلے کہ وہ شیر خان سے کچھ پوچھ پاتی تھانیدار اُس سے مخاطب ہو کے بولا۔

''بی بی مقدم نے جو کچھ بھی کہا وہ حرف بہ حرف سچ ہے۔ شیر خان دس نمبری بدمعاش ہے۔ پچھلے دنوں ہی وہ جیل سے چھوٹا ہے۔''

اب کے دردانہ کا سر گھومنے لگا اور جی متلانے لگا۔ اُسے لگا کہ وہ ابھی تیورا کے نیچے گرے گی۔ اُس نے پیچھے ہٹ کے دیوار کا سہارا لینا چاہا مگر اُس سے پہلے ہی وہ بے ہوش ہو کے نیچے گری۔ زیتون اور شاہ باز خان نے اُسے اُٹھا کر چٹائی پر ڈال دیا۔ زیتون کر دلنواز خان کی طرف بڑھی اور اُس پر برس پڑی۔

''آگ لگے تیری زبان کو۔ مار ڈالا میری بہو کو۔ بڑی مشکل سے یہ بچہ سدھر گیا تھا۔ اس کا گھر سنسار بس گیا تھا۔ ستیاناس ہو تیرا۔ تم نے آگ لگا دی میرے گھر میں۔ میرے بچے پر جھوٹا الزام لگا کر اس کی زندگی برباد کر ڈالی۔ لوگ کے لگ تمہیں کیڑے پڑ جائیں تیرے بدن

میں ۔میرے بچے کا گھر اُجاڑ کے پڑ گئی تیرے کلیجے میں ٹھنڈک ۔یہ مردود برابدکار نہ ہوتا تو آج تیری ہمت نہیں ہوتی اس در پر پاؤں رکھنے کی۔"

زیتون کے جارحانہ تیور دیکھ کر دلنواز خان تھانیدار مظفر علی کی آڑ میں چھپ گیا۔ جب زیتون نے دل کی بھڑاس نکالی تو وہ اپنی مردانگی دکھانے کی خاطر زیتون کی طرف ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔

"اے بڑھیا میرے منہ لگنے کی کوشش مت کر۔ میں جتنا سیدھا ہوں اُتنا ہی کمینہ ہوں۔"

"تو آگے تو بڑھ سب کے سامنے تیرا منہ نہ نوچ لیا تو زیتون نام نہیں میرا۔ میں شیرنی سے اکیلی لڑی ہوں تو کیا چیز ہے"

"اے مائی" مظفر علی غرایا۔"پولیس کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہ کر۔ ہمارے راستے سے ہٹ جا اور ہمیں گھر کی تلاشی لینے دے۔" وہ سپاہیوں کی طرف مڑا اور اُنہیں تلاشی لینے کے لئے کہا"پورے کوٹھے کی تلاشی لو۔"

شیر خان جواب تک بت بنا کھڑا تھا، اب کے تھانیدار سے بولا۔"صاحب یہ دلنواز خان جھوٹ بول رہا ہے۔ اصل میں اس کی نظر میری عورت پر ہے اس لئے یہ مجھے چوری کے جھوٹے مقدمے پھنسا کر مجھے میری بیوی سے الگ کرنا چاہتا ہے۔ میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میں نے اس کے زیور نہیں چرائے ہیں۔ میں تو غنی میر ٹھیکدار کے یہاں تین دن مزدوری کر رہا تھا۔ آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو آپ غنی میر سے جا کر پوچھیئے۔ جب میں یہاں تھا ہی نہیں تو میں نے اس کے زیور کہاں سے چرائے۔ میں تو شہتیریں ڈھو رہا تھا۔"

"شہتیریں نہیں ڈھو رہے تھے بلکہ میرے مال کو ٹھکانے لگا رہے تھے۔ تھانیدار صاحب آپ کوٹھے کی تلاشی لیجئے۔ ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

"ہاں ہاں تلاشی لیجئے" شیر خان نے بڑے اطمینان سے کہا۔

پولیس والوں نے کوٹھے کی تلاشی لی۔ کوئی زیور نہیں ملا۔ جمعہ خان جانتا تھا کہ اُس نے زیور کہاں چھپا کے رکھے ہیں۔ اُس نے ایک حوالدار سے کہا۔

''بھائی اکبر خان چور، چوری کا مال کبھی گھر کے اندر نہیں رکھے گا۔ میں کہتا ہوں کہ کوٹھے کے اگاڑے پچھواڑے کی بھی تلاشی لو۔ کیا پتہ کہ زیور کہیں آگے پیچھے دبا کے رکھے ہوں۔ بھائی شیر خان کوئی معمولی چور نہیں بلکہ یہ ایک شاطر کھلاڑی ہے۔'' وہ اُس سے سمجھاتے سمجھاتے اُسی جگہ لے گیا جہاں پر اُس نے زیور دبا کے رکھے تھے۔ اُس نے اکبر دین کو ایک جگہ دکھا کر کہا۔ ''یہاں کھود کے تو ذرا دیکھو''

جونہی حوالدار اکبر دین نے مٹی ہٹائی تو اندر سے ایک پوٹلی مل گئی جس میں دلنواز خان نے زیور رکھے تھے۔ جمعہ خان خوشی سے چلایا۔

''صاحب زیور مل گئے۔ زیور مل گئے''

شیر خان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ زیتون اپنی چھاتی پیٹنے لگی جب کہ شاہ باز خان ایک زندہ لاش کی طرح کھڑا تھا۔ دلنواز خان شیر ہو کے بولا۔

''اب آیا میری بات کا یقین۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے کبھی نہیں جاتا۔''

زیور مل گئے تھے۔ شیر خان کو حراست میں لیا گیا۔ شیر خان سمجھ گیا کہ دلنواز خان نے اُس کے خلاف گہری سازش رچی ہے لیکن وہ بے بس تھا لاچار تھا۔ دلنواز خان نے جس عیاری کے ساتھ اس کے گرد جال بنا تھا اُس سے نکلنا اُس کے لئے آسان نہ تھا۔ پولیس اُسے پکڑ کر لے گئی۔ زیتون چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگی جب کہ دردانہ ابھی تک بے ہوش پڑی تھی۔

(۵۶)

آدھی رات کا وقت تھا۔ شاہ باز خان اور زیتون بھوکے پیاسے زندہ لاشوں کی طرح بیٹھے تھے۔ دل و دماغ جیسے ماؤف ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ دردانہ کے پاس یوں بیٹھے تھے جیسے وہ ایک لاش کے پاس بیٹھے ماتم کناں ہوں۔ گھر میں موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ رات بھر یہی عالم رہا۔ دونوں میاں بیوی چپ کی مورت بنے بیٹھے تھے۔ اُن کے پاس بولنے کو کچھ رہ ہی نہیں گیا تھا۔ دلنواز خان نے ایک پل میں اُن کے ہنستے، مسکراتے گلستان کو ویرانہ بنا کے رکھ دیا تھا۔ پو

پھٹتے ہی جب دردانہ کو ہوش آ گیا تو زیتون اور شاہ باز خان اُسے سہارا دینے کے لئے جوں ہی آگے بڑھے تو وہ اُن سے یوں دور بھاگنے لگی جیسے وہ انسان نہ ہوں چمگادڑ ہوں۔ دونوں سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔ وہ اس قدر غم سے نڈھال تھی کہ اُس کی آنکھوں سے اشکوں کے سوتے اُبل رہے تھے۔ ایک پل میں یہ کیسا طوفان آ گیا تھا، جس نے سب کچھ تہس نہس کر ڈالا تھا۔ ایک پل میں اُس کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ اُس کا بھروسہ، اُس کا یقین، اُس کے ارمان، اُس کے خواب۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھی اور کوٹھے کے اندر گئی۔ ٹوٹے دل اور بکھری اُمیدوں کے ساتھ اُس نے اپنے کپڑے سمیٹے اور انہیں ایک پوٹلی میں باندھا اور پھر باہر نکل گئی۔ اس نے قہر آلودہ نظروں سے شاہ باز خان اور زیتون کی طرف دیکھا۔ دونوں اُس کی ان قہر آلودہ نگاہوں کا سامنا نہ کر سکے۔ وہ اپنے کاندھے پر اپنے کپڑوں کی پوٹلی رکھ کر ایسے نکل گئی جیسے اپنے کاندھوں پر اپنی محبت کا جنازہ لے کے جا رہی ہو۔ زیتون اور شاہ باز خان میں اتنا حوصلہ نہیں بچا تھا کہ وہ اُس سے پوچھ پاتے کہ وہ اس وقت کہاں جا رہی ہے۔ وہ بوجھل قدموں کے ساتھ صحن پار کر کے نکل گئی۔ اُس کے جانے کے بعد زیتون دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ وہ روتے روتے شاہ باز خان سے بولی۔

''یہ میرے گھر کو کس کی نظر لگ گئی۔ میرا گھر تنکوں کی طرح کیوں بکھر گیا۔؟''

شاہ باز خان کے پاس زیتون کے کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ اُداس اور ویران آنکھوں سے خلا کو گھورنے لگا۔

(۵۷)

خدا بخش اس بات سے مطمئن اور شاد تھا کہ دردانہ اپنے گھر میں بہت خوش ہے۔ حالانکہ وہ اُس کی بھتیجی تھی لیکن وہ اُسے اپنی اولاد کی طرح پیار کرتا تھا۔ وہ اُس کے مرحوم بھائی کی آخری نشانی تھی اس لئے بھی وہ اُسے کچھ زیادہ عزیز تھی۔ وہ اُس سے کبھی لاتعلق نہیں رہا۔ وہ جب مظفر آباد میں تھی تب بھی اور جب کہ وہ شاہ باز خان کے گھر میں تب بھی۔

اچانک اُس کا خواب کرچی کرچی ہو کر رہ گیا۔ جب ایک شام دردانہ بڑی خستہ

حالت میں اُس کے گھر پہنچی تو خدا بخش کو لگا گویا اُس کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ جب دردانہ نے اُسے رورو کر جب سارا ماجرا سنایا تو خدا بخش پہلے تو اپنا سر پیٹنے لگا۔ پھر ایک دم اُس کا منہ غصے سے لال ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے اُس کی رگوں میں کوئی آگ دوڑنے لگی ہو۔ وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔

''میں اُن کمینوں کو اس دھوکہ دھڑی کا مزا چکھائے بنا چھوڑوں گا نہیں۔ میں اُن کی اینٹ سے اینٹ بجا کے رکھ دوں گا۔ وہ میرے ساتھ ایسا فریب کریں گے، یہ بات میرے وہم و گمان میں نہیں تھی۔ اُن بدکاروں نے میری بچی کی زندگی غارت کر کے چھوڑی۔ میں اُنہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ تو رومت، میری بچی تو رومت۔ ابھی تیرا چاچا جان زندہ ہے۔ میں اُنہیں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ وہ ساری زندگی اپنی اس بھول پر پچھتاتے پھریں گے۔''

دردانہ اپنی بربادی پر بس خون کے آنسو بہاتی رہی۔ اُس کے ساتھ قسمت نے کیسا مذاق کیا تھا۔ چولہے سے نکلی تو کڑھائی میں جا کے گری۔ ایک بدکار سے پیچھا چھڑا کر دوسرے بدکار کے پلے بندھ گئی۔ وہ قدرت کی اس ستم ظریفی پر سوائے ماتم کے اور کیا کر سکتی تھی۔

(۵۸)

دلنواز خان اپنی کامیابی پر پھولے نہیں سمارہا تھا۔ اُس نے اپنے جھوٹ سے سچ کو مات دی تھی۔ جمعہ خان دلنواز خان سے بھی زیادہ مسرور اور شادماں نظر آرہا تھا۔ شیر خان کو اُنہوں نے جھوٹے گواہوں کے دم پر چھ مہینے کے لئے اندر کروایا تھا۔ راستے کا کانٹا نکل چکا تھا۔ اب وہ دردانہ کو اپنے بس میں کرنا چاہتا تھا۔ یہ کام آسان نہ تھا کیونکہ دردانہ اندر سے ٹوٹ چکی تھی۔ دنیا پر سے اُس کا اعتبار اُٹھ چکا تھا۔ اُس کے بھروسے کا خون ہوا تھا۔ دلنواز خان کے بارے میں تو وہ سب کچھ جان چکی تھی۔ وہ اُس کی نظر میں ایک عیاش اور عورت خور آدمی تھا جو بس طاقت کے دم پر کسی بھی عورت کو حاصل کرنا جانتا تھا۔ وہ دلنواز خان کی اصلیت جانتے ہوئے اُسے کبھی گھاس بھی نہیں ڈالتی مگر دلنواز خان بھی بڑا ضدی آدمی تھا۔ وہ جس پر نظر رکھتا تھا یا تو وہ اُس کی ہو جاتی تھی یا کسی کی نہیں۔

دلنواز خان دردانہ سے ملنے کے لئے کچھ زیادہ ہی اُتاولا ہوا جا رہا تھا۔ یہ جمعہ خان تھا جو اُسے روکے بیٹھا تھا۔ وہ اُس کو بار بار سمجھاتا۔

"چودھری، گرمی مت کھاو، گرم کھانے سے منہ جل جاتا ہے۔ زخم تازہ تازہ ہے اس لئے زخموں کو بھرنے کے لئے دردانہ کو کچھ وقت تو دو۔ ابھی تم اُس سے ملنے جاؤ گے تو وہ تمہیں جوتے مار کر گھر سے باہر نکال دے گی اس لئے میری مانو تھوڑا سا صبر کرو۔ کہتے ہیں صبر کا پھل بہت میٹھا ہوتا ہے۔"

دو چار دن تو دلنواز خان نے جمعہ خان کی بات مان لی مگر پانچویں روز وہ اپنی تڑپ کو دبا نہ سکا۔ اُس نے نئے کپڑے پہنے، سر میں خوشبودار فلیل ڈالا، کپڑوں پر عطر کا چھڑکاؤ کیا، پاؤں میں زری کی جوتی ڈالی اور سر پر قوالوں کی طرح قراقلی ڈال کر اُس نے جمعہ خان کو ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ جمعہ خان تو حکم کا غلام تھا۔ حجت کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ پانچویں روز وہ دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کے پرنگ کی جانب چل پڑے۔

دلنواز خان دردانہ سے ملنے کے احساس سے مارے خوشی کے غبارے کی طرح ہوا میں اُڑے جا رہا تھا۔

(۵۹)

دردانہ ابھی تک غم کے اس بھنور سے نکل نہیں پائی تھی جس میں وہ پھنس گئی تھی۔ ایک طرف اُس کی زخمی محبت تھی تو دوسری طرف فریب کا گھاؤ۔ اُس کا چین وسکون لٹ چکا تھا۔ ہنستی مسکراتی دردانہ درد وغم کی مورت بن چکی تھی جس کی آنکھوں کے اتھاہ ساگر میں رنج والم کا ایک طوفان چھپا ہوا تھا۔ وہ دن تو جیسے تیسے گزارتی تھی پر جوں ہی رات آتی تھی تو وہ درد کے انگاروں پر لوٹنے لگتی تھی۔ قسمت نے اُس کو ایک ایسے موڑ پر لا کے کھڑا کیا تھا جہاں اُسے نہ کوئی منزل نظر آ رہی تھی اور نہ کوئی راستہ۔ سبھی راستے جیسے ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو چکے تھے۔ وہ کہاں جائے، کیا کرے اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ چاچا خدا بخش اُسے تسلی دیتا اُس کی دلجوئی کرتا لیکن وہ اس صدمے سے نکل نہیں پا رہی تھی۔

دوپہر کا وقت تھا۔ خدا بخش برآمدے میں بیٹھا تھا اور دردانہ اس کے بغل میں لیٹی ہوئی تھی تبھی خدا بخش کی نظر سامنے سے آرہے دو گھوڑ سواروں پر پڑی جو کہ اُسی کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ دلنواز خان اور جمعہ خان تھے۔ وہ گھوڑوں سے اتر گئے اور اُنہوں نے اپنے گھوڑے صحن کے باہر باندھ لئے اور پھر دندناتے ہوئے اندر آگئے۔ خدا بخش نے دردانہ کو جگایا۔ اُس نے جب دلنواز خان اور جمعہ خان کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ فوراً اٹھ کر اندر چلی گئی۔ دونوں نے خدا بخش سے سلام و دعا کیا اور پھر جمعہ خان نے دلنواز خان کا تعارف پیش کیا۔ یہ جان کر کہ دلنواز خان مقدم ہے، خدا بخش نے اُنہیں عزت کے ساتھ کمرے میں لاکر بٹھا دیا اور دردانہ کو آواز دے کر مہمانوں کے لئے چائے بنانے کے لئے کہا۔ جمعہ خان ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ دلنواز خان بے صبر ہوئے جارہا تھا۔ اُس کو ان بے کار کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ فوراً اصلی مدعے پر آگیا۔ اُس نے خدا بخش سے جھوٹی ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بھتیجی کے ساتھ بہت بڑا دھوکہ ہوا ہے خدا بخش چودھری۔ میں تو پہلی ہی نظر میں بھانپ گیا تھا کہ ضرور کوئی گڑبڑ گھوٹالا ہے۔ ایک بدکار آدمی جس کا نام لینا بھی بستی والے گناہ سمجھتے ہیں وہی بدقماش ایسی پری جیسی بیوی لے کر آئے گا۔ عیاں تھا کہ دھوکے فریب سے ہی لایا ہوگا۔"

"اُس کمینے کا نام بھی میرے سامنے مت لو۔ اُس نے میری بچی کی زندگی غارت کر کے رکھ دی۔ جیتے جی ہی مار ڈالا اسے۔" خدا بخش رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"اس کھیل کا یہی انجام ہونا تھا۔ وہ ٹھہرا پیشہ ور مجرم۔ کب تک شرافت کا چولا پہن کر بیٹھ سکتا تھا۔ میں تو کہتا ہوں چودھری جتنی جلدی ہو سکے، اُس کمینے سے اپنا پنڈ چھڑا لو۔ کیوں بھئی جمعہ خان میں سچ کہہ رہا ہوں نا؟"

"سولہ آنے سچ۔ سانپ کی دوستی، دشمنی سے زیادہ مہنگی پڑتی ہے۔ وہ ٹھہرا دس نمبری بدمعاش۔ اُس کا ایک پاؤں جیل میں رہتا ہے تو ایک جیل سے باہر۔ اُس سے رشتہ بنا کے رکھو گے تو کبھی بھی آفت میں پڑ جاؤ گے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ آٹے کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے اس لئے

جتنی جلدی ہو سکے اپنی بچی کو اُس کمینے کے شکنجے سے آزاد کرادو، اُس سے طلاق دلا دو۔ یہ ڈر کی پھانس ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل جائے گی"

"رہی دردانہ کے نکاح کی بات۔ چودھری تم اتنے اچھے ہو اتنے نیک ہو کہ کوئی بھی دردانہ کو اپنی امان میں لینے کے لئے آگے آئے گا۔"

"بجا فرمایا چودھری۔" جمعہ خان نے سر دھنتے ہوئے کہا "یہ نیک کام تم کیوں نہیں کرتے۔ آخر اللہ کا دیا سب کچھ ہے تمہارے پاس۔ تم اگر دردانہ کو اپنی امان میں لو گے تو وہ رانی بن کر راج کرے گی۔"

دردانہ جو دروازے کی اوٹ میں اُن کی باتیں سن رہی تھیں، ایک دم اپنا آپا کھو بیٹھی۔ وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح باہر آ گئی اور دلنواز خان پر غراتے ہوئے بولی۔

"دردانہ کو نہ تمہارا راج چاہیے نہ تاج۔ دردانہ زندگی بھر اکیلی رہنا پسند کرے گی مگر تم جیسے بھیڑیئے پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرے گی۔"

"دردانہ" خدا بخش سٹپٹا کر چلایا۔ "ہوش کے ناخن لو۔ تم نہیں جانتی کہ تم کس سے بات کر رہی ہو۔؟"

"ہاں جانتی ہوں میں کس سے بات کر رہی ہوں۔ ایک ایسے ہوس پرست سے جو عورت اور قمیض میں کوئی فرق نہیں سمجھتا ہے۔ جس طرح قمیض پرانی ہو جاتی ہے تو آدمی نئی قمیض بنوا کے پہن لیتا ہے اسی طرح یہ بھی عورتیں بدلتا رہتا ہے۔ میں اسے جتانا چاہتی ہوں کہ میں اس کی قمیض نہیں بننا چاہتی ہوں۔"

دردانہ کے یہ جارحانہ تیور دیکھ کر دلنواز خان اور جمعہ خان کے منہ پر تالے پڑ گئے۔ دردانہ نے دلنواز خان کو چاچا خدا بخش کے سامنے ننگا کر کے رکھ دیا تھا اور اُس کی ساری ہیکڑی نکل گئی تھی۔ جب آدمی کی اصلیت کھل جاتی ہے تو وہ شیر سے چوہا بن جاتا ہے۔ وہی حال دلنواز خان کا تھا۔ پھر بھی ہمت کر کے اُس نے خدا بخش سے کہا "خوب عزت دی تم نے ہمیں خدا بخش چودھری۔ لوگ گھر آئے ہوئے کتے کو بھی نہیں دھتکارتے۔ تم نے تو اپنی بھتیجی کے ہاتھوں

ہمیں خوب ذلیل کروایا۔"

"میں کہتا ہوں کہ ابھی بھی کچھ کسر باقی رہ گئی ہے وہ بھی نکال دو" جمعہ خان بیچ میں بول پڑا۔

خدا بخش واقعی شرمسار تھا لیکن دردانہ کو کوئی افسوس نہیں تھا۔ اُسے تو دلنواز خان کی صورت دیکھ کر ہی گھن آرہی تھی۔ اُسے اُس کا وہ خبیث اور شیطانی روپ یاد آرہا تھا جو اُس نے منہ دکھائی کے دن اور تلاشی والے دن دکھایا تھا۔ وہ اُسے اپنی نظروں سے دور کرنا چاہتی تھی اس لئے وہ بے خوف ہو کر بولی۔

"اگر اب بھی تم لوگوں میں غیرت نام کی کوئی چیز بچی ہے تو یہاں سے فی الفور نکل جاؤ۔ میں تم لوگوں کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا آپا کھو بیٹھوں نکل چلو یہاں سے۔ چلو"

"بیٹی غصہ تھوک دو۔ یہ ہمارے مہمان ہیں۔ مہمانوں سے اس طرح کا برتاؤ نہیں کرتے۔"

"تم چپ رہو چاچا"

"چلو بھائی جمعہ خان۔" دلنواز خان گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دونوں چپ چاپ نکل گئے۔ خدا بخش بت بنا کھڑا تھا جب کہ دردانہ اب تک غصے سے کھول رہی تھی۔

(۶۰)

وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے گھومتا رہا۔ شیر خان اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہا تھا۔ زیتون نے رو رو کے اپنا برا حال کر دیا تھا۔ شاہ باز خان تو اندر سے بجھ چکا تھا۔ وہ جب دیکھو چپ کی مورت بنا بیٹھا رہتا۔ نہ کسی سے بولنا نہ چالنا۔ وہ اب گھر سے باہر خال خال ہی نکلتا تھا۔ اُدھر دردانہ نے اپنی قسمت کے سفینے کو حالات کی موجوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ ایک دلنواز خان تھا جو ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔

کہتے ہیں کہ چاہت کا نشہ چرس گانجے کے نشے سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ دردانہ اُس سے جتنی نفرت کرتی تھی وہ اُسی شدت سے اُس سے پیار کرنے لگا تھا۔ اُسے پانے کی تڑپ

اُس کے دل میں ہلکورے مار رہی تھی۔ یہ انسانی فطرت کا خاصا ہے کہ جو چیز اُس کو پسند ہو وہ اگر اُس سے نہ ملے تو وہ اُسے پانے کے لئے ہر دم تڑپتا رہتا ہے۔ دلنواز خان بھی دردانہ کے لئے ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ وہ جلوت میں ہو یا خلوت میں ہر دم اُس کے دل و دماغ پر دردانہ چھائی رہتی تھی۔ وہ اُسے پانے کے لئے کوئی بھی حربہ استعمال کرنے پر بضد تھا۔

ایک دن جمعہ خان اُس کے لئے مسیحا بن کر آ گیا اور اُس کے لئے ایک ایسی خبر لے کر آ گیا جس نے اُس کی دم توڑتی اُمیدوں کو جلا بخشی اور اُس کے موہوم خوابوں میں نئی روح پھونک دی۔ دردانہ پاکستانی نژاد تھی اور وہ غیر قانونی طور پر یہاں رہ رہی تھی۔ دلنواز خان کو ایسا لگا جیسے لمبی ہار کے بعد اُس کے ہاتھ تین یکے لگے ہوں۔ اُس نے جمعہ خان کو گلے سے لگا کر اُس کا گندا سا منہ چوم لیا۔ وہ جلد سے جلد دردانہ کے پاس پہنچ کر اُس کے سر پر بم پھوڑ دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ اب اُس سے نہ صرف گن گن کر لینا چاہتا تھا بلکہ اُس کو اپنے اشاروں پر نچا سکتا تھا۔ وہ جمعہ خان کو لے کر اگلے روز پرنگ کی طرف روانہ ہوا۔

(۶۱)

جب دلنواز خان نے خدا بخش کے سامنے دردانہ کی اصلیت بیان کی تو خدا بخش کو لگا کہ دلنواز خان نے اُس کے سر پر بم کا گولہ پھوڑ دیا ہو۔ یہ بات صرف شیر خان کے گھر والوں کو معلوم تھی کہ دردانہ مظفر آباد کی رہنے والی ہے پھر دلنواز خان کو یہ بات کیسے معلوم ہو گئی۔ وہ شاید یہ بھول گیا تھا کہ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو چھپائے نہیں چھپتی۔ آخر لوگوں کو دوسروں کے گھروں میں تاک جھانک کرنے کی عادت جو ہوتی ہے۔

خدا بخش نے اس خبر کے ساتھ ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ جب دشمن شب خون مار دے تو ایک نہتا سپاہی کر ہی کیا سکتا ہے، سوائے ہتھیار ڈالنے کے۔ وہ اپنی بھتیجی کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اُس کا نکاح دلنواز خان کے ساتھ کرنے پر آمادگی ظاہر کرنے والا تھا کہ دردانہ باہر آ گئی اور دلنواز خان سے فیصلہ کن انداز میں بولی۔

''اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ سزا کے ڈر سے میں تمہاری شرطیں مان جاؤں گی تو کان کھول کر

سن لے، میں سزا کے ڈر سے تم جیسے بے ایمان اور بدکار آدمی کے ساتھ رشتہ جوڑ کر اپنے پاوں پر کلہاڑی نہیں ماروں گی۔ میں مرتے مر جاؤں گی مگر تم جیسے ہوس پرست آدمی کے ساتھ ایک پل بھی رہنا پسند نہیں کروں گی''

اس بار دلنواز خان شیر بنا کھڑا تھا۔ اُس نے تہدیدی انداز میں دردانہ سے کہا۔

''یہ مت بھول کہ تمہاری زندگی کی بھاگ ڈور اب میرے ہاتھوں میں ہے۔ میں چاہوں تو تمہاری زندگی کا ایک ایک پل موت سے بھی بدتر بنا دوں گا۔''

''تم کو جو کچھ کرنا ہے، ابھی جا کر کر لے۔ میں تمہاری ان گیدڑ دھمکیوں سے ڈرنے والی نہیں ہوں''

''مگر مجھے تو ہے۔'' خدا بخش بدحواسی کے عالم میں چلایا۔'' میں تمہیں یوں بے موت مرنے نہیں دوں گا''

''چاچا جان میں زندہ ہی کہاں ہوں جو موت سے ڈروں۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔'' میں تو بہت پہلے مر چکی ہوں۔ شاید اُسی دن جب میری محبت، میرے اعتبار کا محل چکنا چور ہو گیا۔ جب میرے خواب، میرے ارمان جل کر راکھ ہو گئے۔ اب مجھے جینے کی کوئی حسرت نہیں اور نہ ہی مرنے کا غم۔ نصیب میں جو لکھا ہے وہ تو بھگتنا ہی پڑے گا۔''

دردانہ کے ساتھ ساتھ خدا بخش بھی رو پڑا۔ دلنواز خان کے دل میں انتقام کے شعلے دہکنے لگے۔ اُس کے اندر چھپے شیطان نے اُس سے اتنا بے رحم اور سفاک بنا دیا تھا کہ اُس کے دل میں رحم کا جذبہ مر چکا تھا۔ دردانہ اور خدا بخش کے آنسوؤں سے وہ ذرا سا بھی پگھلا نہیں۔ اُس نے جاتے جاتے اُنہیں یہ دھمکی دی کہ وہ ابھی جا کر پولیس میں خبر کر دے گا۔ وہ کمینگی کی انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ دردانہ نے اپنے آنسو پونچھ لئے اور دلنواز خان کی طرف قہر آلودہ نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔

''تمہاری دھمکی سے ڈرنے والی نہیں ہوں میں۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا آپا کھو بیٹھوں اور تمہیں جوتے مار کر یہاں سے نکال دوں، تم ابھی یہاں سے نکل جاؤ۔ دوبارہ اس گھر

میں قدم رکھنے کی بھول بھی مت کرنا۔ سمجھے۔"

دلنواز خان اپنے دانت پیستا رہ گیا۔ وہ جمعہ خان کو لے کر نکل گیا۔ بے چارہ خدا بخش آنے والی تباہی کے تصور سے لرز کے رہ گیا۔

(۶۲)

قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس دن دلنواز خان نے ٹنگمرگ پولیس تھانے میں دردانہ کے بارے میں اطلاع دی اُس کے اگلے روز شیر خان جیل سے چھوٹ کر آ گیا۔ زیتون نے جب شیر خان کو آتے دیکھا تو اُس کی پتھرائی آنکھوں میں جیسے نور پھیل گیا۔ وہ فرطِ مسرت سے بیٹے کی طرف لپکی اور اُس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"تو آ گیا میرے لال۔ تو آ گیا" وہ اُس کے گال چومتے ہوئے بولی۔

"ہاں ہاں، میں آ گیا ہوں اماں۔ دکھ کے بادل چھٹ گئے ہیں۔ اب تو خوشی منانے کے دن ہیں۔ تم اب کاہے کو رو رہی ہے؟ اب یہ آنسو پونچھ ڈال۔ مجھ سے تمہارے یہ آنسو دیکھے نہیں جاتے۔"

زیتون نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر شاہ باز خان کے پاس لے آئی۔ شاہ باز خان نے اُس سے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ شیر خان نے شاہ باز خان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

"تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو نا ابو۔ یہ دیکھو ابو میں تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مجھے قسم ہے اللہ پاک کی، میں نے دلنواز خان کے زیور نہیں چرائے تھے۔"

"نہیں چرائے تھے تو پھر زیور یہاں کیسے مل گئے؟" شاہ باز خان نے برہمی سے پوچھا۔

"یہ میں نہیں جانتا۔ یہ تو اللہ جانتا ہے یا وہ کمینہ دلنواز خان۔ خیر جس گناہ کی سزا میں بھگت کر آیا ہوں اُس پر اب بحث کرنا عبث ہے۔" وہ قدرے توقف کے بعد متلاشی نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جب اُسے دردانہ دکھائی نہیں دی تو وہ مضطرب ہو کر زیتون کی طرف دیکھ کر بولا۔

"دردانہ دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ کہاں ہے وہ؟"

زیتون کا دل دھک سے رہ گیا۔ اُس کے چہرے کی خوشی غم میں بدل گئی۔ وہ شاہ باز خان کی طرف دیکھنے لگی۔ دونوں چپ تھے۔

''تم لوگ چپ کیوں ہو۔ میں پوچھتا ہوں دردانہ کہاں ہے''

''وہ یہ گھر چھوڑ کر اُسی دن چلی گئی جس دن پولیس تمہیں پکڑ کر لے گئی۔''

شیر خان کو لگا جیسے اُس کے سینے پر ایک وزنی گھونسہ پڑا ہو۔ وہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا اور غصے سے بولا۔

''تم لوگوں نے اُس کو جانے کیوں دیا۔ اُسے روکا کیوں نہیں؟''

''کیا کہہ کے روکتے۔ یہی نا کہ ہمارا بیٹا دس نمبری بدمعاش ہے''

شیر خان کو لگا جیسے اُس کے باپ نے اُس کے دل پر تازیانہ برسایا ہو۔ اس چوٹ سے اُس کی روح بلبلا اُٹھی۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں ماں سے مخاطب ہو کے بولا۔

''تمہارے لئے تو میں مجرم نہیں تھا پھر تم نے اُس سے روکا کیوں نہیں؟''

''میرے کہنے سے وہ رکتی کیا۔ جب ندی نالے میں باڑھ آجاتی ہے تو وہ اپنے ہی کنارے کاٹ کے نکل جاتی ہے۔ دردانہ کی زندگی میں طوفان آ گیا تھا۔ وہ کسی کے کہنے سے رکتی کیا۔ دلنواز خان خبیث نے اس گھر کو تباہ کرنے میں کوئی کسر چھوڑی تھی کیا۔''

شیر خان دلنواز خان کے ظلم وستم کا اکیلا شکار نہیں تھا۔ اُس نے اُس کے پورے خاندان کو تکلیف پہنچائی تھی۔ اُس کا خون کھول اُٹھا۔ وہ غصے سے پاگل ہونے لگا۔ انتقام کے شعلے اُس کی آنکھوں میں دہکنے لگے۔ وہ غصے کی شدت سے چلایا۔

''آج میں دلنواز خان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مار ڈالوں گا اُسے۔''

کہہ کر وہ اندر رکھی کلہاڑی اُٹھا کر لے آیا اور تیزی سے گھر سے نکل گیا۔ زیتون اُس کے پیچھے دوڑ کر روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

''شیرو میرے بچے رک جا۔ ایسی نادانی مت کر۔ تمہاری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ رک جا، میرے بچے۔''

وہ رکا نہیں۔ وہ بدلے کی آگ میں اندھا ہو چکا تھا۔ زیتون بیٹھ کر رونے لگی۔ شاہ باز خان اُس سے بولا۔

''آندھی طوفان کسی کے روکنے سے رکتے ہیں کیا۔ اُس سے جانے دو۔ جو ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔ تقدیر کے لکھے کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ اگر دلنواز خان کا مرنا اسی کے ہاتھوں لکھا ہے تو وہ مرے گا ضرور۔ ویسے اُس مردود کی موت سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔''

زیتون نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر بلک بلک کر روتی رہی۔

(۶۳)

دلنواز خان نے پولیس کو دردانہ کی اصلیت سے آگاہ کر کے اپنی بے عزتی کا بدلہ تو لیا تھا مگر اُسے نہ پانے کی تڑپ اور کسک اُسے اب بھی پریشان کئے جا رہی تھی۔ ایک طرف وہ اس بات سے خوش تھا کہ اُس کا بدلہ پورا ہوا تھا تو دوسری طرف شیر خان ایک شکاری کتے کی مانند اُنہیں تلاش کر رہا تھا۔ وہ جب بستی سے باہر اُس سے ٹکرائے تو اُس کے خوفناک تیور دیکھ کر اُن کے ہوش اُڑ گئے۔ دلنواز خان کو دیکھ کر شیر خان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُس کی گرفت کلہاڑی پر مضبوط ہو گئی۔ اُس نے کلہاڑی دلنواز خان کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

''دلنواز خان میں چھ مہینے کی سزا کاٹ کے آیا ہوں۔''

''اس میں میرا کیا قصور۔'' وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

''میری دردانہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی''

''سن کے بڑا افسوس ہوا۔ شاید مولا کی یہی مرضی تھی''

''اللہ کو کیوں الزام دے رہے ہو۔ یہ کام اللہ کا نہیں بلکہ تم دونوں کا ہے۔ تم دونوں نے مجھے چوری کے جھوٹے الزام میں اندر کروا دیا۔ جن ہاتھوں سے تم دونوں نے میری بربادی کی کہانی لکھی آج میں تم دونوں کے ہاتھ کاٹنے آیا ہوں۔''

جمعہ خان کے اوسان خطا ہو گئے۔ شیر خان کے سر پر خون سوار تھا۔ جمعہ خان کو اپنی جان کے لالے پڑتے دکھائی دے رہے تھے اس لئے اس نے اپنی جان بچانے کی خاطر سچ

اُگل دیا۔

''شیر خان مجھے قسم ہے اپنے مولا کی میں نے خود سے کچھ نہیں کیا۔ جو کچھ کیا اُس کے کہنے پر کیا۔''

دلنواز خان کو جمعہ خان کی اس بے وفائی سے گہرا جھٹکا لگا۔ اُس نے غصے سے لال پیلا ہو کر جمعہ خان سے چلا کر کہا۔

''سالے کل تک شیر خان اور اس کے خاندان کی قبر کھودنے میں لگے رہے۔ آج جب موت سر پر منڈلاتی ہوئی دیکھی تو اپنے آپ کو بچانے کی خاطر خود کو بے گناہ ثابت کر کے سارا الزام میرے سر تھوپنے لگے۔ جو کچھ بھی تمہارے ساتھ ہوا اُس کا ذمہ دار میں نہیں بلکہ یہ کمینہ ہے۔''

''نہیں میری بربادی کا ذمہ دار اکیلا یہ نہیں بلکہ تم بھی ہو کمینے۔ میں تم دونوں کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کروں گا۔ نہ سزا میں نہ جزا میں۔''

یہ کہہ کر اُس نے پہلا وار دلنواز خان پر کر دیا۔ دلنواز خان ایک چیخ مار کر گھوڑے سے نیچے گرا۔ اُس کے سر سے خون کا فوارہ اُبل پڑا۔ جمعہ خان حواس باختہ ہو گیا۔ اُس نے گھوڑے کو ایڑی لگا کر بھاگنے کی کوشش کی مگر گھوڑا ایسا کمبخت نکلا کہ وہ ایک قدم آگے چلنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ جمعہ خان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ گھوڑے سے کود کر بھاگنے کی کوشش کرنے لگا مگر زمین نے جیسے اُس کے پاؤں پکڑ لئے۔ اُسے ایک ایک قدم من من بھر کا لگنے لگا۔ شیر خان کلہاڑی لے کر اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ شیر خان کے قدموں میں گر کر گڑگڑانے لگا۔

''میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، مجھے معاف کر دو''

''میرا سب کچھ لٹ گیا۔ میں تمہیں کیسے معاف کر سکتا ہوں۔ میرے سینے میں بدلے کی آگ دہک رہی ہے۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا۔''

کہہ کر اُس نے اُس پر کلہاڑی کا وار کر کے اُس کا کام تمام کر دیا۔ اُنہیں خون میں لت

پت پڑے دیکھ کر اُس کے کلیجے کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی۔ وہ کلہاڑی وہیں پر پھینک کر دلنواز خان کے گھوڑے پر بیٹھ کر پرنگ کے لئے نکل پڑا۔

(۶۴)

صبح کا وقت تھا۔ دردانہ حسبِ معمول مرغیوں کو دانہ کھلا رہی تھی اور خدا بخش برآمدے میں بیٹھے حقہ گڑگڑاتے ہوئے اُسی کے بارے میں سوچ رہا تھا، تبھی گھر کے پھاٹک کے باہر ایک گھوڑا رکا اور گھڑسوار نیچے اُتر کر اندر آ گیا۔ جونہی خدا بخش کی نظر شیر خان پر پڑی تو وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ دردانہ اُس کو دیکھ کر دانہ وہیں چھوڑ کر اندر اس طرح بھاگ گئی جیسے وہ انسان نہ ہو کوئی بلا ہو۔ وہ دردانہ کو آواز دے کر جونہی اُس کے پیچھے دوڑنے لگا خدا بخش نے ایک لٹھ اُٹھا لیا اور اُس کے سامنے جا کر کھڑا ہو کر غصے اور نفرت سے اُبل پڑا۔

''کمبخت تم نے اپنی ناپاک زبان سے میری بچی کا نام کیسے لیا؟''

''دردانہ'' وہ ایک بار پھر اُسے آواز دینے لگا۔ اُس کی اس دیدہ دلیری سے خدا بخش آگ بگولا ہو گیا۔ اُس نے بے قابو ہو کر شیر خان پر حملہ کیا۔

''کمینے، کتے۔ اگر تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں تمہیں زندہ دفن کر دوں گا''

چاچا جان۔ میں بھی آج سر پر کفن باندھ کے آیا ہوں۔ تم جتنا چاہو مجھ پر لاٹھیاں برساؤ مگر تم مجھے دردانہ سے ملنے سے روک نہیں سکو گے۔ میں دردانہ سے مل کر ہی جاؤں گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے''

اتنے میں دردانہ باہر آ گئی۔ اُس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ وہ اُس کی طرف قہر بھری نظروں سے دیکھ کر بولی۔

''تم کس دردانہ سے ملنے آئے ہو۔ جس دردانہ سے تم ملنے آئے ہو وہ تو اُسی دن مر گئی جس دن وہ تمہاری اصلیت جان گئی۔''

''لیکن جس دردانہ کو میں جانتا ہوں وہ آج بھی زندہ ہے اور اس وقت میرے سامنے کھڑی ہے۔ دردانہ تم مجھ سے لاکھ نفرت کرو مگر میں آج بھی تم سے پیار کرتا ہوں۔''

''تف ہے تمہارے پیار پر۔ جسے تم پیار کہتے ہو وہ پیار نہیں ایک دھوکہ ہے، ایک ڈھکوسلہ ہے۔ تم انسان نہیں ہو، بھیڑ کی کھال میں بھیڑئے ہو۔ تمہارا ظاہر ایک ہے اور باطن ایک۔ میں نے تم سے اس لئے محبت نہیں کی تھی کی تم محبت کے بدلے مجھے ذلت و رسوائی دو گے۔'' کہتے کہتے اُس کا گلا بھر آیا۔'' آخر میں نے کیا نہیں دیا تمہیں۔ اپنا تن من، اپنی ساری خوشیاں تم پر نچھاور کر دیں۔ اس کے عوض تم نے مجھے کیا دیا، دھوکہ فریب، آہیں اور آنسو۔ میں نے تو تجھے فرشتے کا درجہ دیا تھا۔ تم نے، میری اس دیوانگی کو کیا دیا۔ فریب کا گھاو، جھوٹ کا زخم اور نہ ختم ہونے والا رنج وغم؟''

''میں مانتا ہوں میں تمہارا گناہ گار ہوں اور آج تم سے اپنی ہر خطا، ہر گناہ کی معافی مانگنے آیا ہوں۔'' وہ آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کرنے لگا۔

''مت چھوؤ مجھے۔ مت چھوؤ۔'' وہ ایک چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی۔ شیر خان اُس کی اس ادا سے سن ہو کے رہ گیا۔ وہ دکھ اور غصے سے بولی۔'' اپنے ان گندے ہاتھوں سے مت چھوؤ مجھے۔ تمہارے یہ ہاتھ، ہاتھ نہیں کالے ناگ ہیں جو مجھے ڈس لیں گے۔ مجھے ان ہاتھوں سے بے ایمانی اور بدکاری کی بو آتی ہے۔ پتہ نہیں ان ہاتھوں میں کس کس کا خون لگا ہوگا۔ مجھے نفرت ہے تم سے تمہارے ان ہاتھوں سے۔ نفرت ہے مجھے''

کہہ کر وہ روتے ہوئے اندر چلی گئی۔ شیر خان سن ہو کے کھڑا تھا۔ اُس کا دل پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ دردانہ جو اُس کی زندگی میں خوشی بن کر آئی تھی آج اُس سے کتنی دور ہو گئی تھی۔ کتنی نفرت کرتی تھی وہ اُس سے۔ اُس کے دل پر چھریاں چل رہی تھیں۔ دردانہ کا کہا ہوا ایک ایک لفظ برمے کی طرح اُس کے دل وجگر کو چیرتا چلا جا رہا تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے وہاں سے نکل گیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ اُس نے ان آنسوؤں کو روکا نہیں بلکہ انہیں بہنے دیا۔ آنسو بہتے چلے گئے۔

(۶۵)

شیر خان اپنے ہی کاندھے پر اپنی لاش لئے جب وہاں سے چلا گیا تو تبھی پولیس نے خدا بخش کے گھر پر دھاوا بول دیا۔ خدا بخش نے جونہی پولیس کو دیکھا تو اُس کے اوسان خطا

ہو گئے۔ وہ سمجھ گیا کہ جس آفت کا اُس کو انتظار تھا وہ بالآخر اُس کے دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ پولیس انسپکٹر نے دردانہ کو باہر بلایا۔ پہلے اُس سے کچھ سوال جواب کئے۔ جب وہ اس بات کو ثابت کرنے میں ناکام رہی کہ وہ خدا بخش کی بیٹی ہے تو پولیس اُس کو گرفتار کر کے لے گئی۔ خدا بخش پولیس کے سامنے رویا۔ گڑگڑایا۔ اُن کے پاؤں پکڑے لیکن اُس کے باوجود پولیس دردانہ کو اپنے ساتھ لے گئی۔ اُس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ جانتی تھی کی ایک نہ ایک دن اُسے گرفتار کیا جائے گا اس لئے وہ چپ چاپ پولیس کے ساتھ چلی گئی۔ خدا بخش سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اُس کی بچی اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس سے دور جا رہی تھی اور وہ کھڑا بڑی بے بسی اور لاچاری سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اُس کو اپنی بے بسی پر رونا آیا۔

(٦٦)

شیر خان پاگلوں کی طرح یہاں سے وہاں بھٹک رہا تھا۔ دردانہ کے کہے ہوئے الفاظ شکاری کتوں کی مانند اُسے کا پیچھا کر رہے تھے۔ وہ ایک ٹھور سے دوسرے ٹھور اور ایک بستی سے دوسری بستی کی طرف بھاگ رہا تھا۔ دراصل وہ اپنے آپ سے بھاگ رہا تھا۔ دردانہ کی کہی ہوئی باتیں گرم سیسے کی طرح اُس کے دل و دماغ پر گرتی چلی جا رہی تھیں۔ اُس کا جی کر رہا تھا کہ وہ کسی پتھر سے اپنا سر پھوڑ دے۔ کسی بہتے نالے میں اپنے آپ کو غرق کر دے یا کسی پہاڑی سے کود کر مر جائے۔ وہ دردانہ کے دیئے ہوئے طعنوں کو یاد کر کے پورے وجود سے تڑپ اُٹھتا تھا۔

''تمہارے ہاتھ، ہاتھ نہیں کالے ناگ ہیں''

اُس نے تڑپ کر اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اُس کو اپنے ہاتھوں سے گھن آنے لگی۔

''تمہارے ہاتھوں سے بے ایمانی اور بدکاری کی بو آتی ہے''

اُس نے کراہت سے اپنے ہاتھوں پر تھوکا۔ اُس کو لگا جیسے اُس کے ہاتھ واقعی گندے ہیں۔ اُسے اپنے ہاتھ ایک بوجھ کی طرح لگے۔ ایسا لگا جیسے اُس کے ہاتھوں کو کوڑھ ہو گیا ہو۔ وہ اس کوڑھ سے نجات پانا چاہتا تھا۔ وہ ان ہاتھوں کو اپنے وجود سے الگ کرنا چاہتا تھا۔

وہ اس صدمے سے پاگل ہو چکا تھا۔ جب آدمی پاگل ہو جاتا ہے تو اُس کو اچھے برے

کی تمیز نہیں رہتی۔ شیر خان نے بھی ایسا ہی کیا۔ ایک گاؤں میں لکڑی چیرنے والی مشین چل رہی تھی۔ وہ مستری سے نظر بچا کر مشین کے پاس گیا اور شہتیر کی طرح اپنے دونوں ہاتھ مشین کے آگے رکھ دیئے۔ ایک پل میں اُس کے دونوں ہاتھ اُس کے جسم سے الگ ہو گئے اور وہ چکرا کے زمین پر گر پڑا۔ جب مستری نے یہ منظر دیکھا تو اُس کا خون منجمد ہو کر رہ گیا۔ وہ مشین چھوڑ کے بھاگ گیا۔ شیر خان خون میں لت پت برادے کے ڈھیر پر پڑا تھا۔

(٦٧)

صبح بڑی اُداس اور غمگین تھی۔ آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے آسمان بھی سوگ میں ڈوبا ہو۔ خدا بخش دروازے پر بیٹھا غم کی مورت بنا بیٹھا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے اشکوں کے موتی خود بخود گر رہے تھے۔ رہ رہ کے اُسے دردانہ کے انجام پر رونا آرہا تھا۔ وہ لڑکی کیا کیا ارمان لے کر آئی تھی۔ اُس کے سارے ارمان، ساری آرزوئیں خاک میں مل کر رہ گئی تھیں۔

وہ اسی سوگ میں ڈوبا تھا کہ اچانک شیر خان ایک پھٹی ہوئی لوئی اوڑھے ایک زندہ لاش کی طرح اُس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ خدا بخش کا غصہ عود کر آ گیا۔ وہ نفرت اور حقارت سے اُس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"کمینے کتے، پاجی، کیوں میرے زخموں پر نمک چھڑکنے آیا ہے۔ میری بچی کی زندگی غارت کر کے ابھی تمہارا دل نہیں بھرا جو ایک نیا گھاؤ، ایک نیا چرکہ دینے چلا آیا تو۔

چلا جا یہاں سے چلا جا۔ تجھے دیکھ کے میری آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے۔ کمبخت رات بھر نہ جانے کس کے یہاں ڈاکہ ڈالتے رہے۔ کس کا گھر لوٹتے رہے اور اب آیا ہے میرے پاس اپنی منحوس صورت دکھانے۔ جا چلا جا یہاں سے۔ چلا جا۔"

شیر خان کچھ نہیں بولا۔ اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے رہے۔ بڑی دیر کے بعد وہ خدا بخش سے بولا۔

"یہ سچ ہے چاچا کہ میں ایک چور تھا۔ میں نے بہت ساری چوریاں کیں۔ کل بھی میں

نے چوری کی۔ کل بھی میں نے ڈاکہ ڈالا۔ مگر قسم خدا کی کل میں نے کسی اور کا گھر نہیں لوٹا۔ کل میں نے اپنی ہی زندگی میں ڈاکہ ڈالا۔ تمہیں یقین نہیں ہے نا تو یہ دیکھو۔"

کہہ کر اُس نے اپنے دانتوں سے اپنی لوئی ہٹائی۔ شیر خان نے جب اُسے دونوں کٹے ہوئے ہاتھ دیکھے تو وہ سن ہو کر رہ گیا۔

"شیرو" وہ درد کی شدت سے چلایا۔ "یہ تو نے کیا کیا؟"

"دردانہ نے کہا تھا نا کہ میرے ہاتھ گندے ہیں۔ خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ اس لئے میں نے اپنے دونوں ہاتھ کاٹ کر پھینک دیئے۔" "لیکن جس کے لئے تم نے اپنے ہاتھ کاٹ دیئے، اُس سے تو کل شام پولیس پکڑ کر لے گئی"

"نہیں دردانہ کو مجھ سے کوئی الگ نہیں کر سکتا۔ دردانہ، دردانہ۔" وہ چلاتے ہوئے پولیس اسٹیشن کی طرف بھاگنے لگا۔

(۶۸)

شیر خان گرتے پڑتے پولیس تھانے تک پہنچ گیا۔ پولیس والے نے جب اُس سے خون میں لت پت پایا تو اُس کی حالت دیکھ کر وہ سہم گیا۔ اُس نے سپاہی سے پوچھا۔

"جناب جس لڑکی کو آپ پکڑ کر لائے تھے وہ کہاں ہے؟"

"وہ جو سرحد پار کر کے آئی تھی؟"

"ہاں جناب وہی، وہی"

"اُس کو تھانیدار صاحب سرحد کی طرف لے گئے ہیں"

یہ دلدوز خبر سن کر شیر خان تیورا کے گرا۔ سپاہی نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا۔ اُس کو پل بھر کے لئے کچھ سجھائی نہیں دیا۔ جب اُس کے ہوش وحواس بحال ہوئے تو وہ لشتم پشتم سرحد کی جانب دوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کے زخموں سے اب تک خون رس رہا تھا۔ چہرہ بسنت کے پھول کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کے شریر میں خون کی ایک بوند بھی نہیں بچی ہو۔ پھر بھی وہ چل رہا تھا۔ یہ اُس کی دیوانگی تھی۔ اُس کا جنون تھا۔ اُس کے محبت کا خمار تھا جو

اُس کو اتنی ہمت اور حوصلہ بخش رہا تھا کہ وہ ایک زندہ لاش ہوتے ہوئے اپنی دردانہ کے لئے بھاگ رہا تھا۔ وہ چونکہ سبھی راستوں سے واقف تھا اسلئے وہ ایک تنگنائے سے سرحد کی طرف اپنی پوری قوت کے ساتھ دوڑنے لگا۔ وہ کہیں گرتا، کہیں چکراتا، پھر اپنی بچی کھچی طاقت لگا کر اُٹھتا۔ آج وہ ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اُس کے جنون کے آگے آج موت بھی ہار چکی تھی۔ وہ ادھ مرا ہو کے اپنی دردانہ تک کسی بھی حالت میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے ہی کاندھے پر اپنی لاش اُٹھائے چلتا رہا۔

(۶۹)

پاکستانی رینجیرس کو جب اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ دردانہ مظفر آباد نژاد ہے تو اُنہوں نے اُس کو اپنی سرحد میں گھسنے کی اجازت تو دی تاہم ابھی تک اُن کی کارروائی پوری نہیں ہوئی تھی اس لئے وہ اُن کے پکٹ کے پاس کھڑی تھی۔ اگر چہ وہ اپنے گھر اپنی ماں کے پاس لوٹ رہی تھی مگر اُس کے چہرے سے مترشح تھا کہ وہ خوش نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کو کسی قتل گاہ میں ذبح کرنے کے لئے لیا جا رہا ہو۔ وہ دردوالم کی مورت بنی اپنی بربادی کا سوگ منا رہی تھی۔ اسی بیچ شیر خان ہندوستانی پکٹ تک پہنچا۔ اُس کی ہیت کذائی دیکھ کر بی۔ ایس۔ ایف کا جوان اُچھل پڑا۔ اُس نے اُس سے روک کے پوچھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''میں اُس پار جانا چاہتا ہوں۔ وہ لڑکی جو اُس پار کھڑی ہے وہ میری زندگی ہے، میری جان ہے، میرا پیار ہے۔ اگر وہ چلی گئی نا تو میں جی نہیں پاؤں گا۔ جیتے جی مر جاؤں گا۔ اُس کو روکو صاحب، اُس کو روکو۔''

''میں اُس کو روک نہیں سکتا۔ وہ اس علاقے کی نہیں ہے۔ وہ سرحد پار کی رہنے والی ہے۔''

''یہ سرحدیں ملکوں کو بانٹ سکتی ہیں۔ یہ سرحدیں ہمارے پیار کو نہیں بانٹ سکتی ہیں۔ مجھے جانے دو صاحب۔ مجھے جانے دو۔ اگر میں نے آج اپنا پیار کھو دیا تو پھر میں اس کو کبھی نہیں پاؤں گا۔ جانے دو مجھے صاحب۔ جانے دو مجھے۔''

بی۔ایس۔ایف کا نوجوان شیر خان کی باتوں کے سامنے لاجواب سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک طرف اُس کا فرض تھا تو دوسری طرف یہ دیوانہ تھا جو اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کے لئے تیار تھا۔وہ کیا کرے کیا نہ کرے اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔اُس نے ایک لمبے توقف کے بعد شیر خان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھ وہ دشمن کا علاقہ ہے۔اگر تم اُس طرف چلے گئے تو تمہاری جان جا سکتی ہے۔کیوں اپنی جان جھوکم میں ڈالنا چاہتے ہو۔''

''صاحب میں سر پر کفن باندھ کے آیا ہوں۔میں اپنے محبوب کی بانہوں میں دم توڑ دوں،اس سے بڑی خوش نصیبی میرے لئے اور کیا ہو سکتی ہے۔مجھے جانے دیجیئے۔

وہ کچھ نہیں بولا۔شیر خان نے اُس کی خاموشی کو اجازت سمجھ لیا۔وہ موت کی پرواہ کئے بنا اُس سمت دوڑنے لگا جہاں دردانہ کھڑی تھی۔بی۔ایس۔ایف جوان نے اُس کو روکنے کی کوشش کی مگر وہ اُس کی وارننگ کو ان سنا کرتے ہوئے اُس سمت دوڑنے لگا جہاں اُس کی دردانہ کھڑی تھی۔وہ اُس کو آوازیں دینے لگا۔

''رک جاو دردانہ،رک جاؤ۔مجھے چھوڑ کے مت جاؤ۔تم چلی جاوگی تو میں بے موت مر جاؤں گا۔دردانہ رک جاؤ۔رک جاؤ۔''

دردانہ نے جوں ہی اُس کو اپنی جانب بھاگتے ہوئے دیکھا تو پتہ نہیں اُس کے دل میں سوئی ہوئی محبت کیسے جاگ اُٹھی۔اُس کا خفتہ پیار یکلخت کیسے ہلکورے مارنے لگا۔وہ شیر خان کی طرف دیکھنے لگی۔شیر خان چلا رہا تھا۔

''دیکھ دردانہ دیکھ۔جن ہاتھوں سے تجھے گھن آتی تھی میں نے وہ ہاتھ ہی کاٹ کے پھینک دیئے۔دیکھ دردانہ دیکھ۔میں نے وہ ہاتھ اپنے وجود سے الگ کر دیئے جن سے تمہیں خون کی بو آتی تھی۔''

جب وہ پاکستانی کنٹرول والے علاقے میں گھسنے لگا تو اُس پار کھڑے سنتری نے اُسے تنبیہ کیا۔

''آگے مت بڑھنا نہیں تو میں گولی چلا دوں گا۔''

اُس سے پہلے کہ گولی چل جائے اور شیر خان بے موت مارا جائے دردانہ تڑپ اُٹھی۔ وہ پوری قوت سے چلائی۔

''رک جاؤ شیرو۔ رک جاؤ۔''

اُس کے بعد وہ بے تحاشہ اُس کی جانب دوڑنے لگی۔ دونوں سرحد کے بیچوں بیچ اس جگہ ملے جسے No mans land کہا جاتا ہے۔ دردانہ کو دیکھ کے شیر خان رو پڑا۔ دردانہ نے جب اُس کے کٹے ہوئے بازو دیکھے تو اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ ایک چیخ مار کر اُس سے لپٹ گئی۔ اُس نے روتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

''یہ تو نے کیا کیا پگلے؟''

''تمہیں ان ہاتھوں سے گھن آتی تھی نا۔ میں نے یہ ہاتھ ہی کاٹ کے پھینک دیئے''

کہہ کر وہ دردانہ کی بانہوں میں چکرا کے گرا اور اُس کے بعد اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ دردانہ اپنے محبوب کی لاش اپنی بانہوں میں سمیٹے آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس کو لگا جیسے کوئی اوپر سے کہہ رہا ہو۔

''آپ بے شک ملکوں کو بانٹیں۔ زمین کو سرحدوں کے پیمانے سے بانٹیں مگر آپ دلوں کو نہیں بانٹ سکتے کیونکہ دلوں کی کوئی سیما، کوئی سرحد نہیں ہوتی''

اُس کے بعد ایک مکمل خاموشی۔ ایک سکوت ہر طرف چھا گیا۔ ایسا لگا جیسے اس پریم کہانی کے انجام سے آسمان بھی اُداس ہو گیا ہو۔

............●●●............

"شیرازہ" اُردو

کی بعض اہم خصوصی اشاعتیں

☆ سمپوزیم نمبر
☆ پنڈت جواہر لال نہرو نمبر
☆ مورّخ حسن نمبر
☆ منشی پریم چند نمبر
☆ غالب نمبر
☆ شیخ العالم نمبر
☆ شاہِ ہمدان نمبر
☆ شیرِ کشمیر نمبر
☆ غلام محمد صادق نمبر
☆ نوجوان نمبر
☆ فخرِ کشمیر نمبر
☆ عبدالاحد آزاد نمبر
☆ غلام رسول کامگار نمبر

☆ ثقافت نمبر
☆ محی الدین قادری زور نمبر
☆ محمد الدین فوق نمبر
☆ ڈاکٹر محمد اقبال نمبر
☆ عجائباتِ کشمیر نمبر
☆ لل دید نمبر
☆ صوفیانہ موسیقی اور کشمیر نمبر
☆ سمینار نمبر
☆ افسانہ نمبر
☆ شاعرِ کشمیر مہجور نمبر
☆ مغل اور کشمیر نمبر
☆ جموں و کشمیر میں اردو ادب نمبر
☆ محمد یاسین بیگ نمبر

☆ حکیم منظور نمبر
☆ غلام رسول نازکی نمبر
☆ بخشی غلام محمد نمبر
☆ عمر مجید نمبر
☆ پی۔این۔کے بامزئی نمبر
☆ ہمعصر شعری انتخاب نمبر
☆ محمد یوسف ٹینگ نمبر
☆ فرید پربتی نمبر
☆ ہم عصر افسانہ نمبر
☆ شوریدہ کاشمیری نمبر
☆ مقبول فدا حسنین نمبر
☆ جموں وکشمیر معاصر اردو نظم نمبر
☆ جموں وکشمیر اردو افسانہ نمبر

☆ حامدی کاشمیری نمبر
☆ میکش کاشمیری نمبر
☆ شمیم احمد شمیم نمبر
☆ جموں وکشمیر، لداخ نمبر (۱۱ جلدیں)
☆ غلام رسول سنتوش نمبر
☆ عمر مجید نمبر
☆ پشکر ناتھ نمبر
☆ گولڈن جبلی نمبر
☆ میراجی نمبر
☆ جموں وکشمیر میں اردو نثر نمبر
☆ بیگم اختر نمبر
☆ خواجہ ثناء اللہ بٹ نمبر

شیرازہ کی خصوصی اشاعتیں کتاب گھر، سرینگر/ جموں/ لیہہ سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔

......●●●......

سال نامہ "ہمارا ادب"
کی بعض خصوصی اشاعتیں

☆ لوک ادب نمبر
☆ مشاہیرِ کشمیر نمبر (۲ جلدیں)
☆ شیرازہ، انتخاب نمبر
☆ جموں کشمیر نمبر (۵ جلدیں)
☆ شخصیات نمبر (۵ جلدیں)
☆ اولیاء نمبر (۵ جلدیں)
☆ ڈوڈہ نمبر
☆ مولانا رومی نمبر
☆ ہمعصر تھیٹر نمبر
☆ فیض احمد فیض نمبر
☆ سعادت حسن منٹو نمبر
☆ تنقید نمبر
☆ کرشن چندر نمبر
☆ جموں وکشمیر معاصر نسائی ادب نمبر

ہمارا ادب کی خصوصی اشاعتیں کتاب گھر، سرینگر/جموں/لیہہ سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔

......●●●......

جموں اینڈ کشمیر

اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگو یجز

کی طرف سے ریاست میں علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں

کا احاطہ کرنے والا دو ماہی خبر نامہ

" ثقافت "

دبیز کاغذ، خوبصورت ڈیزائننگ اور آفسیٹ پرنٹنگ سے آراستہ

۱۲، صفحات پر مشتمل

نگران:۔ ڈاکٹر عزیز حاجنی ، مدیر اعلیٰ:۔ محمد اشرف ٹاک

ملنے کا پتہ:

کتاب گھر، سرینگر/ جموں/ لیہہ، لداخ

email:- saqafatjkaacl@gmail.com

Cell :- 9419465183 , 9469264562

......●●●......